امت مسلمہ کی نظر میں

صدام حسین

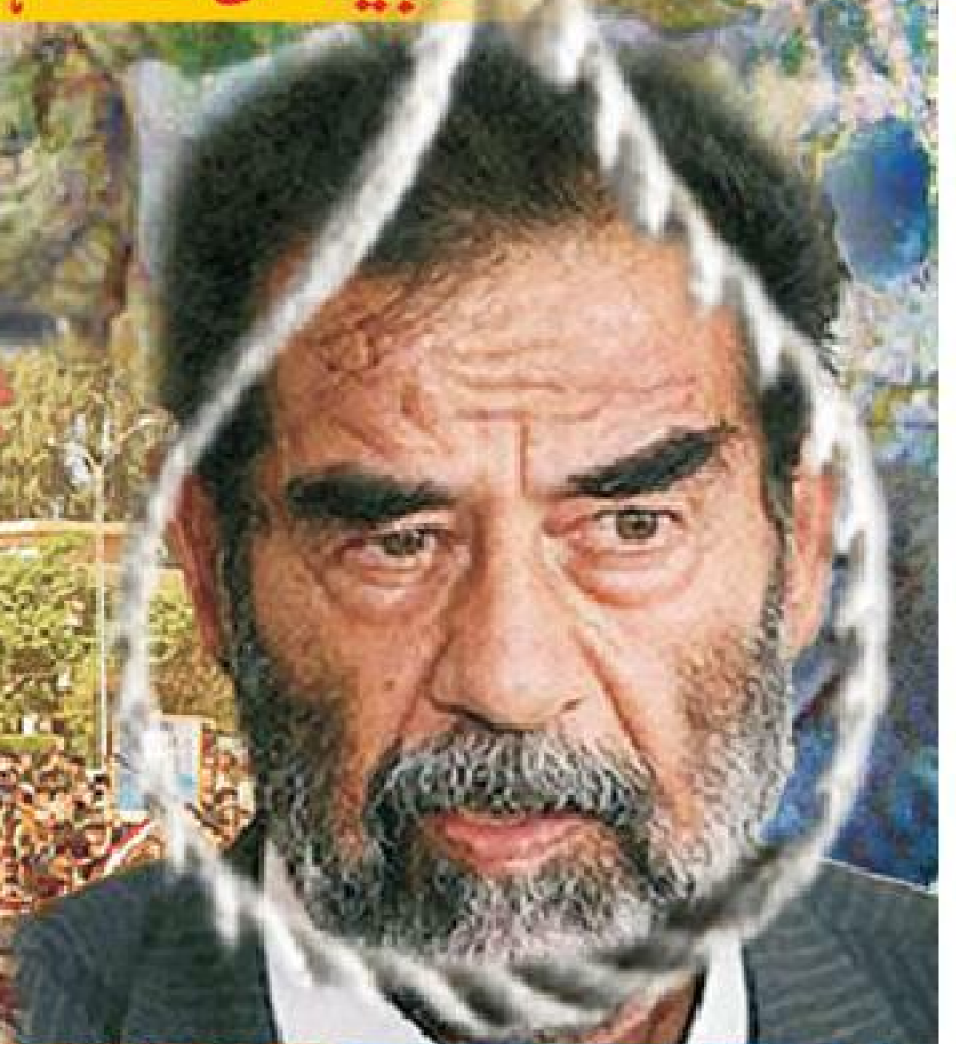
ہیرو یا زیرو؟

(پیدائش سے شہادت تک)



تحریر، تحقیق و تالیف

محمد اسلم لودھی



فہرست

تمہید

عراق کے معزول صدر صدام حسین کو عید کی صبح 30 دسمبر 2006ء پھانسی پر لٹکا دیا گیا۔ایک روز پہلے یہ خبر نشر کی گئی تھی کہ امریکی افواج نے صدام حسین کو عراقی حکام کے حوالے کر دیا ہے اور اب ان کی سزا پر عملدر آمد میں ایک دن کی تاخیر بھی نہیں کی جائے گی۔سو اس ارادے پر من وعن عمل ہوا اور عید کا دن گزرنے کا انتظار بھی نہ کیا گیا۔یہ بھی خیال نہ کیا گیا کہ عرب اسلامی روایات کے تحت حج کے ایام میں خون بہانے سے پرہیز کیا جاتا ہے...... یا شاید بالارادہ ایسا کیا گیا تا کہ محکوم قوم کو یہ پیغام دیا جاسکے کہ مغربی دنیا عرب اسلامی کلچر کے احترام کی کوئی ضرورت محسوس نہیں کرتی۔ یہ طرز عمل استعمار اور حملہ آور فوجوں کے مخصوص جارحانہ کردار کا آئینہ دار ہے۔

صدام حسین پر لگائے گئے الزامات صحیح تھے یا غلط اس بحث سے قطع نظر یہ حقیقت اپنی جگہ انتہائی اہم ہے کہ انہیں ایک ایسے وقت سزا دی گئی ہے جب عراق پر غیر ملکی فوجوں کا تسلط ہے اور ان کی مرضی کے بغیر وہاں پتہ بھی نہیں ہل سکتا۔ بظاہر عراق کی منتخب حکومت نے اپنی ایک قانونی عدالت کے حکم پر سزا دی ہے لیکن کون نہیں جانتا کہ یہ غیر ملکی افواج کی نصب کردہ کٹھ پتلی حکومت ہے اور اس کی نام نہاد عدالت کے جج غیر ملکی آقاؤں کے اشارے کے بغیر سیاسی اہمیت کا حامل کوئی بڑا فیصلہ سنانے کا خیال بھی دل میں نہیں لا سکتے۔تاریخ میں اس واقعہ کو ان بے شمار واقعات کی فہرست میں شامل کیا جائے گا جن میں فاتح قوم نے مفتوح قوم کو خوفزدہ کرنے کیلئے اس کے حکمران کو عبرتناک سزا دی۔صدام حسین آمر تھا' ظالم تھا یا جنگجو جو کچھ بھی تھا' اسے اپنے اعمال کی سزا نہیں دی گئی بلکہ مسلم دنیا کے کٹھ پتلی حکمرانوں کو یہ پیغام دیا گیا ہے کہ سرکشی کی صورت میں ان کا بھی یہی حشر ہو گا۔کیا صدام اس وقت ظالم نہیں تھا جب امریکی اسلحہ ساز فیکٹریاں اس کے لئے دھڑا دھڑ اسلحہ بنا رہی تھیں اور وہ اسے ایرانی عوام پر بلاخوف وخطر استعمال کر رہا تھا۔اس سزا کے ذریعے عربوں کو یہ باور کرانے کی کوشش بھی کی گئی ہے کہ انہیں شکست دی جاچکی ہے' وہ نئی حقیقتوں کو تسلیم کرلیں۔

مقدمے کا ایک دلچسپ پہلو یہ ہے کہ صدام حسین نے ایک امریکی عدالت میں یہ اپیل دائر کر رکھی تھی کہ انہیں عراقی حکام کے حوالے نہ کیا جائے' وہ جنگی قیدی ہیں' لہٰذا انہیں جنیوا کنونشن کے تحت تحفظ دیا جائے۔امریکی عدالت نے یہ اپیل مسترد کر دی اور سزائے موت پر عملدر آمد کروانے

سے انکار کر دیا۔ یہ درخواست م۵طور بھی کیسے کی جا سکتی تھی! اسی سے جان چھڑانے کے لئے تو صدام حسین کو ان مبینہ جرائم کی سزا دی گئی جن کا ارتکاب عراق کے اندر کیا گیا تھا۔ اگر ان پر جنگی جرائم کا الزام عائد ہوتا تو پھر کئی بنیادی سوالات سر اٹھاتے۔ غالباً سب سے پہلا سوال یہ ہوتا کہ کیا عراق نے ایران کے خلاف جنگ چھیڑ کر جنگی جرم کا ارتکاب نہیں کیا تھا؟ پھر پوچھا جاتا کہ اس جنگ کے محرکات کیا تھے اور وہ کون طاقتیں تھیں جنہوں نے صدام حسین کو حملے پر اکسایا؟ یہ سوال بھی زیر بحث آتا کہ صدام حسین نے زہریلے ہتھیار کس ملک سے حاصل کئے تھے اور کس کی بلہ شیری پر اسے انہیں استعمال کرنے کا حوصلہ ہوا اور سب سے بڑا سوال عراق پر امریکی حملے کے بارے میں اٹھایا جاتا۔ پھر یہ مطالبہ بھی کیا جاتا کہ صدر بش اور ان امریکی حکام پر بین الاقوامی عدالت میں ان کے جنگی جرائم کی بنیاد پر مقدمہ چلایا جائے۔ بش حکومت سے پوچھا جائے کہ عراق پر ایٹمی اور کیمیائی ہتھیاروں کی تیاری کا جھوٹا الزام کن افراد اور ایجنسیوں نے تراشا تھا؟ اور عراق پر قبضے کے کچھ ہی عرصے کے بعد جب وہاں سے کوئی ایسا ہتھیار نہ ملا تو جنگ جاری رکھنے اور چھ لاکھ بے گناہ عراقیوں کے قتل کا کیا جواز تھا؟ یہ اتنا بڑا جھوٹ تھا کہ جسے بعض حساس افراد برداشت نہ کر سکے۔ برطانوی انٹیلی جنس کے ایک بڑے اہل کار نے خودکشی کر لی اور سابق امریکی وزیر خارجہ کولن پاول کو کھل کر یہ اعتراف کرنا پڑا کہ اس نے اس بارے میں سلامتی کونسل کے سامنے جو جھوٹ بولا تھا' اس کا داغ اس کی پیشانی سے کبھی دھل نہیں سکے گا۔ وزیر دفاع رمسفلیڈ کو بھی رخصت ہونا پڑا جو آخر تک جنگ کے بارے میں بڑے پرجوش تھے۔ اگر دنیا میں واقعی عدل کی حکمرانی ہوتی تو آج صدر بش' ٹونی بلیئر اور ان کے ساتھ صدام حسین کے ساتھ کٹہرے میں کھڑے ہوتے اور ان سب سے ان کے جنگی جرائم کا حساب لیا جا رہا ہوتا۔ لیکن ستم ظریفی ملاحظہ ہو' استعمار نے عالمی رائے عامہ کو اصل موضوع کی طرف آنے ہی نہیں دیا اور اسے ان مبینہ جرائم کے منظر میں الجھا دیا ہے جن کا ارتکاب صدام حسین نے اپنے سیاسی مخالفین کے خلاف کیا تھا۔

اب اس بات کا فیصلہ آنے والا وقت ہی کرے گا کہ صدام سرزمین عراق اور مسلم دنیا کا ہیرو تھا یا اس کی حیثیت زیرو تھی۔ اس کتاب میں زیادہ تر مضامین صدام حسین کی شخصیت کے گرد ہی گھومتے دکھائی دیتے ہیں۔ کیونکہ اس وقت مسلم امہ صرف اور صرف صدام کے بارے میں جاننے کی جستجو رکھتی ہے۔ اس اہم ضرورت کو پورا کرنے کے لئے پاکستان کے ممتاز اور قابل ذکر کالم نگاروں اور تجزیہ نگاروں کی تحریروں کا سہارا لیا گیا ہے۔ جنہوں نے حالات و واقعات کے تناظر میں صدام حسین اور سرزمین عراق پر امریکی یلغار اور صیہونی اور عیسائی سازشوں سے نہایت بے باکی سے پردہ اٹھایا ہے میں ان تمام کالم نگاروں اور تجزیہ نگاروں (جن کا ذکر ان کی تحریروں کے آخر میں درج ہے) کا شکریہ ادا کرتے ہوئے ان کی تحقیق آمیز اور رجحان ساز تحریروں اور کالموں کو اس کتاب میں شامل کر رہا ہوں یہ جسارت میں اس لیے کر رہا ہوں کہ صدام کی پھانسی سے پوری مہذب دنیا میں تشویش اور تڑپ کی ایک لہر سی دوڑ گئی ہے۔ اس لہر کے تار پود کو ماضی کی دھول میں گم ہو جانے سے پہلے پہلے میں انہیں آنے والی نسلوں تک پہنچانے کی جستجو کر رہا ہوں اب میں اس مقصد میں کامیاب ہوا ہوں یا نہیں اس کا فیصلہ اس کتاب کا قاری اور مستقبل کا مورخ ہی کرے گا۔

دعا ہے کہ خدا میری تحقیقی اور تخلیقی کاوشوں کو قبول کرتے ہوئے مسلم امہ کی نجات کا ذریعہ بنائے۔ (آمین)

محمد اسلم لودھی

صدام خود اپنے آئینے میں

دریائے دجلہ عراق کا ایک رومانوی دریا ہے۔ اس کے پانیوں میں بہت سی الف لیلوی داستانوں نے پرورش پائی۔ خاندان بنو عباس کے دور میں بغداد عروس البلاد تھا۔ بغداد کے شمال میں واقع تکریت نام کا ایک چھوٹا سا قصبہ ہے جو اب اتنا چھوٹا بھی نہیں رہا۔ صدام کے مولد ہونے کی وجہ سے شہر اب کافی پھیل چکا ہے اور مشہور بھی ہو چکا ہے۔ لیکن آج سے 70,60 برس پہلے یہ ایک قصبہ ہی تھا۔ اس کے نزدیک ایک چھوٹا سا گاؤں ہے جس کا نام ال اوجا (Al-Auja) ہے۔ اس گاؤں میں آج سے 66 برس پہلے 28 اپریل 1937ء کو صدام حسین نے جنم لیا۔

صدام کے والد ایک سنی العقیدہ مسلمان تھے اور انتہائی غریب تھے۔ کھیتی باڑی کر کے اپنا اور اپنے خاندان کا پیٹ پالتے تھے۔ والد بچپن ہی میں فوت ہو گئے تو والدہ نے ایک اور شخص سے شادی کر لی۔ صدام کے یہ سوتیلے والد بھیڑ بکریاں چراتے تھے۔ بچپن میں ان کے ہاتھوں صدام کی بارہا پٹائی ہوئی۔ غربت کا عالم یہ تھا کہ صدام نے دس برس کی عمر تک سکول کا منہ نہ دیکھا۔ وہ جب دس برس کے ہوئے تو والدہ نے بڑی کوششوں سے سکول بھیجنا شروع کیا۔ لیکن والد ہمیشہ اس کی مخالفت کرتے رہے۔ آخر کار بھاگ کر صدام بغداد چلے گئے جہاں ان کے چچا رہتے تھے۔ چچا نے بغداد کے ایک سکول میں صدام کو داخل کروا دیا۔ سکول میں ان کے ہم کلاس لڑکے چونکہ ان کے ہم عمر نہیں تھے۔ اس لئے کلاس روم میں وہ ہمیشہ دبے دبے رہتے۔ ان کا شمار اگرچہ ذہین لڑکوں میں ہوتا تھا لیکن دیر سے سٹارٹ لینے کی وجہ سے نفسیاتی طور پر ان کی تعلیمی کارکردگی کچھ ایسی اچھی نہ تھی۔ جب ان کی عمر 16 برس کی ہوئی تو انہوں نے بغداد ملٹری اکیڈمی میں داخلہ لینے کی کوشش کی لیکن تعلیمی استعداد کے مطلوبہ معیار پر پورا نہ اترنے کے باعث ان کو اس اکیڈمی میں داخلہ نہ مل سکا۔

اس طرح جب ان کا فوج جوائن کرنے کا خواب پورا نہ ہو سکا تو انہوں نے سیاسی تحریکوں میں حصہ لینا شروع کر دیا۔ بغداد پر شاہی خاندان کی حکمرانی تھی اور ملک میں قوم پرست تحریکوں کا زور تھا۔ چنانچہ بادشاہت کے خلاف ایک انقلاب میں انہوں نے بھی شرکت کی۔ یہ انقلاب ناکام رہا۔ چنانچہ صدام یہ پارٹی چھوڑ کر 1957ء میں بعث پارٹی میں شامل ہو گئے۔ اس وقت ان کی عمر بیس سال تھی۔ ایک برس بعد تکریت میں حکومت کا ایک اعلیٰ عہدیدار قتل ہو گیا۔ پولیس نے صدام کو گرفتار کر کے جیل میں ڈال دیا۔ ان پر چھ ماہ تک مقدمہ چلتا رہا۔ لیکن جب کوئی ثبوت نہ مل سکا تو انہیں رہا کر دیا گیا۔

انہی ایام میں جنرل عبدالکریم قاسم نے ایک فوجی انقلاب برپا کیا اور بعث پارٹی نے ان کا ساتھ دیا۔ بعد میں یہی بعث پارٹی قاسم کے

مخالفوں میں شامل ہوگئی۔1959ء میں عبدالکریم قاسم پر ایک قاتلانہ حملہ ہوا جس میں صدام نے بھی شرکت کی۔ یہ حملہ ناکام رہا اور صدام اس میں زخمی ہوگئے۔ کہا جاتا ہے کہ اگرچہ وہ شدید زخمی تھے لیکن اس کے باوجود انہوں نے دریائے دجلہ تیر کر عبور کیا اور فرار ہو کر شام جانے میں کامیاب ہوگئے۔ صدام کے حامی ان کے اس حملے کو بہت بڑھا چڑھا کر پیش کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ان کے زخم درجن سے زیادہ تھے ان کا بہت سا خون بہہ چکا تھا۔ لیکن ان کی جسمانی قوت اور عزم و حوصلہ کا عالم یہ تھا کہ وہ اس کے باوجود دجلہ جیسے بڑے دریا کو عبور کرنے میں کامیاب ہو گئے۔۔۔۔۔

دریائے دجلہ کا پانی واقعی بہت سے عظیم داستانوں کا شاہد ہیں۔۔۔۔۔ لیکن ان کے مخالفین یہ کہتے ہیں کہ صدام کے زخم معمولی تھے اور ان کے فرار میں بعث پارٹی نے ان کی بھرپور مدد کی تھی۔

بہرکیف اس کے بعد صدام حسین شام سے مصر چلے گئے اور وہاں چار سال تک مقیم رہے۔ یہیں انہوں نے قاہرہ میں ایک لاء کالج میں داخلہ لے لیا اور قانون کی تعلیم انہوں نے ابھی مکمل نہیں کی تھی کہ 1963ء میں بعث پارٹی نے جنرل عبدالکریم قاسم کو بغداد میں قتل کر دیا۔ صدام فوراً قاہرہ سے بغداد پہنچے اور بعث پارٹی میں تیزی سے ترقی کی منزلیں طے کرنے لگے۔ لیکن بعث کے مخالفین نے 1964ء میں جب بعث پارٹی نے دوبارہ اقتدار پر قبضہ کیا تو صدام کو جیل سے رہائی ملی اور وہ انقلابی کمانڈ کونسل کے ڈپٹی چیئرمین بن گئے۔

بعث پارٹی' عراق کی ایک ترقی پسند اور نہایت متحرک و فعال پارٹی تھی۔ اس کا شہرہ یہ تھا کہ یہ بادشاہت کی مخالف ہے اور شدت سے قوم پرست ہے۔ صدام نے ترقی کی منزلیں طے کرنے میں حیرت انگیز عجلت اور ذہانت کا مظاہرہ کیا۔ بعث پارٹی کی سیکورٹی فورسز بہت سنگدل اور جابر تھیں۔ فوج میں پرانے خیالات کے لوگ بھی کافی تھے۔ ایک ایسا طبقہ بھی تھا جو شاہ پرست تھا۔ صدام نے بہت ہوشیاری سے اس طبقے کو فوج سے خارج کیا اور ایک ایسی نوجوان قیادت کو اوپر لانے میں کامیاب ہوگئے جو شاہ پرست نہیں تھی بلکہ وطن اور قوم پرست تھی۔

1968ء سے 1979ء تک کے گیارہ برس میں صدام اگرچہ عراق کے صدر نہیں تھے' لیکن حقیقی طاقت انہی کے پاس تھی اور جب 1979ء میں وہ باقاعدہ عراق کے صدر منتخب ہوئے تو ان کی عمر صرف 41 برس تھی۔ اب وہ عراق کے سیاہ سفید کے مالک تھے۔ اوائل عمری میں ان کو ملٹری اکیڈمی میں تو داخلہ نہیں مل سکا تھا لیکن اب وہ اپنے تمام جرنیلوں کے سپریم کمانڈر تھے۔ انہوں نے فیلڈ مارشل کا رینک اپنے لئے منتخب کیا اور تمام پبلک اجتماعات میں فوجی وردی' کالی ٹوپی (Beret) اور فیلڈ مارشل کے رینک لگا کر شریک ہونے لگے۔

صدام حسین' ہٹلر سے بہت متاثر تھے۔ یوں بھی کہا جاسکتا ہے کہ ہٹلر' صدام کا ہیرو تھا جس کی زندگی کی داستان ہٹلر سے ہی ملتی جلتی ہے آیئے ایک نظر ہٹلر کی زندگی پر ڈال لیں۔ تاکہ تقابل میں آسانی رہے۔

ہٹلر کا بچپن بھی نہایت تنگدستی کے عالم میں گزرا۔ اس نے بھی اپنی تعلیم کا آغاز بہت بعد میں کیا۔ وہ بھی چھ برس تک آنا کے اسٹیشن پر ریلوے قلی کے طور پر کام کرتا اور اپنا پیٹ پالتا رہا۔ اس نے ہائی سکول میں داخلے کی درخواست دی لیکن فیل ہوگیا۔ ملٹری اکیڈمی میں جانے کی کوشش کی تو وہاں بھی ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔ چنانچہ وہ بطور کارپورل جرمن آرمی میں شامل ہوگیا۔ پہلی جنگ عظیم میں داد شجاعت دی اور بہادری کا اس وقت کا سب سے بڑا اعزاز حاصل کیا۔ پھر وہ قید ہوگیا اور قید ہی میں اس نے ''مین کیمپف (Mein Kampph)' نامی اپنی خودنوشت لکھی۔ یہ کتاب

پڑھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ جب اسے رہائی ملی تو وہ نازی پارٹی میں شامل ہوگیا اور ترقی کرتے کرتے پارٹی کا صدر اور جرمن کا چانسلر بن گیا۔

بطور سپریم کمانڈر وہ بھی فیلڈ مارشل کی وردی پہنتا تھا۔ اس نے درجنوں فیلڈ مارشلوں کو پرموٹ اور ڈیموٹ کیا اور اگر آپ دوسری عالمی جنگ کی ملٹری تاریخ پر نظر ڈالیں تو ہٹلر کی شخصیت آپ کو شدت سے متاثر کرے گی۔ یہ اور بات ہے کہ اس کے دشمنوں (فرانس، امریکہ، برطانیہ، روس بلکہ جاپان کو چھوڑ کر ساری دنیا) نے اسے ایک آمر اور ایک برے انسان کے طور پر متعارف اور مشہور کروایا' لیکن ہٹلر کی عسکری اہلیت و قابلیت میں کوئی شبہ نہیں' اس کا حافظہ غضب کا تھا اور اس کے عسکری جائزے بیشتر جرنیلوں کے جائزوں سے زیادہ درست نکلا کرتے تھے۔

بہر کیف عراق کی باگ ڈور سنبھالنے کے بعد صدام نے اپنے ملک کی ترقی میں اہم کردار ادا کرنے کا مشکل کام اپنے ذمے لیا۔ انہوں نے رفتہ رفتہ ایجوکیشن' زراعت' صنعت و حرفت اور سماجی ترقی کیلئے منصوبوں کو فروغ دینا شروع کر دیا۔ سعودی عرب کے بعد مشرق وسطیٰ میں تیل کے سب سے بڑے ذخائر عراق میں دریافت ہوئے۔ سعودی عرب کے برعکس عراق کی سرزمین پر تو دجلہ و فرات بھی بہتے تھے۔ آب و ہوا خوشگوار اور کھیتی باڑی کیلئے سازگار تھی۔ اس لئے دیکھتے ہی دیکھتے عراق نے تمام شعبوں میں تیزی سے ترقی کرنی شروع کر دی۔ صدام کا سب سے بڑا کنٹری بیوشن یہ ہے کہ انہوں نے عراقی افواج کی بنیاد رکھی اور بہت جلد سارے عرب ممالک میں عراقی آرمی ایئر فورس اور نیوی کا شہرہ ہونے لگا۔ عراق کی صرف ایک چھوٹی سی بندرگاہ جنوب میں واقع ہے جس کا نام ام قصر ہے۔ یہ گہرے پانی کی بندرگاہ ہے۔ اگر عراق کا ساحل بھی ایران کی طرح وسیع ہوتا یا کویت' اس کو مل گیا ہوتا تو اس میں کوئی شک نہیں کہ عراق کی نیول فورسز بھی آج دنیا بھی میں بہت مضبوط ہوتیں۔

صدام حسین اپنے اس نیشنلسٹ عرب انقلاب کو اپنے ہمسایہ ممالک تک لے جانا چاہتے تھے۔ اردن' سعودی عرب' کویت' قطر اور دوسری عرب ریاستوں میں بادشاہتیں قائم تھیں (اور آج بھی ہیں) یہی وجہ تھی کہ یہ سب ممالک' عراق کے خلاف تھے۔ یہ ممالک بھی تیل کی دولت سے مالا مال تھے اور چونکہ اس تیل پر امریکہ اور برطانیہ کا کنٹرول تھا۔ (براہ راست نہ سہی' بالواسطہ سہی) اس لئے ان ممالک کے حکمران صدام سے خائف تھے۔ امریکی اور برطانوی اثرات نے ان ممالک میں کوئی قابل ذکر عسکری تنظیم قائم نہ ہونے دی۔ مصر' افریقہ میں واقع تھا اور وہاں بھی کرنل جمال عبدالناصر کی قیادت میں فوجی انقلاب آ چکا تھا۔ دراصل صدام' مصر کے انقلاب سے بھی متاثر تھے۔ 1967ء کی عرب اسرائیل جنگ میں مصر اور شام کی شکست ان پر واضح کر چکی تھی کہ جب تک عرب ممالک اپنی افواج کو جدید خطوط پر تشکیل نہیں دیں گے' وہ دوسروں کے رحم و کرم پر ہی رہیں گے۔ پھر 1973ء کی جنگ میں مصر کی فتح اور اسرائیل کی شکست نے صدام کی اس سوچ کو مزید پختہ کر دیا کہ قوموں کا وقار صرف اور صرف عسکری وقت کے بل بوتے پر قائم ہوتا ہے۔ باقی سارے پہلو اس پہلو کے تابع ہوتے ہیں۔ دنیا کی کوئی قوم آج تک عسکری ترقی کے بغیر عظیم قوم نہیں بن سکی۔

صدام نے اپنی افواج کو جدید خطوط پر ڈھالنے اور انہیں ٹریننگ دینا شروع کی۔ امریکہ اور روس دو سپر پاورز تھیں بلکہ ایک دوسرے کی حریف تھیں۔ اس لئے خلیج کی ریاستوں میں امریکی غلبے نے صدام کو اشتراکی کیمپ کی طرف مائل کیا اور عراقی مسلح افواج کا اسلحہ اور ساز و سامان سوویت یونین کی طرف سے آنا شروع ہوا۔ 1980ء سے لے کر 1990ء تک انڈیا کے بعد عراق' روسی اسلحہ کا سب سے بڑا خریدار تھا۔ انڈیا اور عراق کے

تعلقات بھی ایک الگ باب کا تقاضا کرتے ہیں۔ ان تعلقات میں فوجی وجوہات سرفہرست تھیں۔ درجنوں بلکہ سینکڑوں انڈین آفیسر' عراقی آرمی اور ایئرفورس کو عسکری تربیت دینے پر مامور کیے گئے اور انڈیا کی ملٹری درسگاہوں میں عراقی افسروں اور دوسرے عہدیداروں کو ہر سال بڑی تعداد میں بھیجا جاتا رہا۔ عراقی آرمی کے ٹینک کمانڈرز' آرٹلری کمانڈر اور ایئرفورس کے پائلٹ وغیرہ سب کے سب یا تو روس میں تربیت حاصل کرتے رہے یا انڈیا میں۔ 1980ء کے عشرے میں پاک عراق تعلقات پر بھی عراق' بھارت تعلقات کی پرچھائیاں سایہ فگن رہیں۔

یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ صدام حسین کا اپنے ملک کیلئے ایک بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے اپنے تیل کی دولت کو دوسری فروعات پر ضائع نہیں کیا بلکہ اپنی افواج ثلاثہ کو مضبوط اور مستحکم بنانے میں صرف کیا۔

ایران پر حملہ:

صدام نے ایران پر حملہ کیوں کیا' اس کی کئی وجوہات تھیں جن میں سے دو بہت اہم تھیں۔ ایک شط العرب کا جھگڑا اور دوسری ایران میں شاہ ایران کا سقوط اور حضرت امام خمینی کی قیادت میں مذہبی حکومت کا قیام۔ شط العرب' ایران اور عراق کے مابین ایک حد فاصل ہے یہ ایک واٹر چینل ہے۔ بعض مقامات پر جہاز رانی ہو سکتی ہے لیکن زیادہ علاقہ دلدلی ہے۔ دونوں ممالک ایک عرصہ سے اس کے دعویٰ دار رہے ہیں۔ ایران کا دعویٰ یہ ہے کہ یہاں کے ساحلوں کی آبادی اکثر فارسی بولتی ہے اور شیعہ عقیدہ کی پیروکار ہے۔ دوسری طرف عراق کا کلیم یہ تھا کہ خلافت عثمانیہ کے دور میں بھی یہ ذخیرہ آب میسوپوٹیما کا حصہ تھا اور جب عراق آزاد ہوا تو یہ علاقہ بھی اس کے قبضے میں آ گیا۔ بہرحال 22 ستمبر 1980ء کو عراق نے ایران پر حملہ کر دیا۔ اس حملے میں صدام حسین کو امریکہ کی آشیرباد بھی حاصل تھی۔ انقلاب ایران سے پہلے رضا شاہ پہلوی کے تعلقات امریکہ سے نہایت گہرے تھے۔ ایرانی تیل کا بڑا خریدار امریکہ اور یورپ تھا اور جیسے کہ امریکن ارباب اقتدار کی عادت ہے' تیل کے بدلے ہتھیاروں کی ایک بڑی کھیپ ایران کو فروخت کی جاتی تھی۔ چنانچہ جب ایران پر نئی اسلامی جمہوریہ کا پرچم لہرایا گیا تو امریکہ کو فکر لاحق ہوئی کہ اب عراق اور سعودی عرب تک بھی اس کے اثرات جائیں گے۔ اسلحہ اور گولہ بارود کے جو انبار ایران میں موجود تھے' ان کو ضائع کرنا بھی مقصود تھا۔ اس لئے امریکہ نے ایران کے ساتھ جنگ شروع کرنے میں عراق کا بھرپور ساتھ دیا۔ تاکہ اس طرح امریکی مقاصد حاصل کئے جا سکیں۔

تاہم ایرانی شہروں پر عراقی یلغار ناکام ہوئی اور ایک سال بعد 1981ء میں ایرانی فوجیں بصرہ تک جا پہنچیں۔ بصرہ کی آبادی کا 55 فیصد حصہ شیعہ مذہب کا حامل ہے اور باقی 45 فیصد سنی مسلمان رہتے ہیں۔ جس میں 20 فیصد کرد بھی شامل ہیں۔ بصرہ کی آبادی کی اکثریت بھی شیعہ تھی۔ لیکن صدام نے وہاں ایسے دفاعی انتظامات کئے کہ ایرانی افواج بصرہ پر قبضہ نہ کر سکیں۔ جنگ ساکن ہو کر رہ گئی۔ دریں اثناء امریکہ کی مدد سے عراق نے کیمیاوی' بیالوجیکل اور نیوکلیئر ہتھیار بنانے شروع کر دیئے کہ اگر بغداد پر برا وقت آئے تو ان کا بے دریغ استعمال کیا جا سکے۔ تاریخ گواہ ہے کہ ان ہتھیاروں نے جنگ کے نتائج پر بہت گہرا اثر ڈالا۔ بغداد کے نواح میں ایٹمی ری ایکٹر کی تعمیر کو اسرائیل نے شک وشبہ کی نظر سے دیکھا اور حملہ کر کے اس ری ایکٹر کو تباہ کر دیا۔ البتہ امریکی ایماء پر عراق میں کیمیاوی اور جراثیمی ہتھیار تیار ہوتے رہے۔ عراق نے ایران کے خلاف 1984ء، 1985ء اور 1986ء میں اس کا استعمال بھی کیا اور اس کے بعد کردوں کی بغاوت آنے پر بھی یہ ہتھیار استعمال کئے گئے۔ ہزاروں'

لاکھوں مرد، عورتیں، بچے اور بوڑھے ان کا شکار ہوئے۔

امریکہ کو اب ایران عراق جنگ بند کرانے کی فکر تھی۔ نیز وہ یہ بھی نہیں چاہتا تھا کہ عراق ایٹمی ہتھیار بنائے لیکن صدام ایسا کرنا چاہتے تھے چنانچہ اس خطرے کا سدباب کرنے کیلئے امریکہ نے جنوری 1983ء میں اس خطے میں ایک نئی کمانڈ تشکیل دی جس کا نام سنٹرل کمانڈ (Cen com) رکھا۔ آج ٹومی فرینکس اس کے کمانڈر ہیں۔ اس کمانڈ کی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ مشرق وسطیٰ اور اس سے بھی آگے انڈونیشیا تک امریکی مفادات کا تحفظ کرے اور سیاسی حالات پر بالواسطہ اثر انداز ہو۔

کویت پر حملہ:

ایران پر حملے کے دس برس بعد کویت پر حملہ صدام حسین کی سب سے بڑی غلطی شمار کی جاتی ہے۔ کویت ایک چھوٹا سا آزاد ملک تھا (اور ہے) اور اقوام متحدہ کا ممبر ہے۔ 2 اگست 1990ء کو عراق نے کویت پر حملہ کر کے تین چار روز میں اسے فتح کر لیا اور عراقی افواج اس جانب سے سعودی عرب کی سرحدوں تک جا پہنچیں۔

یہ درست ہے کہ صدام کا کویت پر حملہ کرنا غلط تھا۔ لیکن ان کی سب سے بڑی غلطی یہ نہیں تھی کہ انہوں نے ایک آزاد اور خود مختار ملک پر دھاوا بولا بلکہ یہ غلطی وہ پہلے بھی ایران پر حملہ کر کے کر چکے تھے۔ ان کی اصل غلطی یہ تھی کہ اس حملے میں انہیں امریکہ کی حمایت حاصل نہیں تھی بلکہ امریکہ کی طرف سے انہیں شدید مزاحمت کا سامنا تھا۔

صدام کی شخصیت کا یہ پہلو کہ انہوں نے اپنے دوست امریکہ کے غیض وغضب کی پرواہ نہ کر کے کویت پر حملہ کیا، ان کے کردار کا تعین کرنے میں بہت مددگار ہوگا۔ بہت سے قارئین کو شاید صدام حسین کا مؤقف معلوم نہ ہو انہوں نے کویت پر یہ حملہ کیوں کیا۔ ان کی معلومات کیلئے عرض ہے کہ کویت پر عراقی حملے کی مندرجہ ذیل پانچ وجوہات تھیں۔

1- پہلی جنگ عظیم 1914ء تا 1918ء سے پہلے کویت، عراق کا حصہ تھا۔ نقشے پر نگاہ ڈالیں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ جغرافیائی اعتبار سے واقعی عراق کا حصہ ہے۔ تاہم انیسویں صدی عیسوی میں برطانیہ نے ان علاقوں پر اپنا اثر ورسوخ اور تسلط جما لیا اور کویت کو ایک الگ ریاست کا نام دے کر خلیج فارس میں اپنی بحری موجودگی کا بندوبست کر لیا۔ تیل تو بعد میں دریافت ہوا۔ خلافت عثمانیہ کے ٹوٹنے کے بعد جب عراق آزاد ہوا تو اس نے فوراً کویت کو واپس لینے کا مطالبہ کیا جسے برطانیہ نے نامنظور کر دیا۔

برطانیہ کو خطرہ تھا کہ اس علاقے میں اگر جرمن اثرات مضبوط اور گہرے ہو گئے تو برطانوی مفادات پر زد پڑے گی۔ اس لئے اس نے خلیج فارس کے مغربی ساحلوں کو بہت سی نیم خود مختار ریاستوں میں تقسیم کر دیا۔ آج ان ریاستوں کو خلیجی ریاستیں کہا جاتا ہے۔ کویت، بحرین، قطر اور متحدہ عرب امارات تک کے سارے علاقے سعودی عرب کا حصہ تھے یا عراق کے۔ لیکن برطانوی استعماری انتظامات نے اس خطے کو تقسیم کر کے مستقبل کی بہت سے جنگوں اور جھگڑوں کی بنیاد رکھ دی۔

2- دوسری وجہ یہ تھی کہ ایران عراق وار کے دوران صدام حسین نے کویت اور سعودی عرب سے بہت سا قرض حاصل کیا۔ یہ قرض اس مفروضے

پر لیا گیا تھا کہ ایران' اپنی نئی شیعہ سلطنت کی توسیع کرنا چاہتا ہے۔ جس سے کویت کو بھی خطرہ ہے اور سعودی عرب کو بھی۔ ان دونوں ممالک (کویت اور سعودی عرب) نے 1990ء کی عراق امریکہ جنگ میں امریکہ کو جو مالی مدد دی تھی وہ بھی اس خطرے کے سبب دی تھی کہ عراق کویت کے بعد سعودی عرب پر حملہ کر کے اس پر قبضہ کرنا چاہتا تھا۔ بہر کیف ایران عراق جنگ میں کویت نے عراق کو 80 ارب ڈالر کا قرض دیا۔ جنگ کے بعد جب صدام حسین نے یہ جواز پیش کیا کہ یہ قرضہ معاف کر دیا جائے جو خود کویت کے تحفظ کیلئے حاصل کیا گیا تھا تو کویت نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا۔ اس نے صرف 15 ارب ڈالر معاف کئے اور باقی 65 ارب ڈالر معاف کرنے پر تیار نہ ہوا۔ صدام نے اس کیلئے کویت کے حکمرانوں کو قصوروار گردانا۔

3- تیسری وجہ یہ تھی کہ کویت کے بعض امراء اور تاجر بے حد دولت مند تھے اور مغربی ممالک کے بینکوں میں ان کے اربوں ڈالر جمع تھے صدام نے سوچا کہ یہ رقم حاصل کر کے ایران عراق جنگ کے اقتصادی بوجھ سے نجات حاصل کر جا سکتی ہے۔

4- چوتھی وجہ کویت کا رومیلہ (Rumalla) کے علاقے میں تیل کے کنوؤں کی کھدائی تھی۔ یہ علاقہ کویت اور عراق کے مابین متنازعہ علاقہ ہے۔

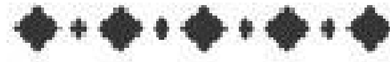
5- پانچویں اور آخری وجہ کویتی تیل کی زائد پیداوار تھی۔ کویت نے اوپیک معاہدہ کی خلاف ورزی کرتے ہوئے اپنے کنوؤں سے تیل کی زیادہ مقدار نکالنی شروع کر دی جس سے عالمی مارکیٹ میں تیل کی قیمتیں گر گئیں۔ عراق کو پہلے ہی سرمائے کی کمی کا سامنا تھا۔ کویت کی اس ''حرکت'' نے صدام کو سیخ پا کر دیا اور انہوں نے 17 جولائی 1990ء کو کویت کو وارننگ دی کہ یا تو تیل کی یہ زائد تولید روکی جائے وگرنہ اس پر حملہ کر دیا جائے گا۔ صدام حسین نے کویتی حکمرانوں کو یہ پیغام بھی بھیجا کہ اس مسئلے پر مذاکرات کئے جائیں لیکن کویت نے انکار کر دیا اور کہا کہ ان مذاکرات کو اگر ہونا ہی ہے تو عرب لیگ کے توسط سے عمل میں لایا جائے۔ اس کے بعد کویت پر حملے کا کاؤنٹ ڈاؤن شروع ہو گیا۔

صدام حسین پر یہ الزام بھی ہے کہ انہوں نے 1987ء اور پھر 1988ء میں دو بار کردوں پر جراثیمی ہتھیار استعمال کئے۔ اس استعمال کا سبب یہ بتایا گیا کہ کردوں نے ایران عراق جنگ میں ایران کا ساتھ دیا تھا' اس لئے ان کو اسی خوفناک حملے کا نشانہ بنایا گیا۔ بی بی سی بار بار کردوں پر کیمیاوی حملے کے اثرات کی تصاویر دکھاتا رہتا ہے۔ لیکن اگست 1945ء میں جو کچھ امریکہ نے جاپانیوں کے ساتھ کیا تھا' اس کی تصاویر شاید سال بھر میں ایک آدھ بار اور وہ بھی خانہ پری کے لئے دکھائی جاتی ہیں۔ جاپانی عوام جو ان ایٹمی حملوں میں ہلاک ہوئے ان کی تعداد دو لاکھ سے زیادہ تھی اور جو زخمی ہوئے ان کی تعداد کئی لاکھ تھی۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ ایٹمی حملے کے اثرات' جراثیمی حملے کے اثرات سے کئی گنا زیادہ بھیانک ہوتے ہیں۔

صدام حسین آسمان عرب کا وہ درخشندہ ستارہ ہے جس نے عراق کو بہت کم مدت میں ایک قدیم' فرسودہ اور روایت پسند معاشرے سے اٹھا کر ایک جدید' متحرک اور ترقی پسند سوسائٹی میں تبدیل کر دیا۔ عراق کے بڑے بڑے شہروں کی جو تصاویر ٹیلی ویژن پر دکھائی جاتی ہیں ان سے اندازہ کیا

جاسکتا ہے کہ یہ ملک کس طرح تیزی سے ترقی کر رہا تھا۔

لیکن میں سمجھتا ہوں۔ صدام کا سب سے بڑا کارنامہ ملک کی تعلیمی حالت کو سنوارنا ہے۔ عوام کو جدید سائنسی علوم اور ٹیکنالوجی کا شعور دینا ہے۔ ان میں گروہی، نسلی اور مذہبی امتیازات کا خاتمہ کرنا اور عراقی آبادی کو حب الوطنی کی لڑی میں پرونا ہے۔ ان کا ایک اور کارنامہ جدید عراقی آرمی کی تشکیل ہے۔ عرب دنیا میں کوئی دوسری فوج، عراقی فوج کا مقابلہ نہیں کرسکتی۔ صدام نے یہ سب کچھ بہت زیادہ شور شرابے کے ساتھ نہیں کیا۔ وہ نہایت خاموشی لیکن نہایت استواری اور تسلسل کے ساتھ ایک ایسی مسلح فورس کی تشکیل، تکمیل کرتے رہے ہیں جن کو امریکہ اور یورپ کی بہت سی ریاستوں کی طرف سے شدید مزاحمت بلکہ دشمنی کا سامنا تھا۔ بغداد پر قبضے کے بعد تمام عراقی فوج منظر سے ایسے غائب ہوئی کہ آج بھی اس کے بارے میں تجسس سے یہ کہا جاتا ہے کہ اتنی بڑی تعداد میں عراقی فوج کہاں گئی۔ بہرکیف سرزمین عراق پر امریکہ کا قبضہ تو ہو چکا ہے لیکن امریکی فوج اپنے تمام تر ہتھکنڈوں کے باوجود عراقی عوام کے دلوں سے صدام حسین کے محبت بھرے اثرات ختم نہیں کر سکے گی جو ایک عظیم محب وطن تھا اور تاریخ اس کے ذکر کے بغیر ہمیشہ نامکمل رہے گی۔



صدام حسین کی پھانسی اور تاریخ کا اہم سبق

سابق عراقی صدر اور مرد آہن صدام حسین کو 30 دسمبر 2006 کی صبح مقامی وقت کے مطابق علی الصبح چھ بجے بغداد کے گرین زون میں پھانسی دے دی گئی بعدازاں ان کی میت کو تکریت کے آبائی قبرستان میں نہایت خاموشی سے دفن بھی کر دیا گیا، کہا جاتا ہے کہ یہ قبر صدام حسین نے اپنے دور اقتدار میں اپنے لئے کھدوائی تھی جس کے پہلو میں ان کی والدہ اور ان کے دو شہید بیٹے بھی مدفن ہیں سرکاری ذرائع کے مطابق صدام حسین کو پھانسی کی یہ سزا 5 نومبر 1982 کو 148 شیعہ مسلمانوں کو جیل میں ہلاک کرنے کا حکم دینے کی پاداش میں سنائی گئی جبکہ سزا کے خلاف صدام حسین کی اپیل پھانسی سے چار روز قبل ہی مسترد کر دی گئی تھی عینی شاہدوں کے مطابق صدام حسین نے غسل اور وضو کر کے پہلے نماز فجر ادا کی پھر خود چل کے پھانسی گھاٹ تک آئے جہاں انہیں سیاہ نقاب پہنانے کی کوشش کی گئی لیکن انہوں نے نقاب پہننے سے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ وہ کھلی آنکھوں سے امریکی ایما پر دی جانے والی پھانسی کے پھندے پر جھول جانے کو اپنی شہادت تصور کرتے ہیں ٹی وی کے مختلف چینلز پر پھانسی کی جو تصویری رپورٹ دکھائی گئی اس میں صدام حسین پھانسی سے چند لمحے قبل تک انتہائی مطمئن اور پرسکون دکھائی دیئے گویا انہیں پھانسی پر چڑھنے کا کوئی خوف اور ملال نہیں تھا ایسا بہت کم دیکھا گیا ہے کہ پھانسی پر چڑھنے والے لوگ خود اپنے قدموں سے مکمل ہوش حواس کے ساتھ چل کر پھانسی گھاٹ تک جائیں پاکستان میں بھٹو کو دی جانے والی پھانسی کے بارے میں اب تک یہ خبر سننے میں آتی ہیں کہ انہیں سٹریچر پر ڈال کر پھانسی گھاٹ تک لے جایا گیا تھا اور جس وقت پھندہ ان کی گلے میں ڈالا گیا وہ شعور کی حالت میں نہیں تھے زندگی سے پیار اور موت کا خوف کسے نہیں ہوتا انسان ہونے کے ناطے پھانسی کا لفظ انسان کو وقت سے پہلے ہی مار ڈالتا ہے

صدام حسین کو پھانسی تو دی جا چکی ہے اور انہیں دفن بھی کیا جا چکا ہے لیکن ان کی زندگی اور موت کا تجزیہ کیا جائے تو ان کی زندگی تین عوامل کے تناظر میں گھومتی نظر آتی ہے ان کی لائف ہسٹری بتاتی ہے کہ 28 اپریل 1937 کو جب تکریت میں صدام حسین نے ایک کسان گھرانے میں آنکھ کھولی تو ان کی ولادت سے پہلے ان کے والد کا انتقال ہو چکا تھا گویا پیدا ہی یتیم ہوئے شفقت پدری کا سر پر موجود نہ ہونا ہمارے مسلم معاشرے میں انتہائی تکلیف دہ تصور کیا جاتا ہے پھر صدام نامی یہ بچہ شعور کی حالت کو پہنچنے کے بعد اپنے ماموں کے پاس چلا آیا بغدار اور قاہرہ سے تعلیم مکمل کی دوران تعلیم ہی سیاسی سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کے حصہ لینے لگا سیاست میں فعال کردار ادا کرنے کے عوض بہت جلد عراق کی بعث

پارٹی کے قابل ذکر رہنماؤں میں ان کا شمار ہونے لگا 1968 کے انقلاب کے نتیجے میں جب بعث پارٹی کو ایک بار پھر اقتدار ملا تو صدام حسین اس حکومت میں نائب صدر کی حیثیت سے منظر عام پر آئے پورے دس سال نائب صدر کے طور پر فرائض منصبی انجام دیتے رہے 1979 میں جب عراقی صدر احمد حسن بکر نے خراب صحت کی بنیاد پر استعفیٰ دیا تو صدام حسین صدر کی حیثیت سے عراق کے اقتدار پر مکمل طور پر چھا گئے یہاں ہم سب کے لئے بہت بڑا سبق پنہاں ہے کہ ایک یتیم بچہ جس کے پیدا ہونے سے پہلے ہی باپ فوت ہو چکا تھا کس طرح مشکل ترین حالات و واقعات سے نبرد آزما ہوتا ہوا منصب صدارت تک جا پہنچا اسے کہتے ہیں اللہ جو چاہتا ہے اور جسے عزت دینا چاہتا ہے دے دیتا ہے انسانی عقل خدائی فیصلوں کی گہرائی تک نہیں پہنچ سکتی ایک مرتبہ خالق کائنات نے ملک الموت حضرت عزرائیل علیہ السلام سے پوچھا کہ تم حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر کروڑوں بلکہ اربوں انسانوں کی جان قبض کر چکے ہو اور خصلتاً بے رحم مشہور ہو، کیا تمہیں جان نکالتے وقت کسی پر رحم بھی آیا حضرت عزرائیل علیہ السلام نے کہا اے باری تعالیٰ میں تو وہی کرتا ہوں جس کا تو حکم دیتا ہے اور تیرے حکم کی سرتابی کا تصور بھی نہیں کر سکتا لیکن مجھے دو مرتبہ رحم ضرور آیا تھا ایک مرتبہ جب سمندر میں تیرتا ہوا جہاز سمندری لہروں کی نذر ہو کر ٹوٹ گیا اس میں سوار تمام انسان سمندر میں ڈوب کر مر گئے تھے لکڑی کے تختے پر ایک ماں اپنی نومولود بچے کے ساتھ سمندری لہروں کے تھپیڑوں پر تیر رہی تھی اور تیز ہوا کی وجہ سے کسی بھی وقت لکڑی کا وہ تختہ الٹ سکتا تھا جس کی وجہ سے اس پر سوار ماں اور بچہ بھی سمندر میں باقی لوگوں کی طرح غرق ہو جاتے اس نازک لمحے تیرا حکم ہوا کہ لکڑی کے تختے پر تیرتی ہوئی ماں کی جان قبض کر لوں جان تو میں نے تیرے حکم کے مطابق قبض کر لی لیکن دل میں خیال ضرور پیدا ہوا کہ ماں کے مرنے کے بعد اب اس بچے کا کیا بنے گا حضرت عزرائیل علیہ السلام نے کہا کہ دوسری مرتبہ مجھے اس وقت ترس آیا جب شداد نامی بادشاہ نے اپنے لئے جنت بنائی دولت کے انبار اس کی تعمیر میں صرف کر دیئے ہر قسم کے پھل دار پودے اور جنت کا سماں پیدا کرنے والی حوریں اس میں چھوڑیں لیکن جب جنت بالکل تیار ہو گئی تو شداد اپنی بنائی ہوئی جنت کو دیکھنے کے لئے آیا ابھی اس کا ایک قدم جنت سے باہر اور ایک اندر ہی تھا کہ تیرا حکم ہوا اس کی روح قبض کر لوں پروردگار نے حضرت عزرائیل کی بات سن کے فرمایا جس بچے کی ماں کی جان تم نے سمندری لہروں پر تیرتے ہوئے لکڑی کے تختے پر قبض کی تھی اور گمان کیا تھا کہ ماں کے مرنے کے بعد اب اس بچے کا کیا بنے گا یہ وہی بچہ تھا جسے ہم نے ساحل پر پہنچا کر ایک ایسے معزز گھرانے میں پرورش کروائی کہ اس کی ذات میں بے شمار خوبیاں پیدا فرمائیں پھر وہ بچہ لڑکپن اور نوجوانی کی حدیں عبور کرتا ہوں بادشاہت کی مسند تک جا پہنچا لیکن بادشاہ بننے کے لئے بعد اس

نے شکر ادا کرنے کی بجائے کفران نعمت کیا اور یہ کہہ کر خود ساختہ جنت بنانے لگا کہ مرنے کے بعد خدا جس جنت کا وعدہ کرتا ہے میں زندگی میں ہی اسے بنا لیتا ہوں

گویا یہ وہی بچہ تھا جو بعد بادشاہ کے روپ میں شداد کہلایا اس لئے جو میں بہتر جانتا ہوں کوئی اور نہیں جانتا

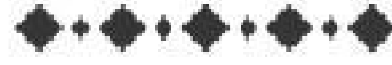
اس میں کوئی شک نہیں کہ عراق کی جدید پیمانے پر ترقی کے لئے صدام حسین نے انتہائی اہم کردار ادا کیا لیکن ان کی زندگی کا دوسرا ناپسندیدہ پہلو ایک برادر ملک ایران کے خلاف امریکہ کے ایما پر دس سال تک غیر ضروری جنگ لڑنا تھا ذاتی انا کو تسکین پہنچانے والی اس بے مقصد جنگ

کے نتیجے میں عراق اور ایران دونوں جانب کے لاکھوں مسلمانوں نے جانوں کا نذرانہ پیش کیا قابل ذکر بات تو یہ ہے کہ امریکہ نے ایرانی عوام کے خلاف استعمال کرنے کے لئے انتہائی ہولناک اور تباہ کن میزائیل اور ہتھیار دانستہ صدام حسین کو دیئے تا کہ ان ہولناک ہتھیاروں کا شکار ہو کر دونوں جانب زیادہ سے زیادہ مسلمان ہلاک اور برباد ہوں اس جنگ کے حوالے سے صدام حسین کا کردار کسی بھی طرح تحسین کے قابل نہیں قرار دیا جاسکتا اگر یہی طاقت وہ اسرائیل کے خلاف استعمال کرتا تو اسرائیل کبھی عربوں کے درمیان استحکام حاصل نہ کر پاتا لیکن بد قسمتی سے صدام یہودیوں اور عیسائی طاقتوں کا آلہ کار بن کے مسلم امہ کے خلاف ہی بے جا طاقت استعمال کرتا رہا جو اس کی زندگی کا تاریک ترین باب ہے

1988 میں مسلم امہ کے مجبور کرنے پر جب جنگ بند ہوگئی تو صدام حسین نے بلا سوچے سمجھے ایک اور پڑوسی مسلم ریاست کویت پر یلغار کر دی اور آناً فاناً اس پر عراقی فوج قابض ہوگئی اس کی اس حماقت کا فائدہ امریکہ اور اس کے اتحادیوں کو اس طرح ہوا کہ کویت کو آزاد کرانے کے لئے ان کی فوجیں کویت میں جا اتریں اور صرف چند دنوں میں ہی عراقی فوج کو دھکیلتی ہوئی عراقی سرحدوں کے اندر تک لے گئیں اس عراقی یلغار کے نتیجے میں کویت کی معیشت کو نا قابل تلافی نقصان پہنچا تیل کے بیشتر کنوؤں کو عراقی فوج نے آگ لگا دی کویت کی حدود میں آنے والے تمام شہروں اور قصبوں کو درندگی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ایسا لوٹا جیسے ایک جارح فوج مفتوح ممالک کو لوٹا کرتی ہے کویتی معیشت کی رہی سہی کسر امریکی فوج نے دفاع کی آڑ میں اس کے وسائل پر قبضہ کر کے نکال دی صدام حسین کا یہ اقدام بھی تاریخ کے اوراق میں انتہائی شرمناک باب کی حیثیت سے موجود رہے گا

صدام حسین کی زندگی کے تیسرے اور سبق آموز دور کا آغاز 19 مارچ 2003 کو اس وقت شروع ہوتا ہے جب ایران کے خلاف عراق کی حمایت کرنے والا جارح ملک امریکہ اور اس کی اتحادی فوجوں نے سرزمین عراق پر یہ کہہ کر حملہ کر دیا کہ عراق کے پاس خطرناک ترین ہتھیار موجود ہیں جن کی موجودگی بالخصوص اسرائیل کے لئے خطرناک ہے صدام حسین حقائق کے برعکس بڑھکیں مارتے رہے کہ عراقی سرزمین کو امریکی فوجوں کے لئے قبرستان بنا دیں گے صدام نے ایک اور احمقانہ حرکت یہ کی کہ اپنی فوجوں کو سعودی عرب کی سرحد پر بھی یلغار کے لئے تعینات کر دیا سعودی عرب کی سالمیت کو خطرے میں محسوس کر کے پاکستان سے افواج کو بھیجا گیا لیکن خدا کا شکر ہے کہ صدام نے ارض مقدس پر حملے کا ارادہ ملتوی کر کے مسلم امہ پر احسان عظیم کیا ورنہ اپنے ہی ہاتھوں ارض مقدس کی بے حرمتی ہو جاتی ہے جس پر غیر مسلم اقوام کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ ہوتا بلکہ امریکہ کو دفاع کی آڑ میں سعودی عرب میں مزید قدم جمانے کا موقعہ میسر آ جاتا ہے بہر کیف چند ماہ کی مزاحمت کے بعد عراقی فوجیں پسپا ہو گئیں امریکی اور اتحادی فوجوں نے بغداد سمیت پورے عراق پر قبضہ کر لیا اس قبضے کے بعد امریکی جریدے کی رپورٹ کے مطابق اب ساڑھے چھ لاکھ مزید انسان لقمہ اجل بن چکے ہیں جن میں امریکی صرف تین ہزار ہیں اتنی بڑی ہلاکتوں کا ذمہ دار صدام ہے یا بش اس کا فیصلہ تاریخ ہی کرے گی لیکن یہ بات کہنے میں عار محسوس نہیں ہوتی کہ صدام حسین نے اپنی مقبولیت کے برعکس مسلم امہ کی مضبوطی اور استحکام کے لئے کام کرنے کی بجائے ان کو اپنے دور اقتدار میں آزمائشوں، مصیبتوں اور پریشانیوں میں ہی مبتلا کئے رکھا طاقت اور اختیارات کا جنون انہیں ایک ہیرو کی بجائے ایک جابر انسان کے روپ میں دکھاتا ہے ان تمام واقعات سے یہ سبق بھی ملتا ہے کہ امریکہ جس کو پہلے اپنے مقاصد کی تکمیل کے لئے استعمال کرتا

ہے وقت گزرنے کے بعد اسی شخص کو صفحہ ہستی سے مٹانا بھی وہ اپنا فرض اولین سمجھتا ہے یہ سبق صرف عراق کی حد تک ہی محدود نہیں ہے پاکستان کے کئی حکمران اس امریکی رویے اور طوطا چشم پالیسیوں کا شکار ہو چکے ہیں بلکہ موجود حکمرانوں کا انجام بھی صدام سے مختلف نظر نہیں آتا جو اٹھتے بیٹھے دہشت گردی کے خلاف جنگ کرنے کے ساتھ ساتھ امریکی ایما پر روشن خیالی کے روپ میں پاکستان جیسے اسلامی معاشرے میں ہر سطح پر بے حیائی اور بے راہ روی کا ماحول پروان چڑھنا چاہتے ہیں کہ یہاں کسی کی عزت اور آبرو محفوظ نہ رہے میں سمجھتا ہوں صدام حسین کا انجام ہمارے حکمرانوں کے لئے بالخصوص لمحہ فکریہ پیدا کرتا ہے جو امریکی حکمرانوں کی اشیرباد حاصل کرنے کے لئے اپنے ہی ملک میں اور اپنے ہی ہم وطنوں کے خلاف نہ صرف جنگ عروج پر پہنچا چکے ہیں بلکہ اب بھی جاری رکھے ہوئے ہیں بحیثیت انسان اور مسلمان مجھے صدام حسین کی پھانسی پر دلی دکھ اور رنج ہے لیکن دوسروں کی خاطر اپنوں کو ہلاکتوں کا شکار کرنے والے عناصر کا انجام اس سے مختلف نہیں ہوا کرتا یہی تاریخ کا اہم سبق ہے



صدام..........مرد آہن

ہٹلر اور نپولین کے بعد صدام حسین دنیا کا ایک ایسا حکمران تھا جسے تاریخ دان اور محقق کبھی فراموش نہ کر سکیں گے۔ صدام حسین نے اپنے چوبیس سالہ دور اقتدار میں انتہائی متحرک اور متنازعہ زندگی بسر کی۔ اقتدار میں آنے سے پہلے اور اقتدار سے معزولی کے بعد بھی صدام حسین خبروں کا مرکز رہے۔

دنیا کی واحد سپر پاور امریکہ کو جس تسلسل سے انہوں نے چیلنج کیا وہ اپنی جگہ منفرد حیثیت کی حامل ہے۔ صدام حسین کی شخصیت ان کے سیاسی نظریات اور دور حکمرانی کا تجزیہ کرنے سے حیران کن پہلو سامنے آتے ہیں۔ عراق کے مرد آہن صدام حسین کا دور اقتدار 10 اپریل 2003ء کو سقوط بغداد کے ساتھ ختم ہوا تقریباً آٹھ ماہ بعد 13 دسمبر 2003ء کو صدام حسین کو امریکی فوج نے ان کے آبائی گاؤں تکریت کے قریب ایک زیر زمین ٹھکانے سے گرفتار کیا۔ امریکہ کے زیر اثر بغداد میں قائم کی جانے والی عراقی عدالت نے انسانیت کے خلاف جرائم کی بنیاد پر مقدمہ چلایا اور پھانسی کی سزا دینے کا اعلان کیا۔ صدام کو مشرق وسطیٰ میں عیدالاضحیٰ کے دن پھانسی دے دی گئی، اس طرح صدام کی قسمت کے فیصلے پر عمل درآمد ہو چکا ہے۔ صدام اگر چاہتے تو جنگ سے پہلے بھی فرار ہو سکتے تھے۔ امریکی قبضے کے وقت بھی ہتھیار ڈال سکتے تھے، یا کسی اور ملک میں پناہ لے سکتے تھے، لیکن انہوں نے اپنے اس قول کو سچ کر دکھایا کہ "عراق میں پیدا ہوا ہوں اور عراق میں ہی مروں گا۔"

امریکہ عراق جنگ کی رپورٹنگ کے دوران بغداد، شام اور اردن میں میری جن دانشوروں، صحافیوں اور صاحب الرائے افراد سے ملاقات ہوئی، انہوں نے صدام حسین کے بارے میں مختلف آراء کا اظہار کیا اس کی تفصیل میں نے اپنی کتاب "میں نے بغداد جلتے دیکھا" میں بیان کی ہے۔ ان آراء کو تین حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

1۔ صدام امریکی ایجنٹ تھا اس نے امریکی مفادات کا بھرپور تحفظ فراہم کیا اور ملت اسلامیہ کو عظیم نقصان پہنچایا۔

2۔ صدام، عالم اسلام کا ایک ایسا قوم پرست جنگجو عرب حکمران تھا جس نے سپر پاور کے سامنے سرنگوں ہونے کی بجائے اصولوں کی خاطر سب کچھ قربان کر دیا۔

3۔ صدام اسرائیل اور امریکی حاشیہ بردار حکمرانوں کے سخت خلاف اور آزادی کی تحریکوں کا سرپرست رہا۔

ایک طبقہ فکر نے صدام کے سارے گناہ معاف کر کے انہیں اسلام کا ہیرو قرار دیا ہے۔ دوسروں کا کہنا ہے کہ صدام حسین عقل سے عاری ایک ظالم اور ضدی حکمران تھا جس نے عالم اسلام کے مفادات کو ناقابل تلافی نقصان پہنچایا......... صدام نے صدر کا منصب سنبھالنے کے 14 ماہ بعد ایران پر حملہ کر دیا۔ 9 سال تک جاری رہنے والی اس جنگ میں تین لاکھ سے زیادہ عراقی اور سات لاکھ کے قریب ایرانی مسلمان جان گنوا بیٹھے۔ 20 لاکھ سے زیادہ زخمی ہوئے۔ افغانستان پر سوویت یونین کا فوجی قبضہ ہوا تو صدام حسین نے اس کی حمایت کی۔ 1990ء میں صدام حسین نے کویت پر قبضہ کر لیا۔ وہاں قتل و غارت گری کا شکار بننے والے سب کے سب مسلمان تھے۔

کچھ دانشور صدام کو صلاح الدین ایوبی قرار دیتے ہیں، دوسرے کہتے ہیں کہ صدام حسین اور صلاح الدین ایوبی میں کیا مماثلت تھی؟ صلاح الدین ایوبی نے عربوں کو متحد کیا، صدام حسین نے عربوں کو تقسیم کیا۔ صلاح الدین ایوبی حسن اخلاق، رحم دلی اور انسانیت کا پیکر تھا جبکہ صدام حسین ایک ظالم، جابر اور قاتل تھا جو مخالفوں کو اپنے ہاتھ سے گولی مارنا پسند کرتا۔ صلاح الدین ایوبی نے قبلہ اول کو عیسائیوں سے آزاد کرایا اور غیر ملکیوں کو اپنے خطے سے نکالا، صدام حسین نے غیر ملکیوں کو اس خطے میں اڈے بنانے کے مواقع مہیا کیے اور ملت اسلامیہ کے نمائندہ شہروں نجف و کربلا، بغداد اور بصرہ پر غیر ملکی قبضے کرا دیئے۔

صدر صدام دنیا کا واحد سربراہ تھا جس نے ورلڈ ٹریڈ سنٹر اور پینٹاگون کے حادثے پر امریکہ سے افسوس کا اظہار نہیں کیا۔ صدام حسین نے اسرائیل پر فدائی حملے کرنے والوں کی نہ صرف یہ کہ مالی اعانت کی بلکہ ان کی شہادت کے بعد اہل خانہ کے وظائف بھی مقرر کیے۔ صدام حسین نے فدائی حملوں میں شہید ہونے والے ہر فرد کی مالی مدد کیلئے ایک خصوصی فنڈ قائم کیا ہوا تھا۔ اس فنڈ سے ہر فدائی کے کنبے کو فوری طور پر 25 ہزار ڈالر دیئے جاتے تھے۔

صدام حسین نے اقتدار میں آتے ہی پورے ملک میں کنڈر گارٹن سے لے کر یونیورسٹی تک مفت تعلیم کر دی۔ پورے ملک میں ایک معین نصاب کا کورس شروع کیا۔ پورے ملک میں سکولوں اور ہسپتالوں کی نئی عمارتیں تعمیر کرائیں، ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے ذریعے مضبوط تعلیمی نیٹ ورک قائم کیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ عراق کا ہر آدمی پڑھا لکھا بن گیا، اس حیران کن تعلیمی انقلاب پر اقوام متحدہ کے ادارے یونیسکو نے صدام حسین کو دنیا کا اعلیٰ ترین اعزاز "کروپیکا" دیا۔ صدام دنیا کا واحد حکمران ہے جس نے اپنی پوری قوم کو پڑھا لکھا بنا دیا۔

صدام حسین ستائیس کتب کے مصنف ہیں۔ ان کی ایک مشہور کتاب کا نام "حول کتاب التاریخ" ہے۔ صدام حسین کے بارے میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ وہ حضرت صدیق اکبرؓ اور حضرت فاروق اعظمؓ کو اپنا آئیڈیل قرار دیتے ہیں۔ صدام حسین نے اپنے دور اقتدار میں شیعہ اور سنی تنازعہ کو سختی سے دبائے رکھا۔ عراق میں محرم کے جلوس نکالنے کی اجازت نہ تھی۔ صدام حسین نے اپنے دور اقتدار کے آخری دو سال میں اہل تشیع کے بارے میں اپنی پالیسی بتدریج تبدیل کرنا شروع کی اور محرم میں مجالس اور جلوس کی اجازت بھی دی۔ اقوام متحدہ کی پابندیوں اور امریکہ کی طرف سے گھیرا تنگ ہونے کے بعد اندرون ملک شیعہ کمیونٹی سے بہتر تعلقات استوار کرنے کیلئے صدام حسین نے یہ پالیسی اپنائی کہ امن و امان کے قیام

میں ان کا تعاون حاصل رہے۔

صدر صدام نے اسم المشروع النبیاء المساجد کے نام سے ایک پروگرام شروع کیا جس کے مطابق اللہ کے ننانوے ناموں پر ننانوے مساجد بنانے کا اعلان کیا گیا۔ بغداد کی ایک مسجد میں ایک بہت بڑے قرآن پاک کے صفحات کو شیشے میں محفوظ کیا گیا ہے۔ یہ قرآن پاک صدام نے اپنے خون سے تحریر کرایا ہے۔ صدر صدام حسین نے تین برسوں میں چوبیس لیٹر خون دیا جس سے یہ قرآن تحریر کیا گیا اس خون میں سرخ اور براؤن رنگ کی خاص سیاہی شامل کی گئی۔ صدام حسین نے 1991ء میں خلیجی جنگ کے موقع پر امریکی صدر سینئر بش کو جو خط لکھا وہ بھی تاریخی اہمیت کا حامل ہے۔

''آپ ایک سپر ریاست کے صدر ہیں آپ اور آپ کے پست قد ایجنٹ مجھے (صدام حسین) کو ایک دروغ گو قرار دیتے ہیں لیکن آپ اس الزام کو ثابت کرنے میں ناکام رہے ہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ آپ کا سب سے بڑا خواب یہی ہے کہ آپ صدام حسین کو جھوٹا دیکھنا چاہتے ہیں لیکن صدام کے نزدیک جو جھوٹ بولتا ہے وہ قوت ارادی اور ایمان کی دولت کھو دیتا ہے۔''

ریاستہائے متحدہ امریکہ کے صدر آپ نے بھی جھوٹ کی راہ اپنالی ہے اور آپ بھی اس دروغ گو جتھے کے ساتھی بن گئے ہیں جو اپنے آپ کو عرب قوم کا نمائندہ سمجھتے ہیں۔ عرب عوام کے خدمت گزار وہ عرب حکمران نہیں ہیں جو آپ کے تابعدار ہیں اور قوم کی دولت چرانے میں آپ کے شریک کار ہیں۔ عرب وہ ہیں جو غریب اور ایماندار ہیں اور حقیقی معنوں میں محب وطن ہیں۔ آپ عرب قوم کو ڈرا دھمکا نہیں سکتے کیوں کہ یہ وہ عظیم قوم ہے جو نبیوں، پیغمبروں اور مقدس آسمانی کتب کے نزول کے لیے منتخب کی گئی۔

1991ء کی خلیجی جنگ کے موقع پر صدام حسین نے قوم سے خطاب کرتے ہوئے اقوام متحدہ پر بھی کڑی تنقید کی، یہ سلامتی کونسل کیا ہے؟ کیا امریکہ سوویت یونین، فرانس، چین اور انگلینڈ یہی پانچ ممالک اس کے ارکان ہیں۔ انہیں کیا حق پہنچتا ہے، عربوں کے معاملات میں مداخلت کریں۔ وہ کون ہوتے ہیں کہ جو آ کر ہمارے معاملات کو حل کریں، انہیں کیا حق ہے کہ وہ آئیں اور ہمارے مسائل میں ٹانگ اڑائیں۔ نہ انہیں ہماری ثقافت کا علم نہ انہیں ہمارے اقتصاد معلوم ہیں۔ وہ خود جو چاہیں کرتے پھریں اور ہمارے لیے عالمی قوانین کا ڈنڈا لے کر آجائیں ہم بھی انسان ہیں۔ اگر وہ خود بین الاقوامی اصولوں کا احترام نہیں کریں گے تو وہ ہم سے بین الاقوامی قوانین کا احترام کیسے کروا سکتے ہیں؟ انہیں خود بھی ان کا احترام کرنا ہوگا۔ ہم نے کتنی دفعہ سلامتی کونسل میں مسئلہ فلسطین پیش کیا ہے۔ مگر کسی نے کوئی توجہ نہیں دی۔ سلامتی کونسل اپنا وقار کھو چکی ہے۔ نہ یہ عالمی ہے اور نہ امن کی کونسل بلکہ یہ بش کا تابعدار ادارہ ہے میں اس کا احترام نہیں کر سکتا۔ یہ جھوٹے مکار اور دغاباز ہیں، ہم ان پر اعتماد نہیں کر سکتے۔

عراق نے امریکہ کی اس سازش کو بے نقاب کیا تھا کہ وہ تیل پر قبضہ کر کے پوری دنیا پر قابض ہونا چاہتا ہے۔ ہماری خواہش ہے کہ وہ تیل پر قبضے کی بجائے خرید و فروخت کرے۔ وہ ہم سے خریدے ہم انہیں فروخت کریں جو ایک عالمی اصول ہے لیکن یہ کہ وہ آئے اور تیل پر قبضہ کرے اور عربوں اور مسلمانوں کو اپنا محکوم بنالے ہم اسے یہ نہیں کرنے دیں گے۔

ہم جنگ نہیں چاہتے، ہم نے اپنے ہاتھوں سے بغداد تعمیر کیا ہے۔ جب ہم نے زمام اقتدار سنبھالی تو پورے بغداد میں صرف دو محل اور ایک ہوٹل تھا۔ ہم نے بغداد کو تعمیر کیا اسے آباد کیا۔ ہم جنگ کر کے یہ سب کچھ برباد نہیں کرنا چاہتے۔ ہم نے اس کیلئے راتوں کی نیند قربان کی ہے ہم نے

اس کیلئے بڑی مشقتیں اٹھائی ہیں، اپنے ہاتھ سے بنائے ہوئے بغداد کو ہم برباد نہیں کرنا چاہتے، ہم امن چاہتے ہیں جنگ نہیں۔ صدام کی شخصیت کے بہت سے پہلو ابھی تک محققین اور تاریخ دانوں سے چھپے ہوئے ہیں۔ صدام کی شخصیت اور اس کے کردار کے بارے میں حتمی رائے کا اظہار آنے والے دنوں میں کیا جاسکے گا۔

صدام کی زندگی، اس کی طرز فکر اور حکمرانی کے اصولوں کا مطالعہ تاریخ کے طالب علم کے لئے خصوصی دلچسپی کا حامل ہے۔ اس نے زندگی کس ڈھب پر گزاری، اس کی شخصیت کے نمایاں پہلو کیا تھے اس بارے میں چھپنے والے مواد کا مطالعہ کرنے اور لوگوں کے انٹرویوز سے صدام کی شخصیت کے کئی حیران کن پہلو اجاگر ہوتے ہیں۔ صدام حسین 28 اپریل 1937ء کو عراق کے ایک قصبے تکریت میں پیدا ہوئے۔ صدام کی پیدائش سے پہلے ہی اس کے والد فوت ہوگئے تھے۔ ان کا نام ان کے چچا حسن الماجد نے "صدام" رکھا۔ صدام کے معنی ہیں سامنے آنے والا اور ڈٹ کر مقابلہ کرنے والا۔ صدام کی پیدائش جس قصبہ میں ہوئی اسی قصبے میں 1138ء میں ایک عظیم مسلمان فاتح سلطان صلاح الدین ایوبی بھی پیدا ہوئے تھے۔ صدام کی تعلیم و تربیت ان کے ماموں نے کی۔ صدام کا قد 6 فٹ 2 انچ تھا، صدام کو مطالعے کا شوق شروع سے تھا۔ وہ اپنے جیب خرچ سے کتابیں خریدتا اور اپنی چچازاد، ساجدہ کے ساتھ بحث کرتا (بعد میں یہی ساجدہ صدام کی پہلی بیوی بنی)، صدام کو شکار کا بہت شوق تھا خاص طور پر تیتر اور بٹیر کا شکار ان کا معمول تھا۔ صدام عرب تاریخ اور عسکری کتب کا مطالعہ بھی بہت ذوق شوق سے کرتا، صدام دوسرے نوجوانوں کے برعکس شراب اور شباب میں دلچسپی نہ لیتا تھا۔ صدام نے 18 سال کی عمر میں بعث پارٹی میں شمولیت اختیار کی۔ اس زمانے میں عبدالکریم قاسم عراق کے صدر تھے اور وہ کمیونسٹ نظریے کے حامی تھے۔ ان کا ایک عزیز دوست سعدون ناصری تکریت میں قتل ہوگیا۔ اس قتل کا ذمے دار صدام کو ٹھہرایا گیا اور گرفتاری عمل میں آئی۔ صدام کی یہ پہلی گرفتاری تھی۔ صدام پر خصوصی عدالت میں مقدمہ چلایا گیا لیکن ثبوت نہ ہونے کی وجہ سے 6 ماہ بعد رہا کر دیا گیا۔ اس واقعہ کے کچھ عرصہ بعد صدام کو بعث پارٹی کی ہائی کمان نے بغداد بلالیا۔ وہاں اسے ایک اہم مشن سونپنے کا فیصلہ کیا گیا۔ یہ مشن عراق کے صدر عبدالکریم قاسم کو قتل کرنا تھا۔ صدام نے عسکری تربیت حاصل کی۔ جس میں خاص طور پر ریوالور اور مشین گن سے ٹھیک نشانہ لگانے کی خصوصی مہارت شامل تھی۔ صدام نے اپنے پانچ ساتھیوں کے ہمراہ عراق کے صدر عبدالکریم قاسم پر حملہ کرنے کا پروگرام بنایا۔ وہ کئی دن تک صدارتی محل کے اردگرد گھومتا رہا اور صدر عبدالکریم قاسم کے گزرنے والے راستوں کا جائزہ لے کر پلان بناتا رہا کہ کیسے حملہ کیا جائے اور کن کن راستوں سے فرار اختیار کی جائے۔ 7 اکتوبر 1959ء کی سہ پہر کو صدام نے اپنی مشین گن کا رخ صدر کی کار کی طرف کیا اور فائر کھول دیا۔ دو گولیاں صدر کو لگیں۔ صدر کا شوفر قتل ہو چکا تھا۔ باڈی گارڈ بھی فائر کھول چکے تھے، صدام کا ایک ساتھی قتل ہوگیا، ایک گولی صدام کی ٹانگ پر لگی جس سے وہ زخمی ہوگیا لیکن وہ موقع واردات سے فرار ہونے میں کامیاب ہوگیا۔ صدر کو فوراً ہسپتال لے جایا گیا اور ان کی جان بچ گئی۔ صدام گرفتاری کے خوف سے کسی ہسپتال میں نہیں جاسکتا تھا۔ بعث پارٹی کے ایک ساتھی نے ریزر بلیڈ سے صدام کے زخم کے اردگرد کے گوشت کے لوتھڑے کاٹ کر قینچی سے گولی نکال دی اور پٹی کردی۔ حکومت نے ملک کی سرحدیں سیل کردی تھیں۔ بغداد شہر میں جہاں شک گزرتا چھاپے مارے جاتے۔ اس صورت حال کو دیکھتے ہوئے صدام نے بھیس بدلا اور بغداد سے نکلنے میں کامیاب ہوگیا۔ دریائے دجلہ کے کنارے چلتے چلتے صدام تکریت پہنچا۔ راستے میں ایک جگہ

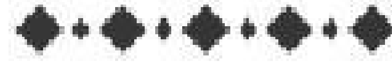
صدام کا ٹکراؤ ایک پولیس آفیسر سے ہوا۔ صدام نے گھبرانے کی بجائے پولیس آفیسر کو انتہائی اعتماد سے تمام سوالوں کے جواب دیے، جب پولیس آفیسر نے صدام سے شناختی کارڈ مانگا تو صدام نے کہا! ہم بدو ہیں، ہمارے پاس شناختی کارڈ کہاں؟ اس پر پولیس آفیسر مطمئن ہوگیا اور صدام اپنی منزل کی جانب چل پڑا۔ راستے میں ایک جگہ صدام کو دریا عبور کرنا تھا۔ سردیوں کے دن تھے اور کشتیوں کی آمد و رفت شام ہوتے ہی بند ہو چکی تھی۔ صدام نے دریائے دجلہ کا سامنا کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ صدام نے کپڑے اتار کر ایک گانٹھ کی شکل میں اپنے سر پر باندھ لیے اور خنجر دانتوں میں دبا کر دریائے دجلہ میں چھلانگ لگا دی۔ صدام زخمی ہونے کے باوجود تیر کر دریا پار کر گیا اور آخر کار اپنے گاؤں پہنچا۔ صدام نے تمام تفصیلات اپنی ماں اور سوتیلے باپ کو (جو رشتے میں اس کا چچا تھا) بتا دیں۔ سب نے یہی بہتر جانا کہ اب صدام عراق میں رہنے کے بجائے کسی دوسرے ملک میں پناہ لے۔ صدام نے شام میں پناہ لینے کا فیصلہ کیا اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ بعث پارٹی کا ہیڈ کوارٹر شام میں تھا۔ اور اسے شام آنے کی دعوت بھی مل چکی تھی۔ صدام نے بعث پارٹی سے تعلق رکھنے والے چند قریبی رفقاء کو ہمراہ لیا اور سفر شام شروع کیا۔ راستہ انتہائی دشوار گزار تھا اور راستے میں بہت سی مشکلات کا سامنا بھی کرنا پڑا، آخر کار شام کی سرحدی چوکی ''بوکمال'' پہنچے، اس چوکی پر ایک دن قیام کرنے کے بعد صدام اپنے ساتھیوں کے ہمراہ دمشق روانہ ہوگیا۔

دمشق میں بعث پارٹی کے بانی مائیکل افلق نے صدام اور اس کے ساتھیوں کو خوش آمدید کہا۔ مائیکل افلق نے صدام کو اپنی پارٹی میں خاص مقام دیا۔ پارٹی کے فیصلے کے مطابق صدام کی ادھوری تعلیم مکمل کرنے کے لئے اسے مصر بھیج دیا گیا جہاں صدام نے قانون کی تعلیم حاصل کی۔ قاہرہ میں صدام کی مصر کے صدر جمال عبدالناصر سے ملاقات ہوئی، جمال عبدالناصر بھی عبدالکریم قاسم کی حکومت کے خلاف تھا، یہاں ہی امریکی سی آئی اے نے صدام سے روابط استوار کیے۔ صدام نے قاہرہ یونیورسٹی سے قانون کی تعلیم مکمل کی۔ قاہرہ میں قیام کے دوران صدام حسین باقاعدگی سے امریکی سفارت خانے جاتا اور امریکی سی آئی اے سے عراق کی صورت حال کے بارے میں رہنمائی حاصل کرتا رہا۔ عراق میں بعث پارٹی کے کامیاب انقلاب کے بعد صدام بغداد واپس آگیا۔

صدام کے دو بیٹے اور تین بیٹیاں ہیں۔ بڑے بیٹے کو اودے حسین یا عدی کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ عدی کو ''اودے حسین'' بھی لکھا جاتا ہے۔ صدام نے اپنے بڑے بیٹے کا نام حضرت عدی بن حاتم کے نام پر رکھا جن کے والد کی سخاوت دنیا میں ضرب المثل ہے۔ اودے حسین 1964ء میں پیدا ہوا۔ صدام کے دوسرے بیٹے کا نام ''قصے حسین'' تھا۔ یہ بیٹا 1966ء میں پیدا ہوا (یہ دونوں جنگ ختم ہونے کے چند مہینے بعد امریکی فوجوں کے خلاف مزاحمت کرتے ہوئے جاں بحق ہوگئے) صدام کی تین بیٹیاں، راغدہ 1967ء میں، رعنا 1969ء میں اور ہالہ 1972ء میں پیدا ہوئیں۔ صدام نے دو شادیاں کیں۔ پہلی بیوی کا نام ساجدہ ہے۔ صدام کی سیاسی زندگی میں ساجدہ کا کردار انتہائی اہم رہا۔ صدام کے پانچوں بچے ساجدہ ہی کی اولاد ہیں۔ صدام کی دوسری بیوی کا نام سمیرا ہے، اسے سعیدہ بھی کہا جاتا ہے۔ سمیرا سے صدام کی شادی ایک ایسا حادثاتی واقعہ ہے جو صدام کی شخصیت کے ایک حیران کن پہلو کو اجاگر کرتا ہے۔ اس شادی کا واقعہ مجھے ایک سفارت کار نے اس طرح سنایا.......... بغداد شہر میں دریائے دجلہ کے وسط میں پگس Pigs کے نام سے ایک جزیرہ ہے۔ اہل بغداد کے لیے یہ جزیرہ ایک بہت بڑی سیر گاہ ہے۔ مصر کے صدر حسنی

مبارک کی اہلیہ جب بغداد کے دورے پر آئیں تو ان کے اعزاز میں صدام حسین کی بیوی ساجدہ نے اسی جزیرے پر ایک پر تکلف دعوت کا اہتمام کیا۔ اس دعوت میں صدام کے قریبی دوست ''جی او جو'' اور اس کی بیوی سمیرا بھی مدعو تھیں۔ تقریب کے دوران صدام کا بڑا بیٹا اودے حسین بھی موجود تھا۔ کسی بات پر ناراض ہو کر عدی نے ''جی او جو'' کو مارنا شروع کیا۔ اودے حسین کے باڈی گارڈز نے بھی ''جی او جو'' کو مارا۔ ''جی او جو'' شدید زخمی ہوا اور اسے ہسپتال پہنچایا گیا۔ ہسپتال جا کر وہ فوت ہو گیا۔ صدام کو جب پتا چلا تو اس نے اپنے بیٹے اودے حسین کو اتنا مارا کہ اسے بھی ہسپتال لے جانا پڑا۔ صدام کچھ دیر بعد ہسپتال پہنچا تو ڈاکٹروں نے سمجھا وہ عیادت کرنے آئے ہیں مگر صدام نے ڈاکٹروں کو جو عدی کا علاج کر رہے تھے، دھکا دیا اور ہسپتال میں بھی عدی کو مارنا شروع کر دیا اور کہا جس طرح تو نے میرے دوست کا خون بہایا ہے اس طرح میں بھی تیرا خون بہانا چاہتا ہوں۔ علاج کے بعد عدی تو بچ گیا مگر صدام کا غصہ ٹھنڈا نہ ہوا۔ صدام کے حکم پر قتل کا مقدمہ چلانے کے لیے عدالت قائم کر دی گئی۔ اودے حسین کی والدہ ساجدہ نے بیٹے کا ساتھ دیا اور عدالتی کارروائی پر اثر انداز ہو کر بیٹے کو بچا لیا۔ جب صدام کو حقائق کا علم ہوا تو اس کی پاداش میں صدام حسین نے اپنی بیوی ساجدہ کو تمام اعزازات سے محروم کر دیا۔ صدام نے ''جی او جو'' کی بیوہ سمیرا سے شادی کر لی اور ساجدہ کو خاتون اول کے اعزاز سے محروم کر کے سمیرا کو خاتون اول بنا دیا۔

بشکریہ (سرور منیر راؤ)



ایک کسان کا بیٹا حکمران کیسے بنا

دریائے دجلہ کے کنارے واقع تکریت کے علاقے میں ایک غریب کسان گھرانے میں 1937ء میں سیدہ حجہ طلفاح نے ایک بچے کو جنم دیا۔ مگر اسے بچے کے پیدا ہونے کی خوشی سے زیادہ فکر اس بات کی تھی کہ وہ اس کی پرورش کس طرح کرے گی، کیوں کہ بچے کا باپ حسن عبدالماجد اس دنیا سے چند ماہ قبل جدا ہو چکا تھا۔ سیدہ حجہ طلفاح اپنے کچے مکان میں اسی فکر میں غلطاں تھی کہ بچے کے ماموں الحاج خیر اللہ اور چچا حسن مجید نے اُسے دلاسہ دیا" مانا کہ ہم غریب ہیں اور ہماری گزر بسر آسانی سے نہیں ہوتی، مگر تم فکر نہ کرو، ہم جس طرح بھی ہو سکا اس کی پرورش کریں گے۔

حجہ طلفاح جو پہلے ہی اپنے بھائی اور دیور کے احسانوں کا بوجھ اپنے کاندھوں پر اٹھائے ہوئے تھی، اچھی طرح جانتی تھی کہ وہ دونوں پہلے ہی غربت اور افلاس کے باوجود اس کی دیکھ بھال کر رہے ہیں۔ اب انہیں مزید ایک اور جان کا بوجھ اٹھانا پڑے گا۔ مگر یہ دیکھ کر اسے اطمینان ہوا کہ دونوں کے چہروں پر تردد نہ تھا بلکہ وہ بچے کی پیدائش پر خوش تھے۔

بچے کے چچا نے اس کا نام صدام حسین رکھا، صدام کا مطلب زوال دُور کرنے والا ہے۔ صدام کے والد کا سلسلۂ نسب حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے ملتا تھا۔ تکریت جسے اِن دنوں خاصی شہرت حاصل ہے، اُن دنوں شہری سہولتوں سے محروم ایک ایسا علاقہ تھا، جس کے مکین دو وقت کی روٹی کے لیے ہر وقت فکر مند رہتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ صدام حسین کا بچپن تکلیف دہ تھا۔ خوشیاں اسے بہت کم دیکھنے کو ملتی تھیں اور یہ عمر جس میں کسی قسم کی فکر لاحق نہیں ہوتی، بالعموم فکر و تردّد میں گزرتی تھی۔

کچھ ہی عرصے بعد اس کی ماں نے اپنے دیور کے ساتھ شادی کر لی۔ جس کے نتیجے میں صدام کو ایک بھائی اور مل گیا جس کا نام ادھام رکھا گیا۔ دونوں بھائی نہ صرف ایک دوسرے کے گہرے دوست، بلکہ رازدار بھی تھے۔ غربت اور افلاس نے صدام حسین کی زندگی پر گہرے اثرات مرتب کیے تھے۔ دیگر بچوں کے مقابلے میں اس کا رعب اور دبدبہ زیادہ تھا اور کسی حد تک دلیر اور بے خوف بھی۔

تکریت میں غریب گھرانوں کے بچوں کو تعلیم کے لیے درس گاہوں میں بھیجنے کا رواج نہیں تھا، اس کی بڑی وجہ غربت اور دوسری وجہ علاقے میں تعلیمی اداروں کی قلت تھی۔ صدام کے چچا اسے کھیتی باڑی پر لگانا چاہتے تھے۔ مگر ایک دن جب صدام حسین کو اپنے ہاں آنے والے ایک مہمان بچے کی زبانی یہ پتا چلا کہ وہ طالب علم ہے اور لکھنا پڑھنا جانتا ہے، تو وہ بہت حیران ہوا اور اس نے دل ہی دل میں یہ فیصلہ کر لیا کہ وہ بھی لکھنا پڑھنا

سیکھے گا۔اس نے اپنی خواہش کا اظہار والدہ سے کیا تو انہوں نے غربت کے پیش نظر اسے باز رکھنے کی کوشش کی، مگر صدام نے شاید تعلیم حاصل کرنے کا حتمی فیصلہ کرلیا تھا، اور پھر ایک رات وہ خاموشی کے ساتھ کپڑوں کے چند جوڑے لے کر اپنی ماں کو بستر پر سوتا چھوڑ کر اپنے ماموں کے گھر چلا آیا، جو تھوڑے فاصلے رہتے تھے، اُن سے اپنی خواہش کا اظہار کیا۔ ماموں نے اس کی لگن دیکھ کر ایک سکول میں داخل کرا دیا۔ اس طرح صدام حسین آج وہ صدام حسین بن گیا جو آج ہمارے درمیان نہیں رہا اور اسے پھانسی دے دی گئی ہے۔

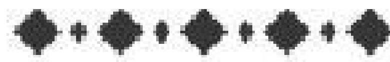
شاید اگر صدام حسین تعلیم حاصل نہ کرتا اور کھیتی باڑی ہی کر رہا ہوتا تو اسے آج پھانسی نہ لگتی اور وہ شہرت کی بلندیوں کی بجائے گم نامی کے اندھیرے میں ہوتا، مگر زندگی جی رہا ہوتا اور اپنے پوتے پوتیوں کے ساتھ ہرے بھرے کھیتوں کے درمیان مٹی کے کسی مکان میں ہوتا، جس سے اٹھنے والی سوندھی سوندھی خوشبو مسحور کر دیتی ہے۔ مگر تقدیر کا لکھا، کون مٹا سکتا ہے۔ وہ صدام حسین جو کچھ عرصے قبل تک رعب، دبدبے، شان وشوکت کی علامت سمجھا جاتا تھا کس بے بسی کے عالم میں پھانسی کے پھندے پر جھول گیا۔

آخر ایک کسان کا بیٹا سیاست کی راہ پر کیوں چل پڑا اور اس نے سیاست بھی ایسی کی کہ نہ صرف وقت کو اپنا مطیع بنا لیا بلکہ عراق کے عوام پر کئی دہائیوں تک اس طرح حکومت کی کہ اپنے خلاف کوئی بات سننا بھی ناقابل معافی جرم قرار دیا۔ صدام کا یہ مزاج غالباً ان واقعات کا ردعمل بھی تھا، جن کے مطابق اس کے آباؤ اجداد کے متعدد افراد کو ترکوں نے قتل کر دیا تھا اور ان کے گھروں کو نذر آتش کر دیا تھا۔ ان کارروائیوں سے تنگ آ کر صدام کے اجداد اپنے گھر بار چھوڑ کر قریبی پہاڑوں میں پناہ لینے پر مجبور ہو گئے تھے۔ صدام حسین کو یہ واقعات اپنے بزرگوں کی زبانی معلوم ہوا کرتے تھے، تو وہ بدلے کی آگ میں جلتا رہتا تھا۔ تعلیم حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ وہ نہ صرف اپنے حالات کا جائزہ لیتا رہتا تھا بلکہ بین الاقوامی سطح پر تبدیل ہونے والے حالات پر بھی گہری نظر رکھتا تھا۔

اُن دنوں دنیا بھر میں برطانوی اور فرانسیسی نوآبادیاں ایک کے بعد ایک کر کے سامراجی تسلط سے آزادی ہو رہی تھیں۔ بالخصوص عرب خطے میں بھی زندگی حقیقی معنوں میں آزادطور پر گزارنے کا جذبہ ابھر رہا تھا۔ تعلیم جاری رکھنے کی خاطر صدام حسین بغداد آ گئے اور کرخ کے ہائی اسکول میں داخلہ لیا۔ ان دنوں بین الاقوامی سطح پر سیاسی حالات بدل رہے تھے۔ برطانوی اور فرانسیسی استعمار کی زنجیریں یکے بعد دیگرے ٹوٹ رہی تھیں۔ عرب ممالک میں بھی آزادی کی تحریکیں انگڑائی لے رہی تھیں اور یہ ماحول ہر ذی شعور کو متاثر کر رہا تھا۔ صدام نے تعلیم کے حصول کے ساتھ ساتھ ان حالات وواقعات کا نہ صرف مشاہدہ شروع کیا بلکہ اس کا اثر بھی لینا شروع کر دیا۔ ان دنوں عراق میں سوشلسٹ اور بعث پارٹی بہت مقبول تھیں۔ صدام حسین نے بعث پارٹی میں شمولیت اختیار کی، اُس وقت سوشلسٹ پارٹی کی حکومت تھی اور عبدالکریم قاسم حکمران تھے۔ صدام حسین نے تھوڑے ہی عرصے میں سیاسی میدان میں مقبولیت حاصل کر لی۔ اس دوران عبدالکریم قاسم کے قریبی دوست سعدون ناصری کا تکریت میں قتل ہو گیا۔ حکمران پارٹی نے اس قتل کا ذمے دار صدام حسین کو قرار دے کر گرفتار کر لیا۔ صدام حسین چھ ماہ جیل میں رہے اور عدم ثبوت کی بنا پر رہا کر دیے گئے۔ اس گرفتاری نے انہیں مزید مقبول بنا دیا 1959ء میں ان کی پارٹی کی ہائی کمان نے بغداد طلب کیا اور انہیں عبدالکریم قاسم کو ہلاک کرنے کی ذمے داری سونپی۔ صدام اور ان کے ساتھیوں نے بہ ظاہر یہ مشن کامیابی سے پورا کیا اور فرار ہو گئے، البتہ ایک گولی اُن کی ٹانگ میں

گئی۔ بعد میں انہیں یہ پتا چلا کہ عبدالکریم قاسم قاتلانہ حملے میں بچ گیا۔ اُن دنوں صدام ہائی اسکول میں پڑھتے تھے۔ شدید زخمی ہونے کے باوجود انہوں نے اپنے زخم کی خود ہی مرہم پٹی کی اور اسی حالت میں اسکول بھی جاتے رہے۔ اس دوران ان کے ساتھیوں کو گرفتار کرلیا گیا۔ لہٰذا وہ بھیس بدل کر فرار ہوگئے اور سات دن صحرا میں سفر کرنے کے بعد شام پہنچ گئے۔ وہاں تین ماہ قیام کے بعد 1960ء میں مصر چلے گئے اور وہاں تین سال تک تعلیم حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ بعث پارٹی کے منصوبوں کے لیے کام کرتے رہے۔ اسی دوران ان کی منگنی اور بعدازاں شادی، ماموں زاد ساجدہ سے ہوگئے اور یہ اطلاع بھی ملی کہ عراق میں سوشلسٹ پارٹی کا تختہ الٹ دیا گیا ہے۔ عبدالکریم قاسم کے قتل کی سازش کے الزام میں انہیں سزائے موت بھی سنادی گئی تھی، مگر بعث پارٹی کے برسراقتدار آنے کے بعد اس پر عمل درآمد نہ ہوا اور صدام حسین عراق واپس آگئے۔ مگر یہاں آکر ان کو اپنی ہی پارٹی میں کچھ لوگوں کے خلاف مورچہ لگانا پڑا، کیوں کہ پارٹی میں اختلاف ہوگئے تھے۔ صدام حسین نے اپنے مخالف عبدالسلام عارف کے قتل کی سازش تیار کی، مگر یہ سازش پکڑی گئی جس کے بعد انہیں روپوش ہونا پڑا، مگر کچھ ہی دنوں بعد وہ گرفتار کرلیے گئے۔ ان پر دورانِ حراست سات روز تک تشدد کیا گیا۔ بعدازاں جیل بھیج دیا گیا۔ ان کی گرفتاری کے خلاف ملک بھر میں مظاہرے شروع ہوگئے، مگر حکومت ٹس سے مس نہ ہوئی، بلکہ ان کی بیوی اور شیر خوار بیٹے عدی کو کرائے کے مکان سے باہر نکلوا کر سڑک پر پھنکوادیا۔ مظاہروں کے نتیجے میں صدام کے دو ساتھیوں کے علاوہ سازش میں شریک دوسرے افراد کو رہا کردیا گیا، اور پھر ایک دن جب انہیں عدالت لے جایا جارہا تھا وہ ایک پلان کے تحت فرار ہونے میں کامیاب ہوگئے۔ جس کے بعد انہوں نے اپنی پارٹی کے ہم خیال لوگوں کو ساتھ ملا کر انقلاب کے لیے راستہ ہموار کرنا شروع کردیا اور پھر اپنے تدبّر اور فراست کی بناپر جولائی 1968ء میں برسراقتدار آگئے۔ جس کے بعد 24 برس تک انہوں نے بلاشرکت غیرے حکمرانی کی۔ اس دوران ان کے خلاف بھی سازشیں ہوتی رہیں۔ مگر انہوں نے ان سازشوں کو سختی سے کچل دیا۔ اور اپنے دو دامادوں کو بھی، سازش میں شریک ہونے پر موت کے گھاٹ اتروادیا۔

بشکریہ (غلام محی الدین)



صدام کا مقدمہ تاریخ کے حوالے

عیدالاضحیٰ کے روز صدام حسین کو پھانسی دے دی گئی یوں دنیا کا یہ متنازعہ راہنما اپنے انجام کو پہنچا اب اس کی حیثیت کے تعین کا معاملہ تاریخ کے سپرد ہو چکا ہے وقت طے کرے گا کہ یہ شخص آمر تھا یا مقبول راہنما، قاتل تھا یا محبّ وطن سپاہی، ظالم تھا یا مظلوم اور بزدل تھا یا بہادر، یہ فیصلہ تاریخ ہی پر چھوڑتے ہوئے پہلے واقعات کا تسلسل دیکھتے ہیں اور پھر اس بات کا جائزہ لیتے ہیں کہ امریکا نے ایسا کیوں کیا صدام حسین کو امریکی خفیہ اداروں نے اپنے مقاصد کی خاطر بھرتی کیا تھا اور پھر خاموشی سے اقتدار کی سیڑھیوں پر چڑھایا تھا اور آخر کار عراق کا حکمران بنا دیا تھا اس دوران اس پر برا وقت بھی آیا لیکن صدام کی مستقل مزاجی اور دلیری اس کے کام آئی قدرت بھی مہربان تھی امریکا کی حمایت حاصل تھی سو آخری نتیجے میں وہ کامیاب رہا۔ بعث پارٹی کی سربراہی اور عراق کی حکمرانی سنبھالنے کے بعد وہ عرب سیاست کا متحرک کردار بنا اپنے ابتدائی دور کے بعد اس نے عرب سیاست میں اس بلاک میں شمولیت اختیار کی جس کا جھکاؤ روس کی طرف تھا تب امریکی ذرائع ابلاغ ہمیں صدام حسین کی جو تصویر پیش کر رہے تھے اس سے لگتا تھا کہ ایک فوجی آمر طاقت کے استعمال سے عراق میں حکومت کر رہا ہے اور اپنے ہر مخالف کو قتل کروا دیتا ہے۔ جس کے خلاف آواز اٹھانے والے کیلئے عراق میں کم از کم کوئی جگہ نہیں پھر اسی صدام کو شہہ دے کر ایران پر حملہ کروایا گیا اس وقت عرب بلاک ایران کے شیعہ انقلاب سے خوف زدہ تھا اور عرب بلاک میں عراق ہی ایسا ملک تھا جس کے پاس ایران سے ٹکرانے کی فوجی قوت تھی امریکا بہادر اس سے اپنے پرانے مراسم کی تجدید کر چکا تھا لہٰذا اس کی مکمل پشت پناہی کی گئی اور وہ تمام تباہی پھیلانے والے ہتھیار جن کا بہانہ بنا کر بعد میں عراق پر حملہ اسے امریکا یا اس کے حواریوں نے فراہم کئے تھے اور اپنے ریکارڈ کی بنیاد پر ہی وہ یہ کہتے رہے کہ ایسے تمام ہتھیاروں کے تلف کرنے کا ثبوت نہیں مل رہا۔ کئی سالوں پر محیط عراق ایران جنگ جنگی نکتہ نظر سے تو نتیجہ خیز نہ رہی مگر امریکا نے اپنے اہداف حاصل کر لئے اس کے بعد یہ جانتے ہوئے کہ عراق کویت پر حملہ کرنے والا ہے امریکا نے چشم پوشی کی کیونکہ کویت پر حملہ بھی امریکی ایجنڈے کی تکمیل کرتا تھا۔ کویت پر عراق کے قبضے سے امریکا نے خلیج کی ریاستوں کو زیر نگیں بنا لیا امریکا کویت پر عراقی قبضے کو ختم کرنے کے بہانے یہاں داخل ہوا اور پھر مستقلاً یہاں اڈے بنا لئے۔ سعودی عرب یمن وغیرہ میں بھی اس نے عراق کے خطرے کا استعمال کیا اور وہاں اپنی مضبوط موجودگی کے اسباب پیدا کر لئے یوں صدام حسین نے امریکی ایجنڈا تکمیل تک پہنچایا۔ کویتی قبضے کو ختم کروانے کے بعد امریکی افواج عراق میں داخل ہوئیں۔ لیکن اس وقت عراق کے پاس مہلک ہتھیار تھے اور وہ اندرون خانہ

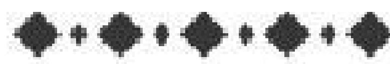
اتحادی تھا لہٰذا جلد ہی امریکی افواج کا انخلا عمل میں آ گیا اور صدام کی حکمرانی بچ گئی۔

اب عراق سے مطالبہ ہوا کہ وہ فوجی ساز و سامان تلف کرے جو اسے ایران کے خلاف جنگ کیلئے فراہم کیا گیا تھا یہیں سے صدام کے ساتھ اختلافات کا آغاز ہوا کیونکہ ان ہتھیاروں سے لیس عراق اسرائیل کے لئے خطرہ تھا جو امریکا اور اسرائیل دونوں کو کسی صورت قبول نہ تھا۔ یہاں سے عراق امریکا مد مقابل آ ئے۔ عراق پر اقتصادی اور فوجی پابندیاں لگیں لیکن صدام حسین جسے یقیناً امریکا کی بے وفائی چرکے لگاتی ہوگی جھکنے سے انکاری رہا اور پردیئے گئے جنگی معاملے صدر بش کے والد کے دور حکومت میں ہوئے تھے لہٰذا بش جونیئر نے اقتدار سنبھالتے ہی والد کے ادھورے مشن کو مکمل کرنے کی ٹھان لی پہلے عراق پر حملے کی منصوبہ بندی کی گئی اور پھر بہانے تلاش کئے جانے لگے یہاں بھی صدام کی ہٹ دھرمی کام آئی اور باوجود اس حقیقت کے کہ عراق مہلک ہتھیار تلف کر چکا تھا صدام حسین اقوام متحدہ کے انسپکٹروں سے معائنہ کروانے سے گریز کرتا رہا۔ امریکا نے عراق پر حملے کے جواز کیلئے اقوام متحدہ کو استعمال کرنے کی کوشش کی مگر روس، چین اور فرانس کی مخالفت آڑے آئی لہٰذا اس نے برطانیہ اور آسٹریلیا کی حمایت سے عراق پر حملہ کر دیا۔ امریکا کی فوجی قوت کے سامنے عراق کی حیثیت چیونٹی سے زیادہ نہ تھی لیکن اس سے صدام کے بارے میں اندازے کی بہت بڑی غلطی ہوگئی اس کا خیال تھا کہ صدام طاقت کے وحشیانہ استعمال کی بنیاد پر برسر اقتدار ہے اس لئے جب امریکی فوجیں عراق میں داخل ہوں گی ان کا نجات دہندہ کے طور پر استقبال ہوگا لیکن ہوا اس کے برعکس، فلوجہ کی مذمت نے ہی ان پر حقیقت ظاہر کر دی تھی مگر تب تک امریکا بہادر اتنا اندر گھس چکا تھا اور اس کے پاس وہاں رک کر حکمت عملی کو نئے سرے سے مرتب کرنا ممکن نہ تھا خیر عراق فتح کر لیا گیا۔ صدام اور اس کے خصوصی محافظ حکومتی اہلکاریوں غائب ہوئے جیسے ان کا کوئی وجود ہی نہ تھا اور پھر انہوں نے وہ کر دکھایا جس کی امریکا کو توقع نہ تھی صدام کی بعث پارٹی نے امریکا کے خلاف شہری گوریلا جنگ کا آغاز کر دیا۔ اور اس میں اسے اردگرد کی اسلامی تحریکوں کی حمایت بھی حاصل ہوگئی یوں صدام حسین عراق کی آزادی کے محافظ کے روپ میں ابھرنے لگا۔ صدام کے اس ابھرتے امیج کو اس کی گرفتاری نے نقصان پہنچایا۔ اکثریت کی خواہش تھی کہ وہ مزاحمت کرتے ہوئے مارا جاتا گرفتار نہ ہوتا اس دوران امریکا بہت سی حیرتوں کا سامنا کرنے کے بعد نئی حکمت عملی بنا چکا تھا لہٰذا صدام کو گرفتاری کے وقت اس کے بیٹوں کی طرح نہیں مارا گیا تھا بلکہ عدالتی عمل سے گزارا گیا صدام کے اختتام سے امریکی ایجنڈا متاثر ہوتا۔ لہٰذا اسی دوران عراق میں عربوں کیلئے ایک نئے خطرے کی بنیاد رکھی گئی یہ عراق کی شیعہ حکومت تھی جس کے ایران سے تعلقات تھے سنی مسلک سے وابستہ مشرق وسطیٰ کو امریکا نے اس خوف میں مبتلا کر دیا کہ شیعہ حکومت کی عراق میں مضبوطی ان کے اپنے وجود کو خطرے سے دوچار کر دے گی اس دوران سنی مزاحمت کو زندہ رکھنے اور فروغ دینے کیلئے عدالتی عمل سے صدام کو ہیرو بنایا جانے لگا صدام اپنی شخصی خصوصیات کی وجہ سے ہٹ دھرم تو تھے ہی لہٰذا ان کا مزاحمتی ہیرو کا تصور تقویت پکڑنے لگا اور پھر اس عمل کی آخری مثالی ضرب صدام کی عید الاضحیٰ کے روز پھانسی تھی اصل میں صدام کی صورت میں اصل قربانی تو جارج ڈبلیو بش نے دی جس شخص کو بہت محنت سے پروان چڑھایا تھا اسے قربان کر دیا آج عراقی حکومت کو ہر طرف سے لعن طعن کا سامنا ہے۔

ایران کی طرف سے صدام کی پھانسی پر خوشی کا اظہار، شیعہ گارڈوں کی طرف سے نعرہ زنی اور عید کے روز پھانسی کی سزا نے صدام کو سنی مسلمانوں کا ہیرو بنا دیا ہے اور عراق کی آزادی کی جنگ شیعہ سنی لڑائی میں بدلنے لگی ہے امریکا جانتا ہے کہ یہی تفریق پوری اسلامی دنیا کو فرقے کی بنیاد پر تقسیم کر

سکتی ہے اور اسے امریکا کا دست نگر بنا سکتی ہے بد قسمتی یہ ہے کہ اسلامی ممالک کے حکمرانوں کی اکثریت عوام کی نمائندہ نہیں اور ان میں اقتدار سے چمٹے رہنے کی خواہش انہیں امریکا کا خادم بناتی ہے۔ یہ امریکی وائسرائے جو مقامی طور پر حکمران سمجھے جاتے ہیں امریکا بہادر کے ملازم ہیں اور اس کے ایجنڈے کو ہی پورا کرنے میں مصروف ہیں جتنا یہ امریکی احکامات کی بجا آوری میں آگے بڑھتے ہیں اتنے ہی اپنے عوام سے دور ہوتے جاتے ہیں اس وقت صورت حال یہ ہے کہ اگر عالم اسلام میں آزادانہ اور غیر جانبدارانہ انتخابات کروائے جائیں تو تقریباً تمام ممالک میں امریکا مخالف عناصر برسر اقتدار آجائیں یہی وہ نکتہ ہے جس کی وجہ سے کبھی کبھی کسی حکمران کے دماغ میں فتور آجاتا ہے اور وہ سمجھتا ہے کہ وہ امریکا کے لئے ناگزیر ہے لیکن ایسا ہوتا نہیں مالک کے لئے ملازموں کی کمی نہیں ہوتی ایک جائے تو دوسرا جگہ لینے کو موجود ہوتا ہے اس لئے احسان جتانے والے اور امریکی آشیر باد کو خدمات کے صلے میں اپنا حق سمجھنے والے حکمران کو فارغ کر دیا جاتا ہے جس پر وہ بے وفائی کا رونا روتا ہے میرے دوست قریشی حفیظ کہتے ہیں اس میں قصور امریکا کا نہیں ان ملازم مقامی حکمرانوں کا ہے۔ امریکا تو ان سے کام لینے کے بعد ان کو باعزت طور پر فارغ کرنا چاہتا ہے یا انہیں کوئی دوسرا کام سونپنا چاہتا ہے جبکہ یہ سمجھتے ہیں کہ امریکا نے انہیں جو نوکری دی تھی اس پر رہ کر انہوں نے اس کی جو خدمت کی ہے اس کی وجہ سے انہیں اس نوکری پر رہنے کا حق حاصل ہے بس یہاں سے خرابی جنم لیتی ہے اور پھر ضیاء الحق، صدام حسین، رضا شاہ پہلوی اور جنرل پنوشے جیسے انجام سے انہیں دوچار ہونا پڑتا ہے۔ یقین کریں میری اس تحریر کا مقصد یہ نہیں کہ موجودہ حکمران سبق لیں کیونکہ ایسا ممکن ہی نہیں خدمات کے بل بوتے پر منہ چڑھا نوکر باغی ہو ہی جاتا ہے بعض اوقات اس کے مطالبات مان بھی لئے جاتی ہیں ہاں صرف اسے یہ اندازہ ہونا چاہیے کہ مالک اس کے مطالبات کس حد تک مان سکتا ہے اور کہاں آکر اس کی لچک ختم ہو جائے گی اور اس کی برخواستگی کا باعث بنے گی اگر مالک اسے فارغ کرنے پر تل گیا ہو تو اسے خاموشی سے نوکری سے علیحدگی قبول کر لینی چاہیے ورنہ مالک تو مالک ہے اسے یہ بھی یقین رکھنا چاہیے کہ اپنے اختتام کو سامنے دیکھ کر اسے عوام یا اللہ یاد آجائے تو یہ بے وقت کی راگنی ہے جس کا اسے کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا۔

بشکریہ (طارق خورشید)



صدام کا مقدمہ: دنیا کو فریب دینے کی کوشش

صدام حکومت برخاست کردی گئی اور صدام کو گرفتار بھی کر لیا گیا مگر صدام کے حوصلے قطعی کم نہیں ہوئے ہیں اس کی تائید وہ سبھی کریں گے جنہوں نے 19 اکتوبر کو عراق کی عبوری حکومت کی قائم کردہ ٹریبونل کورٹ میں جج کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر صدام کو بات کرتے اور یہ کہتے سنا کہ "میں اس نمائشی عدالت کو جوابدہ نہیں ہوں اور تم کون ہوتے ہو مجھ سے سوالات کرنے والے؟ میں عراق کا آئینی صدر ہوں" صدام حسین ظالم و جابر خواہ کچھ بھی ہوں مگر جس انداز میں انہیں سزا دیئے جانے کی کوشش کی جارہی ہے اس کی وجہ سے ان کی شناخت ایک مظلوم کے طور پر کی جارہی ہے کیونکہ یہ عام طور پر محسوس کیا جارہا ہے کہ عراق کے معزول صدر کے گرد گھیرا اس لئے تنگ کیا جارہا کہ انہوں نے اپنے دور حکومت میں انسانیت پر مظالم کی انتہا کی ہے بلکہ اس لئے اپنے دور حکومت کے آخری ایام میں انہوں نے امریکی مفادات کو نظر انداز کرنے کی جرات کی یہی وجہ ہے کہ امریکا کی سرپرستی میں قائم عراق کی عبوری حکومت کی اس عدالت پر کسی کو یقین نہیں۔ صدام حسین کے خلاف مقدمہ شروع ہوگیا ہے دنیا بھر کے اخبار اس مقدمہ کو عراقی عوام اور عالمی نظام قانون کیلئے ایک اہم موڑ قرار دیا ہے اور یہ بات بڑی حد تک سچ بھی ہے پہلی بات تو یہ کہ کسی بھی ظالم اور جابر آمر مطلق کے خلاف خود اس کے لئے اپنے ملک میں مقدمہ چلایا جارہا ہے۔ یوگوسلاویہ کے میال سووچ کے خلاف بھی اس قسم کا مقدمہ چل رہا ہے مگر وہ مقدمہ بین الاقوامی ٹریبونل میں چل رہا ہے۔

دوسرے ایشیا یا افریقہ کے کسی بھی ملک میں یہ پہلا واقعہ ہے کہ کسی ڈکٹیٹر کو اس کے گھناؤنے جرائم پر عدالت کے کٹہرے میں کھڑا کیا گیا ہے گویا یہ مقدمہ دنیا کیلئے ایک مثال اور ایک نظیر بن رہا ہے تا کہ اگر کوئی اقتدار کا بھوکا شخص قانون اور آئین کو پامال کر کے پوری قوم کو اپنی مرضی اور منشا کا غلام بنانے کا خیال بھی دل میں لائے تو اسے اپنا انجام سامنے نظر آئے لیکن جس انداز سے صدام حسین کے خلاف مقدمہ چلایا جارہا ہے اس سے کسی طرح بھی یہ توقع پوری ہوتی نظر نہیں آتی۔ صدام حسین کے خلاف مقدمہ چلانے کا مطالبہ انسانی حقوق کی عالمی تنظیموں نے کیا تھا جن کا خیال ہے کہ صدام نے جو جرم کئے ہیں وہ صرف عراقی عوام کے خلاف نہیں بلکہ وہ پوری انسانیت کے خلاف جرم ہیں۔ لیکن اب وہی تنظیمیں شبہ ظاہر کررہی ہیں کہ بدھ کے دن جس خصوصی عدالت میں مقدمے کی سماعت شروع ہوئی ہے اس سے واقعی انصاف بھی مل سکے گا اول تو یہ مقدمہ جس قانون کے تحت چلایا جارہا ہے وہ عراق پر قبضے کے بعد امریکی انتظامیہ کا بنایا ہوا قانون ہے جس میں عبوری حکومت نے تھوڑی بہت ترمیم کرلی

ہے۔

دوسرے جو پانچ جج سماعت کر رہے ہیں وہ کھلم کھلا صدام حسین کے مخالف ہیں۔ عدالت کے سربراہ تو اپنے نام سے ہی کرد معلوم ہوتے ہیں اور سب جانتے ہیں کہ کرد صدام کے جانی دشمن ہیں پھر اس مقدمہ کی ساری تیاریاں قابض حکومت کے ماہرین قانون نے کی ہے جو امریکی برطانوی اور آسٹریلین ہیں ہیومن رائٹس واچ کا کہنا ہے کہ اس مقدمہ کی تفتیش کے سلسلے میں امریکا اب تک 12 کروڑ ڈالر خرچ کر چکا ہے اس کے علاوہ بعث پارٹی کے جس ہیڈ کوارٹر کو عدالت کے کمرے میں تبدیل کیا گیا ہے اس پر امریکا نے لاکھوں ڈالر خرچ کئے ہیں امریکا کی دلچسپی کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ صدام حسین کے خلاف جو الزام اس مقدمہ میں پیش کئے گئے ہیں ان میں کوئی بھی الزام ایسا نہیں ہے جس میں امریکا بھی کسی نہ کسی طرح ملوث ہو جائے۔

سب جانتے ہیں کہ ایران کے خلاف امریکی اشارہ اور امریکی امداد سے ہی صدام نے جنگ لڑی تھی یہ امریکا ہی تھا جو عراق کو ایران کے بارے میں خفیہ معلومات فراہم کر رہا تھا ایران کے وزیر انصاف جمال کریمی کو شکایت ہے کہ عراق کے قابض حکمران صدام حسین کے تمام گناہوں کے بجائے محض ایسے تنگ دائرہ میں بند کر کے سزا دینا چاہتے ہیں جس میں امریکا کی اپنی جان بچ جائے۔ لوگ تو کویت پر عراقی حملے کو بھی امریکی سازش ہی قرار دیتے ہیں لیکن یہ بات غلط بھی ہے تب بھی لوگوں کا یہ کہنا غلط نہیں کہ صدام اصل میں پروردہ امریکا کا ہی تھا اور ایران پر حملے کے بعد وہ اتنا شیر ہو گیا تھا کہ اس نے کسی کی بھی پرواہ نہیں کی شاید اس وقت بھی اسے امریکا پر بھروسہ تھا۔

پچھلے ہفتے جو مقدمہ شروع ہوا وہ اس سلسلے کی پہلی کڑی ہے ابھی دوسرے مقدمے بھی چلائے جائیں گے پہلا مقدمہ جس کی سماعت شروع ہو گئی ہے 1982ء کے اس واقعہ سے متعلق ہے جب صدام پر قاتلانہ حملے کے الزام میں 15 سو افراد کو گرفتار کر کے تنگ و تاریک کوٹھریوں میں ڈال دیا گیا تھا۔ ان میں سے 200 آدمی نہایت کسمپرسی کی حالت میں وہیں مر گئے تھے۔ 143 آدمیوں پر مقدمہ چلایا گیا تھا اور انہیں موت کی سزا دے دی گئی تھی یہ تمام لوگ شیعہ فرقہ سے تعلق رکھتے تھے اور اس شہر کے رہنے والے تھے جو موجودہ عبوری حکومت کے وزیر اعظم ابراہیم جعفری کا شہر ہے ایک اور مقدمہ لاکھوں کردوں کے قتل کا ہے صدام نے اس قتل عام پر کیمیاوی ہتھیار بھی استعمال کئے تھے اسی طرح 1991ء میں جب شیعہ آبادی نے صدام کے خلاف بغاوت کی تھی تو اس میں بھی ہزاروں افراد نہایت بے دردی کے ساتھ قتل کر دیئے گئے تھے لیکن اس بغاوت کے بارے میں بھی کہا جاتا ہے کہ باغیوں کو امریکا نے اکسایا تھا ان باغیوں کو یہ بھروسہ دلایا گیا تھا کہ کویت پر حملے اور اس کے بعد اتحادی فوجوں کی طرف سے عراق کے خلاف جنگ کے بعد چونکہ صدام کمزور ہو گیا ہے اس لئے اس وقت اس کے خلاف بغاوت کامیاب ہو سکتی ہے اور اس میں باغیوں کو امریکا کی حمایت حاصل رہے گی مگر عین وقت پر امریکا پیچھے ہٹ گیا اور بغاوت کے الزام میں پوری کی پوری آبادیاں نیست و نابود کر دی گئیں۔

جہاں تک کیمیاوی ہتھیاروں کا تعلق ہے وہ بھی عراق کو امریکا اور جرمنی وغیرہ نے ہی فراہم کئے تھے لیکن اس وقت یہ سوال نہیں ہے کہ کس نے ہتھیار دیئے تھے اور کس نے کس کو اکسایا اصل حقیقت یہی ہے کہ صدام بہر حال انسانیت سوز جرائم کا مرتکب ہوا ہے اسے اس کی سزا ملنی چاہیے مگر یہ سزا انصاف کے تمام تقاضے ملحوظ رکھنے کے بعد ہی ملنا چاہیے مقدمہ ایسا چلنا چاہیے جو ہر قسم کے شکوک و شبہات سے بالا ہوتا ہے کہ ہم جیسے جذباتی اور

کمزور ذہن لوگوں کو بھی قائل کیا جا سکے کہ یہ شخص واقعی مجرم ہے اب جس طرح یہ مقدمہ چلایا جا رہا ہے اس سے تو یہی خطرہ ہے کہ 1991ء کی طرح ایک بار پھر وہ ہیرو بن سکتا ہے صدام حسین کے ایک ساتھی ملزم کے وکیل کا اغواء اور اس کے بعد اس کا قتل اس خدشہ کو بھی تقویت دے رہے ہیں۔

اگر اس طرح کے مقدموں کے بعد صدام کو موت کی سزا ہوتی ہے تو ایک طرف صدام کے بارے میں مسلمان ملکوں میں ہمدردی کے جذبات ابھریں گے دوسری طرف امریکا کے خلاف نفرت اور بڑھ جائیگی اور انسانی حقوق کے علمبرداروں کا یہ خواب ہی رہ جائے گا کہ ظالم اور آمروں کا راستہ روکنے کیلئے یہ مقدمہ ایک نظیر بن جائے گا۔

برطانوی جریدے کی رونگٹے کھڑے کردینے والی رپورٹ

عراق میں امریکا اور اتحادی افواج کی طرف سے آگ اور خون کی ہولی کھیلی جارہی ہے۔ برطانوی میڈیکل جرنل ''دی لانسٹ'' نے عراق کے حوالے سے اپنی رپورٹ میں رونگٹے کھڑے کردینے والے انکشافات کیے ہیں رپورٹ کے مطابق عراق پر امریکی اور برطانوی حملے سے لے کر اب تک عراق میں چھ لاکھ پچپن ہزار عراقی موت کے منہ میں جا چکے ہیں۔ ان ہلاک ہونے والوں کی اوسط عمریں 15 سے 44 سال کے درمیان ہیں ان اعداد وشمار کا مطلب ہے کہ اس مختصر عرصے میں 2.5 فیصد عراقی موت کی وادی میں جا چکے ہیں ہر 40 عراقیوں میں سے ایک عراقی اپنی زندگی سے ہاتھ دھو چکا ہے۔ اس برطانوی طبی جریدے کی طرف سے عراق میں ہونے والی ہلاکتوں کے اعداد وشمار منظر عام پر لانے سے پوری دنیا میں امریکا اور برطانیہ کے خلاف نفرت میں اضافہ ہوا ہے۔ ان وسیع پیمانے پر ہونے والی ہلاکتوں نے صدر بش اور امریکا کا اصل چہرہ دنیا کے سامنے بے نقاب کردیا۔

برطانوی جریدے کی طرف سے ہلاکتوں کے اعداد وشمار صدر بش کی طرف سے تسلیم کردہ ہلاکتوں سے 20 گنا اور برطانوی گروپ کے اعداد وشمار سے 10 گنا زیادہ ہیں۔ عراق میں 2003ء سے لے کر اب تک ہلاکتوں میں بے تحاشہ اضافہ ہوا ہے۔ صرف 2004ء کے دوران عراق میں ایک لاکھ افراد ہلاک کردیئے گئے تھے ہلاکتوں کے حوالے سے اکٹھے کیے جانے والے یہ اعداد وشمار مکمل طور پر سائنسی طریقے سے مرتب کیے گئے ہیں۔ اس لئے ان اعداد وشمار میں کسی قسم کی مبالغہ آرائی یا غلطی کا کوئی امکان نہیں ہوسکتا ہے۔ امریکی صدر جارج ڈبلیو بش نے ''میں نہ مانوں'' کے مصداق پر عمل کرتے ہوئے ان رپورٹوں کو مسترد کردیا ہے صدر بش جو خود کو عالمی منصف سمجھتے ہیں کا کہنا ہے کہ عراق میں ہلاکتوں کے حوالے سے برطانوی طبی جریدے کی رپورٹ قابل اعتبار نہیں ہے اس رپورٹ میں حقائق اور اعداد وشمار کو مسخ کرکے پیش کیا گیا عراق میں تعینات امریکی جنرل گریسی، عراقی حکام اور آسٹریلوی وزیراعظم نے بھی خبث باطن کا مظاہرہ کرتے ہوئے حقائق کو تسلیم کرنے سے انکار کردیا ہے۔ عراقی حکومت کے نمائندے کا کہنا ہے کہ رپورٹ میں ہلاکتوں کو بڑھا چڑھا کر پیش کیا گیا ہے۔ رپورٹ کا حقائق سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ عراقی حکام کے مطابق عراق میں تشدد اور ہنگاموں سے اب تک صرف 1 لاکھ 28 ہزار افراد ہلاک ہوئے ہیں۔

برطانوی جریدے کی رپورٹ نے صرف ہلاک ہونے والوں کے اعداد وشمار دیئے ہیں رپورٹ میں ان لوگوں کا ذکر نہیں کیا گیا ہے جو عراق

میں امن وامان کی ابترصورت حال کے باعث اپنی جانیں بچا کر دوسرے ممالک کو نقل مکانی کر گئے ہیں اقوام متحدہ کے اعداد وشمار کے مطابق ہر روز ہزاروں عراقی صرف شام کی سرحد عبور کرتے ہیں۔مختلف مذہبی گروہوں اور فرقوں کی طرف سے عراق چھوڑنے والوں کی تعداد لاکھوں میں ہے۔ عراق سے نقل مکانی کرنے والوں میں بڑے بڑے عالم اور اپنے اپنے شعبوں کے ماہر افراد شامل ہوتے ہیں وہ امریکی اور برطانوی پالیسیوں کے باعث اپنا گھر بار سب کچھ چھوڑ کر پناہ گزین بن جاتے ہیں۔

عراق میں امریکا اور برطانیہ کی پالیسیوں کے نتیجے میں ہونے والی ہلاکتیں ایک انسانی المیہ ہے۔اس کا ذمہ دار صرف صدر بش اور اس کا جنگی جنون ہے۔صدر بش کے نزدیک انسانی زندگی کی اہمیت ایک کیڑے مکوڑے سے زیادہ نہیں ہے۔وہ اپنی طاقت کے زعم اور نشے میں ایک بدمست ہاتھی کی طرح چنگاڑ رہا ہے۔بش کی ناقص پالیسیوں کے باعث عراق میں انسانی تاریخ کے بڑے انسانی المیے نے جنم لیا ہے امریکا، افریقہ، کانگو اور ڈارفر میں تو خود ہلاکتوں کی تحقیقاتی رپورٹیں تیار کرواتا ہے لیکن عراق کے حوالے سے مرتب کی جانے والی رپورٹ کی صداقت کو تسلیم کرنے سے انکار کردیا ہے۔حالانکہ یہ رپورٹ سو فیصد حقیقت پر مبنی ہے اور اس میں ایک فیصد بھی مبالغہ آرائی نہیں ہے۔جنیوا کنونشن پر امریکا اور برطانیہ نے بھی دستخط کر رکھے ہیں اس کنونشن کے مطابق عراق پر قابض اتحادی افواج عام شہریوں کی جان ومال کے تحفظ کی ذمہ دار ہیں لیکن اس ذمہ داری سے سنگین کوتاہی برتی گئی ہے جس کے نتیجے میں لاکھوں عام شہری ہلاک ہوئے اب حقائق دنیا بھر کے سامنے ہیں۔کیا امریکا اور برطانیہ میں اتنی اخلاقی جرات ہے کہ وہ عراق کے حوالے سے اپنی پالیسیوں اور لاکھوں انسانی جانوں کے ضیاع کی ذمہ داری قبول کرلیں گے؟ ایک اور مغربی صحافی لنڈا ایس ہرڈ کا کہنا ہے کہ عراق میں شروع کیے گئے کروسیڈ میں صدر جارج ڈبلیو بش اپنے اصل چہرے کو بے نقاب ہونے سے بچانے کے لیے اور کتنے عراقیوں کے خون سے ہاتھ رنگیں گے۔امریکی سٹیٹ ڈیپارٹمنٹ کے اعلیٰ عہدیدار البرٹ فرنٹڈس نے عراق کے حوالے سے امریکی پالیسیوں کو غرور، تکبر اور حماقت سے تعبیر کرتے ہوئے کہا ہے کہ امریکی پالیسیاں مکمل طور پر ناکام ہو چکی ہیں۔جبکہ وائٹ ہاؤس کے ترجمان نے روایتی ڈھٹائی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا ہے کہ البرٹ فرنٹڈس کا یہ مطلب ہرگز نہیں تھا کیونکہ انہوں نے الجزیرہ ٹی وی کو دیئے گئے انٹرویو میں ناظرین کی آسانی کیلئے عربی کے الفاظ استعمال کیے تھے لیکن ان الفاظ کو غلط رنگ دیا گیا ہے فرینڈس کے الفاظ کا بغور جائزہ لیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ ان کے الفاظ امریکی پالیسیوں پر سو فیصد صادق آتے ہیں عراق میں غاصبانہ قبضہ، صدام حکومت کی معزولی، سرکاری ملازمین کی برطرفی، کٹھ پتلی حکومت کا قیام، آئین کی معطلی، تعمیر نو اور پرتشدد کارروائیوں کے نام پر عراق کی اینٹ سے اینٹ بجانا، چیک پوسٹوں پر عام شہریوں کا قتل عام، قیدیوں کے ساتھ تذلیل آمیز اور شرمناک سلوک، امریکی غرور و تکبر اور حماقت نہیں تو اور کیا ہے؟

امریکی سینٹ کی آرمڈ سروسز کمیٹی کے رکن سینٹر جیک ریڈ نے بھی عراق کے حوالے سے صدر جارج ڈبلیو بش کی پالیسیوں کو مکمل ناکامی سے تعبیر کیا ہے۔جیک ریڈ کا کہنا ہے کہ صدر بش کی ناقص اور احمقانہ پالیسیوں کے باعث امریکا کا عالمی سطح پر وقار بری طرح مجروح ہوا ہے۔کروسیڈ کے نام پر شروع کردہ جنگ 6 لاکھ 55 ہزار عراقیوں کو نگل چکی ہے۔عراق میں جمہوریت قائم کرنے کے نام پر خون کی ندیاں بہادی گئی ہیں لیکن ہر طرف لاقانونیت اور گڑبڑ اور مایوسیوں کے سوا کچھ بھی حاصل نہیں ہوسکا ہے۔اقوام متحدہ کی رپورٹ کے مطابق امریکی اور اتحادی افواج نے 30

لاکھ عراقیوں کو اپنے گھر بار چھوڑ کر ہمسایہ ممالک کو ہجرت کرنے اور پناہ گزین بننے پر مجبور کر دیا ہے۔ ان پناہ گزینوں کا حال تو برا ہے ہی انہیں اپنا مستقبل بھی بہتر نظر نہیں آرہا ہے ان عراقیوں کے لئے زندگی ایک بوجھ بن کر رہ گئی ہے عراق میں دو ہزار سے زائد ڈاکٹروں کی ہلاکت کے باعث طبی سہولیات بھی ناپید ہو گئی ہیں۔ ہسپتال ویران اور کھنڈر بن چکے ہیں جو ڈاکٹر اور پیرا میڈیکل سٹاف موت کے منہ میں جانے سے بچ گیا ہے وہ اپنی جانیں بچا کر ہمسایہ ممالک کو ہجرت کر گئے ہیں اس طرح عراقیوں کے زخموں پر مرہم رکھنے والا بھی اب کوئی نہیں ہے۔ ہسپتالوں کے آثار بھی غائب ہو گئے ہیں اگر کہیں ہسپتال کی عمارت بنتی ہے تو وہاں پر کسی قسم کی ادویات دستیاب نہیں ہیں۔ ایک مغربی صحافی پیٹر کاک برن نے عراق ہسپتالوں کا ان الفاظ میں نقشہ کھینچا ہے۔ ''عراق میں خانہ جنگی کے باعث ہسپتال میدان جنگ کا منظر پیش کر رہے ہیں۔''

عراق میں حالات اس حد تک سنگین صورت حال اختیار کر چکے ہیں کہ صدر بش کو ایک ٹیلی ویژن انٹرویو کے دوران اعتراف کرنا پڑا ہے کہ عراق کی صورت حال اس نہج پر پہنچ چکی ہے کہ عراق دوسرا ویت نام بن چکا ہے عراق کے حوالے سے صدر بش کا اعتراف امریکی ناکامی کو ظاہر کرتا ہے اس سے بش کے ذہنی انتشار اور شکست وریخت کا اظہار بھی ہوتا ہے امریکی کانگریس کی زیر نگرانی جیمز بیکر کی قیادت میں قائم کردہ سٹڈی گروپ کی منظر عام پر آنے والی رپورٹ نے بھی عراق میں امریکی اور اتحادی افواج کی مزید موجودگی اور تعیناتی کی مخالفت کی ہے۔

آسٹریلیا کے ایک سابق سفارتکار رڈوولکوٹ نے عراق کی صورت حال پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا ہے کہ امریکا کی طرف سے شروع کردہ جنگ نے اس ملک پر دہشت گردی کی کارروائیوں کا خطرہ بڑھا دیا ہے امریکا اور برطانیہ خود اس ساری تباہی کے ذمہ دار ہیں عراق کے حوالے سے امریکی پالیسیاں مکمل طور پر ناکام رہی ہیں عراق میں امریکا کی موجودگی کا اب کوئی جواز باقی نہیں رہا ہے اس لئے امریکی افواج فوری طور پر عراق سے نکل جائیں۔ برطانوی افواج کے سربراہ جنرل رچرڈ ڈانٹ نے بھی عراق سے امریکی اور اتحادی افواج کے فوری انخلاء کا مطالبہ کرتے ہوئے کہا ہے کہ عراق میں اتحادی افواج کی موجودگی سے سیکورٹی کے مسائل میں اضافہ ہوا ہے ان کا کہنا ہے کہ ''ہم ایک مسلمان ملک میں موجود ہیں اور غیر ملکیوں کے بارے میں مسلمانوں کے خیالات بالکل واضح ہیں۔ مسلمان اپنے مہمانوں کو خوش آمدید کہتے ہیں لیکن ہم عراق میں مہمان نہیں ہیں کیونکہ ہم نے ان کی مرضی کے خلاف عراق پر چڑھائی کی ہے۔''

صدر بش اپنے مشیروں اور جرنیلوں کے اعتراف کے باوجود ڈھٹائی کا مظاہرہ کرتے ہوئے پھر اس عزم کا اظہار کر رہے ہیں کہ جیت اور فتح ہمارا نصب العین ہے ہم مشن کی تکمیل تک عراق سے فوجیں واپس نہیں بلوائیں گے'' اب البرٹ فرینڈس کہاں ہیں؟ کہاں یہ غرور وتکبر اور احمقانہ خیال نہیں ہے۔ اس سے بڑھ کر اور بڑی حماقت کیا ہوگی صدر بش اور کتنی معصوم جانوں کو اپنی ضد ''ڈھٹائی'' غرور، تکبر اور حماقت کی بھینٹ چڑھائیں گے بش کا دامن پہلے ہی لاکھوں انسانوں کے خون سے رنگین ہے۔ عراق، افغانستان، فلسطین، بوسنیا، کشمیر، لبنان میں جہاں بھی زمین خون مسلم سے رنگین ہوئی ہے اس کے پیچھے صدر بش کا ہی ہاتھ ہے۔

بشکریہ (حافظ طارق عزیز)

صدام حسین کی پھانسی کا پس منظر

جارج آرویل نے کسی شخص کو پھانسی پر لٹکتے دیکھا تو لکھا: "اس سے پہلے میں نے منظر کبھی نہیں دیکھا تھا۔ وہ ایک حیران کن نظارہ تھا۔ ایک اچھے بھلے صحت منداور باہوش آدمی کو موت کی وادی میں دھکیلا جارہا تھا"...... دوسری جنگ عظیم سے قبل جارج آرویل برما میں بطور پولیس آفیسر تعینات تھا۔ کسی شخص کی موت کو اس کے اتنا قریب دیکھ کر وہ پریشان ہوگیا تھا، لیکن 2007ء کے عین اوائل میں ایک شخص کی موت کا منظر دنیا بھر کو حیران وپریشان کر گیا۔ مرنے والا صدام حسین تھا۔ اسے پھانسی پر لٹکایا جارہا تھا، اس کی پھانسی کے منظر کو کیمرہ فون پر ریکارڈ کرنے کے بعد انٹرنیٹ پر ریلیز کردیا گیا۔

جان پریسکاٹ نے بی بی سی کے ساتھ ایک انٹرویو کے دوران صدام حسین کی موت کو "حد درجہ قابل مذمت" قرار دیا۔ اگر صدام حسین کی پھانسی کے موضوع پر اس کے انٹرویو کو زیادہ کوریج نہ دی جاتی، اسے صرف ایک "سرکاری بیان" سمجھ لیا جاتا، اس کی باقاعدہ کاٹ چھانٹ ہوتی اور فلم بھی خاموش بنتی تو ممکن ہے وہ اس قدر بے باکانہ گفتگو نہ کرتا۔ اتنی صاف گوئی سے کام نہ لیتا۔

بعض اخبارات نے جوسا کن تصاویر شائع کیں، وہ بھی دل ہلا دینے والی تھیں۔ دنیا ششدر رہ گئی۔ صدام حسین کو بڑی بے رحمی سے مارا گیا۔ اسے بڑے سفاکانہ انداز میں قتل کیا گیا۔ جو موت صدام حسین کو دی گئی، وہ آج کل پورے عراق میں ناچ رہی ہے۔ موت اور عراقیوں کی باہمی شناسائی میں کئی گنا اضافہ ہو چکا ہے۔ پریسکاٹ کے بیان پر کسی شبے کا اظہار نہیں کیا جاسکتا۔ مارگریٹ بیکٹ نے بھی اپنے ابتدائی بیان میں درست کہا تھا کہ صدام حسین نے اپنے اعمال کی سزا بھگتی: "جیسا کرو گے ویسا بھرو گے"...... یہ محاورہ درست ثابت ہوگیا۔ مارگریٹ بیکٹ نے حکومت برطانیہ کی ترجمانی کی، 10۔ ڈاؤننگ سٹریٹ کا مؤقف بیان کیا۔ اصولاً سرکاری مؤقف یہ نہیں ہونا چاہیے تھا، کیونکہ سفارتی آداب کی نفی ہمارا شیوہ نہیں۔

جس جگہ صدام حسین کو پھانسی دی گئی، وہاں عراق کے دفاعی شعبے کے سابقہ دفاتر ہوا کرتے تھے۔ صبح کے وقت وہاں بنائی گئی فلم بہت سے حقائق کو بے نقاب کرگئی۔ ان دفاتر کے بالکل ساتھ وہ عدالت ملحق ہے جہاں صدام حسین کو موت کی سزا سنائی گئی، ایک ناخوشگوار سزا۔ وہ سزا اقتدار اعلیٰ کی مالک ایک ذمہ دار ریاست نے سنائی۔ ایک ایسی ریاست جہاں فرقہ وارانہ تشدد عروج پر ہے۔

جن حالات میں عراق کے سابق حکمران کی موت واقع ہوئی، وہ عجیب وغریب اور اپنی مثال آپ تھے۔ اخلاقیات کو بری طرح روندا گیا۔

عراق کے اندر بھی اس اقدام کو اچھی نظر سے دیکھنے والوں کی تعداد بہت کم تھی۔ برطانیہ کو بھی چاہیے تھا کہ سرکاری سطح پر اس اقدام کی مخالفت کرتا،

END OF SADDAM

غیر ملکی ذرائع ابلاغ کی شائع شدہ رپورٹوں اور عربی ٹی وی چینل الجزیرہ کی نشر کردہ ویڈیو کے مطابق جب عراقی صدر صدام حسین کو پھانسی دینے کے لئے عراقی گارڈ لائے تو حیرت انگیز طور پر انہوں نے چہروں پہ نقاب پہن رکھے تھے اور صدام حسین کی گردن پر کپڑا لپیٹنے اور پھانسی کا پھندا ڈالنے تک چہرہ پہ کوئی نقاب نہیں تھا اور پھر نیٹ پر جاری کردہ ویڈیو سے یہ بھی ثابت ہو گیا کہ انہوں نے نقاب پہننے ہی سے انکار کر دیا تھا البتہ پھانسی کا پھندا ڈالنے تک ان سے عراقی گارڈز کی جو تکرار ہوئی اس میں انہوں نے دعویٰ کیا کہ انہوں نے عراقیوں کا بہت تحفظ کیا اور انہیں ان کے دشمنوں سے بچایا لیکن جب گارڈز نے نفی کی اور الزام لگایا کہ انہوں نے ان کی زندگی جہنم بنائی اور ہمیں تباہ کیا اور قتل کیا لہٰذا تم جہنم میں جاؤ گے تو انہوں نے کہا کہ نہیں! جہنم میں تم جاؤ گے اور میں سیدھا جنت میں جاؤں گا! اس موقع پر انہوں نے کہا کہ فلسطین فلسطینیوں کا ہے۔ عراق تا ابد قائم رہے گا۔ انہوں نے مسکراتے ہوئے اللہ اکبر کہا اور پھر قریبی کھڑے عراقی گارڈز کو مسکراتے ہوئے دیکھا اور با آواز بلند کلمہ شہادت پڑھنے لگے اور پھر جب دوسری مرتبہ کلمہ شہادت پڑھتے ہوئے انہوں نے محمد ﷺ کہا تو اچانک تختہ دار کا لیور کھینچ دیا گیا اور 69 سالہ صدام حسین کا جسم جھول گیا۔ اس پر قریب موجود ایک شخص نے کہا کہ "ظالم! اپنے انجام کو پہنچا" اور پھر کسی نے کہا کہ "3 منٹ تک لٹکا رہنے دو!" اس سے قبل ایک گارڈ نے جب ان سے پوچھا کہ تمہیں پھانسی سے ڈر نہیں لگتا اور موت سے نہیں ڈرتے؟ تو انہوں نے کہا کہ "ساری زندگی انہوں نے آنکھیں ڈال کر دشمنوں کا مقابلہ کیا ہے اور وہ موت سے نہیں ڈرتے ہیں۔" قطع نظر اس بات کے کہ صدام حسین اب اس دنیا میں نہیں رہے ہیں اور خالق کائنات کی بارگاہ میں پہنچ چکے ہیں جو ان کے ابدی مقام کا تعین کرے گا اور بلاشبہ ہم سب نے بھی ایک نہ ایک روز رب ذوالجلال کی بارگاہ میں پہنچنا اور حاضری دینا ہے جہاں ہمارے دنیاوی اعمال کی روشنی میں ابدی مقام کا تعین ہو گا لیکن یہ بات طے ہے کہ دنیا جسے برناڈ شاہ نے اسٹیج قرار دیا ہے پر صدام حسین جس طرح بناء کسی گھبراہٹ کے سوئے مقتل گئے' اپنی نظریں جھکائے بغیر انتہائی اطمینان اور سکون سے گلے پہ سیاہ کپڑا لپٹوا کر رسی کا پھندا ڈلوایا۔ لرزتی اور کانپتی ٹانگوں کے بجائے پوری قوت سے کھڑے ہو کر سیاہ نقاب اوڑھنے سے انکار کیا اور جس طرح ان کی پیشانی پر پسینے کے قطروں کے بجائے صرف غور و فکر کی لکیریں نمودار ہوئیں تو اس نے ان کی بیٹی رغد صدام حسین کے اس دعوے کو سچ ثابت کر دکھایا "میرا باپ شیر تھا' شیر ہی رہے گا" انہوں نے جس طرح پھانسی کا پھندا گردن میں ڈلوایا بلاشبہ اسی عمل کو تختہ دار کو چومنا کہتے ہیں اور جہاں تک "جان" کی بات ہے تو

فیض نے بہت پہلے کہا تھا۔

؎ جس دھج سے کوئی مقتل میں گیا
وہ شان سلامت رہتی ہے
یہ جان تو آنی جانی ہے
اس جان کی کوئی بات نہیں

یہاں یہ ذکر بھی بے جا نہ ہوگا کہ ماہرین نفسیات اس بات پر متفق ہیں کہ عام زندگی سے لے کر میدان جنگ تک میں اصلی لڑائی ''اعصاب'' کی ہوتی ہے اور فاتح وہی ٹھہرتا ہے جس کے اعصاب مضبوط و توانا ہوتے ہیں اور یہ کوئی نئی بات نہیں کہ اکثر و بیشتر میدان جنگ میں شکست پانے والے ہی فاتح قرار پاتے ہیں اور تاریخ میں ہمت، مردانگی، شجاعت اور جرات کی علامت قرار دیئے جاتے ہیں، شاید یہی وجہ ہے کہ آج بھی دانشوران قوم اس بات کا برملا اظہار کر رہے ہیں کہ مردہ صدام حسین زندہ صدام حسین سے زیادہ خطرناک ثابت ہوگا اور ایک صدام حسین کو جس انداز سے دنیائے فانی سے رخصت کیا گیا ہے اس کے نتیجے میں کئی صدام حسین جنم لیں گے جو زیادہ خطرناک ہوں گے۔'' عراق جنگ کے حوالے سے بین الاقوامی شہرت پانے والے رابرٹ فسک نے موقر برطانوی اخبار انڈی پینڈنٹ میں لکھا ہے کہ ''جب صدام حسین کو گرفتار کیا گیا تھا تو اس وقت مزاحمت دگنی ہوگئی تھی اور اب جبکہ صدام حسین کو پھانسی دی جا چکی ہے۔ عین ممکن ہے کہ مزاحمت ایک مرتبہ پھر دگنی ہو جائے۔

؎ گیا تھا شان سے مقتل کی سمت جو تنہا
وہ اپنا عکس ہر آئینے میں چھوڑ گیا

صدام حسین کا دنیاوی مقام و مرتبہ یقیناً مورخ متعین کریں گے البتہ ابھی تک علم سیاسیات کے اساتذہ و طلباء اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ ان کی شخصیت تضادات کا مجموعہ تھی۔ امریکی افواج کے ہاتھوں جب ایک غار سے ان کی گرفتاری عمل میں آئی تھی اور جس طرح عرصے تک چینلوں پہ ان کے دانتوں کا معائنہ ہوتے دکھایا گیا تھا تو وہ ایک ہارے ہوئے اور بزدل حکمران کا روپ لئے ہوئے تھے لیکن جس انداز میں انہوں نے زندگی کے آخری لمحات اور پل گزارے اس کے نتیجے میں وہ ایک بہادر اور مضبوط اعصاب کے انسان نظر آئے اور پھانسی کا پھندا ڈالنے کے بعد ان کا نعرہ تکبیر بلند کرنا بلاشبہ ان کی ثابت قدمی کا ثبوت ہے۔ ان کی پھانسی پر ایران نے اظہار مسرت کرتے ہوئے اسے عراقی عوام کی فتح قرار دیا تو لیبیا نے تین روز تک سوگ منانے کا اعلان کیا۔ ان دو مختلف ردعمل سے ثابت ہوتا ہے کہ صدام حسین کی پھانسی پر لوگوں کی سوچ و فکر تقسیم ہے۔ حجاج کرام کی جانب سے بھی پھانسی پر ملا جلا ردعمل سامنے آیا ہے جبکہ روس اور یورپی یونین نے بھی اظہار مسرت نہیں کیا ہے حالانکہ اپنے دور حکومت میں صدام حسین صرف روس کے دوست نہیں تھے کیونکہ جب سوویت یونین نے افغانستان میں مداخلت کی تو جہاں انہوں نے بڑھ چڑھ کر اس کا ساتھ دیا تھا تو کہا جاتا ہے کہ اسی وقت انہوں نے ایران سے جنگ چھیڑ کر اپنا نام واشنگٹن کی ''گڈ بک'' میں بھی لکھا لیا تھا۔ سیاسی ناقدین تو یہاں تک کہتے ہیں کہ 1990ء میں عراق نے کویت پر جو حملہ کیا تھا وہ بھی امریکی آشیر باد کا نتیجہ تھا کیونکہ اس طرح جہاں امریکہ کو مشرق وسطیٰ میں فوجی اڈے قائم

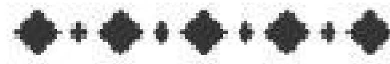
کرنے کا موقع ملا تو وہیں سعودی عرب نے بھی امریکی فوج بلانے کا فیصلہ کیا اور ان فیصلوں کے برآمد ہونے والے کچھ نتائج ہم دیکھ چکے ہیں اور دوررس اثرات ظاہر کرنے والے نتائج بھی جلد سامنے آ جائیں گے۔ صدام حسین جنہیں 148 شیعہ عراقیوں کے قتل کے الزام میں پھانسی دی گئی ہے؛ وہ جب عراق میں اہل تشیع پر مظالم ڈھا رہے تھے اور کلیتاً سیاہ وسفید کے مالک تھے تو اس وقت امریکہ کے عراق سے سفارتی تعلقات نہیں تھے اور دونوں ممالک کے درمیان اس وقت سفارتی تعلقات بحال ہوئے جب ڈونلڈ رمزفیلڈ نے ریگن انتظامیہ کے دور میں عراق کا دورہ کیا اور یہ 84-1983ء کی بات ہے (ڈونلڈ رمزفیلڈ کے اس دورے کا مقصد کیا تھا اور انہوں نے کیا کچھ حاصل کیا تھا) عراق ایران جنگ کے حوالے سے عالمی سیاسی مبصرین کا خیال ہے کہ اس میں امریکی سی آئی اے بھرپور طریقے سے ملوث تھی اور اس کا واحد مقصد دو اسلامی ممالک کی قوت کو اس حد تک تباہ کرنا تھا کہ وہ آئندہ مستقبل کے مشرق وسطیٰ میں اسرائیل کے لئے کسی طرح کا بھی خطرہ نہ بن سکیں۔ عراق کے نیوکلیئر پروگرام پر تو پہلے ہی اسرائیلی فضائیہ حملہ کر چکی تھی۔ سابق امریکی سفارتکار پیٹر گالبرائتھ جن کی حال ہی میں منظر عام پر آنے والی کتاب "End of Iraq" ہے نے 1984ء کو وائٹ ہاؤس کو اپنے دورۂ عراق کے بعد پیش کردہ رپورٹ میں لکھا تھا کہ "صدام حسین نے اپنے ہی ملک میں کیمیائی ہتھیار استعمال کیے ہیں" تو اعلیٰ امریکی حکام نے شدید ناراضگی کا اظہار کیا تھا اور صدام حسین کے خلاف استعمال کردہ جملوں اور لفظوں پر شدید ردعمل ظاہر کیا تھا اور باقاعدہ بُرا منایا تھا۔ مگر اب اسی صدام حسین کو پھانسی کی سزا دے دی گئی ہے۔ رابرٹ فسک نے درست لکھا ہے کہ "امریکہ ہی صدام کی تخلیق اور جرائم کا ذمہ دار ہے اور اب اسے ختم کرنے میں بھی امریکہ ہی کا کردار ہے۔" کارپیٹر گالبرائتھ نے اپنی تازہ تصنیف میں دعویٰ کیا ہے کہ "مارچ 2003ء میں جب امریکہ نے عراق پر حملہ کیا تو عراق عملی طور پر تین حصوں میں تقسیم ہو گیا اور ایک آزاد کرد ریاست وجود میں بھی آ چکی ہے البتہ اس کا صرف اعلان ہونا باقی رہ گیا ہے اور امریکہ 2007ء میں آزاد کرد ریاست کو تسلیم کرنے کا اعلان کر سکتا ہے اور نتیجتاً موجودہ عراق کا خاتمہ ہو جائے گا۔" البتہ ترکی اور شام آزاد کرد ریاست کی مخالفت کریں گے اور پھر مشرق وسطیٰ میں عربوں کو نئی عرب ریاست کے خلاف صف بندی پر آمادہ کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ عالمی سیاسی صورت حال پہ گہری نگاہ رکھنے والے مبصرین یقین رکھتے ہیں کہ ایران کے خلاف اعلان کردہ پابندیاں دراصل امریکہ کی اس حکمت عملی کی پیش بندی ہے جس کے تحت وہ ایران کے خلاف کارروائی کرنے کی منصوبہ بندی کر رہا ہے اور چاہتا ہے کہ بعض عرب ممالک سمیت پاکستان بھی اس جنگ میں اس کا ساتھ دے۔ یہاں یہ واضح کرتے چلیں کہ ایران کے خلاف عرصے سے بھرپور پروپیگنڈہ مہم اسرائیل چلا رہا ہے اور وہ مسلسل امریکہ کو مشورہ دے رہا ہے کہ وہ بلا تامل ایران پر حملہ کر دے بلکہ بعض انتہا پسند یہودی دانشور اور فوجی حکام سمیت سفارتکار تو اسرائیلی اخبارات ہیرٹز اسرائیل انسائیڈر اور جیروشلم پوسٹ کے ذریعے اسرائیلی حکومت کو یہ مشورہ بھی دیتے آئے ہیں کہ وہ امریکی کارروائی کرنے کا انتظار نہ کریں اور خود یہ قدم اٹھالیں۔ اس حوالے سے انہوں نے مختلف تھنک ٹینکس کی تیار کردہ رپورٹس بھی منظر عام پر پیش کی ہیں اور کہا ہے کہ ایٹمی طاقت کا حامل ایران پوری دنیا کے لئے شدید خطرہ ہے۔ اسرائیلی وزیر اعظم ایہود اولمرٹ نے بھی اپنے حالیہ دورۂ جرمنی میں یہی بات کہی تھی کہ ایٹمی ایران پوری دنیا کے لئے خطرہ ہے اور ساتھ ہی انہوں نے انتہائی معصومانہ انداز میں فرمایا تھا کہ ایٹمی قوت کا حامل اسرائیل کسی کے لئے خطرہ نہیں کیونکہ اسرائیل کسی ملک کو صفحۂ ہستی سے مٹانے کی دھمکی نہیں دیتا ہے جبکہ ایران تسلسل کے ساتھ اسرائیل کو نیست و

نابود کرنے کا کہہ رہا ہے اس موقع پر یہ سوال بھی دلچسپی سے خالی نہیں ہوگا کہ صدام حسین کو پھانسی دینے کے لئے عیدالاضحیٰ کا روز کیوں منتخب کیا گیا؟ وطن عزیز پاکستان سمیت پورے عالم اسلام میں اس روز کے انتخاب پر شدید نکتہ چینی ہورہی ہے جبکہ بعض کے خیال میں چونکہ امریکیوں کے نزدیک ''تہواروں'' کی حیثیت نہیں ہے اس لئے ایسا ہوگیا لیکن سیاسی داؤ پیچ سے واقف افراد یقین رکھتے ہیں کہ ''ہیں کواکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ۔ دیتے ہیں دھوکہ یہ بازی گر کھلا'' کے مصداق ایسا نہیں ہے اور سب کچھ سوچی سمجھی منصوبہ بندی کا نتیجہ ہے۔ اس خیال کی تصدیق مشہور امریکی اخبار ''نیوز ڈے'' نے بھی کی ہے۔ ''نیوز ڈے'' نے اپنی تفصیلی رپورٹ میں لکھا ہے کہ ''صدام حسین کو پھانسی دینے کا وقت سوچ سمجھ کر متعین کیا گیا ہے۔'' اخبار کے مطابق ''صدام حسین کی موت کے حوالے سے رچایا گیا ڈرامہ اور وقت کا انتخاب اس لئے کیا گیا کہ عراق کے سنیوں کو ایک شہید دے دیا جائے تاکہ عراق میں مزاحمت جاری رہے اور حالات درست نہ کئے جائیں۔'' اخبار کے مطابق ''صدام حسین کی مقبولیت ابو مصعب زرقاوی سے بھی زیادہ ہوگئی ہے جو مزاحمت کی علامت تھے اب عراق میں مزاحمت اور خصوصاً فرقہ وارانہ کشیدگی کو روکنا ناممکن ہے۔ پھانسی کے بعد سنی عراقیوں کا گلہ ہوگا کہ شیعہ حکومت سنی اور ان کے جذبات کو کچل رہی ہے اور سنی عوام پھانسی کو شیعہ مظالم کی ایک مثال قرار دیں گے۔ صدام حسین کے حامیوں نے انہیں شہید قرار دیتے ہوئے عراقی وزیراعظم نوری المالکی سے انتقام لینے کا اعلان کیا ہے۔'' نیوز ڈے کی رپورٹ کو اگر سابق امریکی سفارتکار کارپیٹر گالبراتھ کی تحریر کردہ کتاب ''اینڈ آف عراق'' کی روشنی میں دیکھا جائے تو آئندہ کا منظرنامہ بہت زیادہ واضح ہوجاتا ہے۔ رابرٹ فسک کا یہ کہنا کچھ غلط نہیں ہے کہ ''صدام حسین کی موت پر یقیناً کچھ عرب لیڈر بہت سے کرد اور کافی تعداد میں شیعہ ضرور خوش ہوئے ہوں گے مگر ایسے کروڑوں مسلمان ہیں جو اس بات کو ہمیشہ یاد رکھیں گے کہ انہیں صدام حسین کی موت کی اطلاع اسلام کے مقدس روز یعنی عیدالاضحیٰ کو ملی اور یہ وہی دن ہے جب صدام حسین ہر سال اپنی جیلوں سے قیدیوں کو رہا کیا کرتا تھا لیکن صدام حسین کو اس سے زیادہ اور کیا چاہئے کہ عرب مورخین کے لئے وہ اب ظالم اور سفاک صدام حسین نہیں بلکہ جدید کروسیڈرز کے ہاتھوں مرنے والا ایک شہید بن گیا ہے۔''

صدام حسین کی پھانسی عراق میں جاری مزاحمتی تحریک کے لئے مہمیز کا کام دے گی؟ شیعہ سنی منافرت میں اضافے کا سبب بنے گی؟ حقیقتاً موجودہ عراق کا خاتمہ ہوجائے گا؟ تین ٹکڑوں میں عراق تقسیم ہوجائے گا؟ مشرق وسطیٰ میں نئی صورت حال کے سبب از سر نو صف بندی ہوگی؟ ان سوالات کے جوابات تو یقیناً آنے والا وقت ہی دے گا البتہ ایک مرتبہ پھر یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچی ہے کہ امریکہ دنیا کے دیگر ممالک کے حکمرانوں کو پہلے اپنے مقاصد کی لئے استعمال کرتا ہے اور پھر انہیں بدترین انجام سے دوچار کرنے کی اپنی روایت برقرار رکھتا ہے بلکہ بسا اوقات یہ بھی ہوا ہے کہ اگر اس نے کسی حکمران کو اپنے مقاصد کے حصول میں رکاوٹ سمجھا ہے تو بلا تامل اس کا دھڑن تختہ کردیا ہے یا پھر وہ دارفانی سے کوچ کر گیا ہے اور اس ملک کے عوام کو کبھی یہ معلوم ہی نہیں ہوپاتا کہ ان کے حکمران یا محبوب لیڈر کا اصلی قاتل کون ہے؟ اور وہ اسے بلائنڈ مرڈر قرار دیتے رہتے ہیں تاہم اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ عوام ''سینہ گزٹ'' کے ذریعے انتہائی خاموشی سے ایک دوسرے کو ضرور آگاہ کرتے ملتے ہیں کہ قتل کے پیچھے امریکہ یا امریکی سی آئی اے کا خفیہ ہاتھ کارفرما ہے تاہم ایسا کرتے ہوئے وہ دائیں بائیں اس طرح سے دیکھتے ہیں کہ کوئی دوسرا اس ''قومی راز'' سے تو واقف ہونے نہیں جارہا ہے جو وہ اپنے کسی عزیز کو بتلانے والے ہیں۔ جولائی 2006ء میں بھارتی اخبار نے امریکی ذرائع کے حوالے سے

رپورٹ شائع کی تھی کہ پاکستان کے پہلے وزیر اعظم لیاقت علی خان نے جب امریکی اور برطانوی پالیسیوں پر چلنے سے انکار کیا تو امریکہ نے انہیں راستے سے ہٹانے کا فیصلہ کیا اور پھر ان کا قتل امریکی اشارے پر ہوا۔ قابل غور بات یہ ہے کہ قیام پاکستان کے بعد روس نے وزیر اعظم لیاقت علی خان کو دورہ کرنے کی دعوت دی تھی اور امریکہ کی جانب سے دورے کی دعوت بعد میں ملی تھی لیکن لیاقت علی خان نے پہلے امریکہ کا دورہ کرنے کو ترجیح دی تھی۔ تاریخ پاکستان تا حال یہ بتانے سے قاصر ہے کہ پہلے وزیر اعظم کے قتل کے محرکات کیا تھے؟ پس پردہ عوامل کیا تھے؟ قتل کی مکمل تحقیقات تا حال کیونکر منظر عام پر نہیں آسکی؟ اور قاتل کی بیوہ کو پنشن کس کھاتے میں ادا کی جاتی رہی؟ اسی طرح ذوالفقار علی بھٹو نے جب امریکہ کی جانب سے ملنے والی دھمکی پر مبنی خط راولپنڈی میں لہرایا اور قوم کو حقائق بتانے کی کوشش کی اور عالمی سیاست میں اپنی دانست کے مطابق رنگ بھرنے کی سعی کی تو انہیں تختہ دار چومنا پڑا جنرل ضیاء الحق کے حادثے کے متعلق تو متعدد زندہ افسران اور حکام کہتے ہیں کہ طیارہ حادثے کی نہیں بلکہ امریکی سازش کی بھینٹ چڑھ گیا تھا اور اس میں پاک فوج کی پوری اعلیٰ قیادت کو جام شہادت نوش کرنا پڑا تھا جبکہ اس کے بعد بھی آنے والی سیاسی حکومتی تبدیلیوں کی بظاہر وجہ کچھ بھی بیان کی جائے واقفان حال کا اصرار یہی ہے کہ سب کچھ امریکی مرضی و منشاء کے مطابق ہوتا آیا ہے۔" ساری صورتحال کے تناظر میں یہ کہنا قطعی غلط نہ ہوگا کہ آنے والا وقت مزید کٹھن ہوگا جہاں ایک جانب امت مسلمہ کا امتحان ہوگا تو دوسری جانب مسلم حکمرانوں کے فہم و فراست اور تدبر کی بھی پیمائش ہوگی' مشرق وسطیٰ میں کی جانے والی نئی صف بندی کے اثرات براہ راست پاکستان پر مرتب ہوں گے تو ایران کے خلاف گھیرا تنگ کرنے کی حکمت عملی بالخصوص پاکستانی ارباب اقتدار کو انتہائی نازک موڑ پر لا کھڑا کرے گی جس سے سرخروئی سے نکلے تو یقیناً پاکستان اور پاکستانی قوم مستفیض ہوگی وگرنہ تصور بھی محال ہے اور اللہ رب العزت سے دعا ہے کہ وہ ہمیں کسی امتحان میں نہ ڈالے کہ ہم بہت عاجز ہیں۔

بشکریہ (جاوید رشید صدیقی)



صدام کی ویڈیو

عراق کے معزول صدر صدام حسین اب اس دنیا میں موجود نہیں۔ وہ عالمی سامراج کے ہاتھوں اپنی جان دے چکے ہیں۔ جب امریکی افواج نے مختلف جواز تلاش کر کے عراق پر عملی طور پر قبضہ کیا تو صدام حسین بے بس ہو گئے۔ اس عالم میں انہوں نے روپوش ہو کر چھپ جانا ہی مناسب سمجھا۔ ادھر امریکی افواج نے انہیں جب تلاش کر کے اپنی گرفت میں لے لیا تو ان کا حلیہ ان کی بے بسی کی داستان بیان کر رہا تھا۔ مغربی میڈیا نے ان کی یہ تصویر بھرپور طریقے سے تمام چینلز پر دکھائی جو ان کی پھانسی کے دن تک دکھائی جاتی رہی۔ امریکی حکام نے اس ویڈیو کلپ کو بہت اہتمام کے ساتھ دنیا بھر کے میڈیا پر چلوایا۔

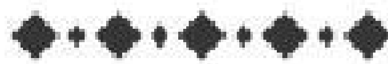
ادھر دنیا میں قیام نظام عدل کے علمبردار امریکہ نے اپنی کٹھ پتلی عراقی حکومت اور اس کے ماتحت عدلیہ سے صدام حسین کو سولی پر چڑھانے کا کام بھی لے لیا۔ اس موقع پر صدام حسین کی پھانسی کے مناظر کیمرہ میں بند کرنے کا اہتمام کروایا گیا اور پروگرام کے مطابق صدام کو پھانسی دیئے جانے کے ساتھ ہی یہ ویڈیو کلپ تمام معروف چینلز کو جاری کر دی گئی۔ اس ویڈیو کلپ نے صدام حسین کو ایک نئی زندگی عطا کر دی۔ یوں لگتا ہے کہ مغربی متعصب ذہن نے یہ سوچ رکھا تھا کہ صدام حسین مقتل کی طرف جاتے ہوئے شور واویلا کریں گے اور پھانسی کی سزا پانے والے عام افراد کی طرح وقت سے پہلے ہی بے ہوش اور نیم بے ہوش ہو جائینگے یا انہیں زبردستی پھندے کے نیچے کھڑا کیا جائے گا۔ سارے زمانے نے دیکھا ان میں سے کچھ بھی نہ ہوا اور صدام حسین جس سج دھج سے سوئے دار گئے تاریخ میں اس کی مثال نہیں ملتی۔ ان کے چہرے پر خوف تھا نہ قدموں میں لغزش۔ وہ جس سکون کے ساتھ پھانسی کے پھندے پر پہنچے اس سے یقینی طور پر موت کے شرمندہ ہونے کی مثال سچ بن گئی ہے۔ مغربی ٹی وی چینلز کے ذریعے تمام دنیا کے چینلز نے اس منظر کی فلم کو اپنے اپنے ٹی وی چینلز پر چلایا۔ اس فلم کو جس نے بھی دیکھا اس کے دل سے صدام حسین کے لئے ''شاباش'' کے لفظ ضرور نکلے۔ تمام دنیا کے ٹی وی چینلز پر صدام کے آخری لمحات کی فلم سینکڑوں بار دکھائی گئی۔ اس منظر نے تمام دنیا کے مسلمانوں کو موت کی آنکھ میں آنکھیں ڈالنے کا حوصلہ دیا اور عالمی سامراج کے خلاف نفرت میں اضافہ کیا۔ اگر ٹی وی چینلز پر صدام کے آخری لمحات کی تصاویر نہ دکھائی جاتیں تو شاید یہ فضا بھی نہ بن پاتی...... پھر کیا ہوا عالمی سامراج میں ایک گھبراہٹ اتر آئی اور ویڈیو فلم بنانے والے کے خلاف ایکشن کے احکامات جاری ہو گئے۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا دنیا کے اس دن کے سب سے اہم ترین واقعہ اتنا عام تھا جہاں کوئی بھی کیمرہ اٹھائے پہنچ

جاتا۔نہیں ایسا نہیں ہوا۔صدام حسین کے آخری لمحات کو مسلمانوں کے لئے نشان عبرت بنانے کیلئے یہ سب کارروائی کی گئی مگر اس کے اثرات الٹ سامنے آئے اور عالمی سامراج نے کھسیانی بلی کھمبا نوچے کے مصداق منظر فلم بند کرنے والے کے خلاف کارروائی کر ڈالی۔

یہ تاریخی حقیقت ہے کہ اللہ رب العزت نے ہر ظالم کے لئے اس سے بڑے ظالم کا بندوبست کیا ہوا ہے۔ ہر دور میں فرعون اور نمرود کا وجود موجود رہا ہے۔ ہمارا دور بھی اس سے قطعی طور پر خالی نہیں ہے۔صدام نے بھی ہر آمر کی طرح ناانصافیاں اور ظلم و جبر کئے ہونگے مگر اس کے ساتھ جو کچھ کیا گیا وہ صرف صدام کے ساتھ نہیں ہوا بلکہ پوری امت مسلمہ کو اس وائرے میں لانے کی کوشش کی گئی۔ اسلام کے زریں اصولوں پر ایک نظر دوڑائی جائے تو یہ بات کہیں بھی نہیں ملتی کہ مسلمان کسی بھی کردار کے دوسرے مسلمان کو تیغ کرنے کے لئے یہود و نصاریٰ کا سہارا لے۔ اگر اس اصول کو دیکھا جائے تو امریکی اقدامات پوری امت مسلمہ کے لئے قابل مذمت اور باعث نفرت ہیں۔صدام حسین کو پھانسی دینی ہی تھی تو اس کیلئے مسلمانوں کے مقدس دن کو ہی کیوں استعمال کیا گیا۔اگر پھانسی دینے کے لئے ایک دن عیدالاضحیٰ سے آگے پیچھے کر دیا جاتا تو کیا حرج تھا۔

دراصل یہ بات اب روز روشن کی طرح واضح ہو چکی ہے کہ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف اسلام دشمن قوتوں کی سازشیں عروج پر ہیں۔ یہ سازشیں مختلف انداز سے ہر میدان میں اور ہر محاذ پر جاری ہیں۔ان تمام سازشوں کا بنیادی مقصد مسلمانوں کے مورال کو تباہ کرنا' ان میں انتشار پھیلانا اور اسلامی تہذیب و ثقافت کو ختم کرنا ہے۔ عالمی سامراج صدام کی پھانسی کے زمان و مکاں کا یقین کر کے اس کے مناظر کو دنیا کے ہر خاص و عام مسلم شہری تک پہنچا کر اس کو مسلم امہ کی بے حسی کا یقین دلانا چاہتا تھا۔ حالانکہ عراقی قوانین کے مطابق کسی بھی مجرم کو حج اور عیدین کے ایام میں سزائے موت نہیں دی جاسکتی۔ ادھر امریکہ کے کٹھ پتلی ٹی وی چینل نے بھی وقت سے پہلے اسلام دشمن طاقتوں کی خواہشات کا اظہار کر دیا تھا۔صدام حسین کی پھانسی کی ویڈیو کلپ چلنے سے قبل ہی سی این این کے تبصرہ نگاروں نے پھانسی کے مناظر سے متعلق بتاتے ہوئے کہا تھا کہ صدام حسین پھانسی کے وقت نیم بے ہوشی کے عالم میں تھے جبکہ ان کی ٹانگیں خوف کے باعث کانپ رہی تھیں لیکن چند منٹوں کے بعد جب ویڈیو کلپ سامنے آئی تو معاملہ بالکل اس کے برعکس نکلا۔ ویڈیو کلپ چلاتے وقت بھی امریکی "عظیم" دماغوں کو اندازہ نہیں تھا کہ ان ہتھکنڈوں سے مسلمانوں کے حوصلے پست کئے جاسکتے ہیں نہ ان کی گردنیں جھکائی جاسکتی ہیں۔ تاہم یہ واقعہ ان مسلم حکمرانوں کے لئے ایک درس ضرور ہے جو ہمیشہ امریکی مفادات کے تحت کٹھ پتلی کے طور پر کام کر رہے ہیں۔

بشکریہ (طارق مسعود)



صدام کا ذکر صدیوں تک رہے گا

بالعموم یہی ہوتا آیا ہے اور اب بھی شاید ایسا ہی ہوگا کہ مردانہ وار پھانسی پر چڑھ جانے والے صدام حسین کا ذکر ایک عرصہ تک زبانوں پر رہے گا، پھر وہ رفتہ رفتہ سینوں میں اتر جائے گا اور سینوں کو دہکاتا ہوا تاریخ کا ایک حصہ بن کر رہ جائے گا۔ ہمارے ہاں ایسا ہی ہوتا ہے لیکن عراقی قوم بہت سخت جان قوم ہے۔ اس کی سخت جانی کا ایک نظارہ ہم امریکی قابض فوجوں کے خلاف اس کی مسلسل مزاحمت کی صورت میں دیکھ رہے ہیں۔ عراق کرب و بلا کی کئی منزلوں سے گزرا ہے۔ یہاں آباد قوم نے اتنا کچھ دیکھا ہے کہ شاید ہی دنیا کی کوئی دوسری قوم اس کی ہمسری کا دعویٰ کر سکے۔ کئی بار تاریخی تباہیوں سے گزرنے والی یہ قوم زندہ رہنے کی ضد سے کبھی باز نہیں آئی۔ اس کی پشت پر اسکی سات ہزار برسوں کی تاریخ ہے۔ کامیابیوں اور ناکامیوں، آبادیوں اور بربادیوں کی تاریخ۔ اسی سرزمین پر حضرت ابراہیمؑ کو آگ میں ڈالا گیا اور اسی سرزمین پر ہلاکو اور تیمور نے اس کی تاریخ کو بدل دینے کی کوشش کی لیکن تاریخ کی ان کٹھالیوں سے گزرنے والی یہ قوم اپنا وجود برقرار رکھنے میں کامیاب رہی اور آج ایک اور ہلاکو اور تیمور کے مقابلے میں سینہ تان کر کھڑی ہے۔ صدام کی پھانسی نے اسے ایک نئی زندگی عطا کر دی ہے۔ ہلاکو اور تیمور بھی کبھی عراق کے مقابلے میں اتنے ہی طاقت ور تھے جتنا آج امریکہ ہے، اس لئے اپنے سے بہت بڑی طاقت کے ساتھ نبرد آزما ہونا عراقیوں کے لئے کوئی نئی بات نہیں ہے، اب تو اس کی فوج باقی نہیں رہی لیکن جب وہ موجود تھی تو اس نے اسرائیل کے خلاف عربوں کی شکست کے بعد بغداد میں واپس داخل ہونے سے انکار کر دیا تھا۔ وہ شکست کا داغ لے کر اپنے دارالحکومت میں نہیں آنا چاہتی تھی۔

دنیا نے یہ نظارہ بھی پہلی بار عراق میں دیکھا کہ پھانسی دینے والوں نے نقاب پہن رکھے تھے اور پھانسی پانے والا کھلے سر اور منہ سے تھا حالانکہ تارا مسیح کبھی اپنا سر منہ ڈھکا نہیں کرتے اور پھانسی پانے والے کا سر منہ ہمیشہ سرپوش میں چھپا دیا جاتا ہے یہاں سب کچھ الٹ ہوا اور صدام جو کبھی سیکولر بلکہ ایک ملحد سمجھا جاتا تھا، اپنے آخری وقت میں ایک مجاہد مسلمان بن کر سامنے آیا جس کے ہاتھ میں کلام پاک اور زبان پر اللہ اکبر اور کلمہ طیبہ کا ورد تھا۔ یہ نعرہ اور کلمہ اس کا بیان نزعی تھا جو ہمیشہ سچ تصور کیا جاتا ہے۔ عراق پر قابض امریکیوں نے ضیاء الحق کو مار دینے کے بعد ایک رپورٹ پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا تھا، نہ معلوم کیا بات ہے کہ بھلے چنگے مسلمان جب پچاس برس سے اوپر عمر تک پہنچتے ہیں تو کچھ اور ہو جاتے ہیں اور کسی اور کی ماننے لگتے ہیں، ہماری نہیں سنتے۔ امریکیوں کو معلوم نہیں اور نہ ہی ان کو معلوم ہو سکتا ہے کہ مسلمان خواہ وہ جوانی میں امریکی صفت بھی دکھائی دے، اس کے دل سے دوسری زندگی اور قیامت کا تصور کبھی محو نہیں ہو سکتا چنانچہ جب وہ عمر کے دوسرے حصے میں داخل ہوتا ہے تو پھر اپنی عاقبت کا تصور اس پر حاوی ہو جاتا ہے۔ وہ دوسری اور ابدی زندگی کے اسباب فراہم کرنا شروع کر دیتا ہے جہاں سزا اور جزا دونوں اسے صاف صاف دکھائی دینے لگ جاتی ہیں۔ فریضہ حج ادا کرنے والوں کی عمریں دیکھیں جو اپنی عمر کے آخری اور کمزور حصے میں اس پرمشقت فریضہ پر خوشی خوشی روانہ ہو جاتے

ہیں۔ عاقبت کا یہ بھرپور تصور اس طرح کسی دوسرے مذہب میں موجود نہیں ہے۔ مسلمانوں کے حالات کا مطالعہ کرنے والے دانشوروں کا کہنا ہے کہ جو قوم ابدی زندگی مرنے کے بعد تصور کرتی ہو اور موجودہ زندگی کو عارضی اور ایک وقتی آزمائش تصور کرتی ہو وہ اس دنیا میں ترقی کیسے کر سکتی ہے۔ اس کی نگاہ تو کسی اور زندگی پر رہتی ہے۔ سنگاپور کو ترقی کی معراج پر پہنچا دینے والے وزیر اعظم لی نے ایک بار پاکستان کے دورے پر یہی بات کہی تھی جب مسلمان ملکوں اور پاکستان کی ترقی کے بارے میں ان سے مشورہ طلب کیا گیا تو انہوں نے جواب میں کہا کہ جو قوم اس دنیا کی زندگی کو عارضی سمجھتی ہو وہ اس دنیا میں ترقی کیسے کر سکتی ہے۔ یہ بات ایسی درست نہیں ہے، ہزار برس تک دنیا کی سپر پاور رہنے کا ریکارڈ رکھنے والی قوم کی پسماندگی اس کا مقدر نہیں ہے اور نہ ہی ترقی میں کوئی عقیدہ حائل ہے، اس کے اسباب دوسرے ہیں جو اس وقت موضوع بحث نہیں ہیں۔ بات یہ ہے کہ صدام حسین امریکیوں کے قبول عمر کے اس حصے میں داخل ہو کر بدل گیا اور ایسا بدلا کہ اس نے موت کی آنکھوں میں محاورتاً نہیں حقیقتاً آنکھیں ڈال کر اس کا سامنا کیا کیونکہ وہ مر نہیں رہا تھا کسی ابدی زندگی کے سفر پر روانہ ہو رہا تھا اور کلام پاک کا ایک نسخہ اور کلمہ طیبہ کا ورد اس کا زاد راہ تھا۔ ایسے صدام حسین کو کون پھانسی پر لٹکا سکتا ہے اور کون اس کی زندگی ختم کر سکتا ہے۔ یہ سب ظاہر کی باتیں ہیں کوئی بھی مسلمان مرتا نہیں، کسی دوسری زندگی میں داخل ہوتا ہے جو ابدی زندگی ہے۔ یہ جو خودکش حملہ آور ہیں یہ کون لوگ ہیں کیا وہ کسی زندگی کو ختم کر دینے والے ہیں یا کسی دوسری زندگی کی طرف روانہ ہونے والے ہیں۔ جہاد جو مسلمانوں کی طاقت کا اصل اسلحہ اور پیغام ہے، وہ کسی مسلمان کے غازی یا شہید ہونے کی نوید سناتا ہے۔ اس وقت امریکہ کی سرپرستی میں مغربی دنیا کی سرتوڑ کوشش ہے کہ مسلمانوں کے دلوں سے جہاد کا جذبہ کسی طرح ختم کیا جائے۔ ہم پاکستانی مغرب کی یہی تجربہ گاہ بنے ہوئے ہیں اور ہمارے نصاب تعلیم سے جہاد ایسے اسباق اور تعلیمات کو ختم کیا جا رہا ہے تاکہ ہماری نئی نسل کلیتاً اسی دنیا کی ہو کر رہ جائے اور اس ناقابل تسخیر طاقت سے بیگانہ ہو جائے جس کا توڑ مغرب کی طاقتوں کے پاس نہیں ہے، وہ اسلحہ کی طاقت سے عمارتیں تباہ کر سکتی ہیں، ملکوں کی صورتیں بدل سکتی ہیں، انہیں تورا بورا بنا سکتی ہیں اور تورا بوروں کو شکست دے سکتی ہیں، ان کے دل و دماغ کو فتح کر سکتی ہیں، انہیں ہراساں اور خوفزدہ کر سکتی ہیں، انہیں ان کے محفوظ محلوں اور بے پناہ سیکورٹیوں میں دھکیل سکتی ہیں، ان کے دلوں کو خوف اور ڈر سے بھر سکتی ہیں مگر جہاد پر ایمان رکھنے والوں کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتیں بلکہ الٹا

ے بڑھتا ہے ذوق جرم یہاں ہر اک سزا کے بعد

اس لئے صدام حسین ہو یا اس قبیلے کا کوئی اور فرد وہ موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اللہ اکبر کا نعرہ ہی لگا سکتا ہے۔ واشنگٹن نہیں بھاگ سکتا۔ آج صدام اس دنیا میں نہیں ہے اس کا وجود خاکی ختم ہو چکا ہے مگر اس کے وجود سے جو ایک نیا وجود سامنے آیا ہے اس کا جمال دنیا بھر کے مسلمانوں اور عراقی قوم کو جگمگاتا رہے گا۔ وہ ایک آمر گنہگار شخص خوش نصیب تھا کہ اسے پھانسی کی صورت میں ایک ایسی شاندار زندگی مل گئی جو کبھی ختم نہ ہو گی اور ایک مثال بن کر مسلمانوں کے دلوں میں زندہ رہے گی، انہیں حرارت بخشتی رہے گی، انہیں زندہ رکھے گی۔

بشکریہ (عبدالقادر حسن)

خوف کے سائے میں نئے سال کا آغاز

نئے سال کا پہلا دن بھی پرانے سال کے دنوں جیسا ہوتا ہے۔ مگر اس کے باوجود نہ جانے کیوں اس میں بہت کچھ نیا نیا لگتا ہے۔ صرف یہی نہیں کہ اب ہر تحریر کے ساتھ 2007ء لکھنا پڑے گا، بلکہ یہ بھی ہے کہ دنیا اپنے ماضی سے ہٹ کر ایک نئے زمانے میں داخل ہونا چاہے گی۔ مگر نئے سال سے صرف دو روز پہلے صدام حسین کو پھانسی دینے والوں نے دنیا کو ایک نئے خوف میں مبتلا کر دیا ہے جو شاید 2007ء کو اپنی گرفت میں لے کر اس کی خوب صورتیوں کو پروان نہیں چڑھنے دے گا۔

پچھلی دو دہائیوں پر غور کیا جائے، تو ہر آنے والا سال ایک سے بڑھ کر ایک ثابت ہوا ہے۔ کہنے کو سائنسی ترقی جاری ہے، دنیا مہذب ہو رہی ہے، انسان زندگی کی نئی رفعتوں سے ہمکنار ہو رہا ہے مگر حقیقت اس کے برعکس ہے۔ دنیا کشادگی کے بجائے سکڑتی جا رہی ہے۔ خوف بڑھتے جا رہے ہیں۔ خطرات نے انسانیت کو گرفت میں لے رکھا ہے اور دنیا دہشت گردی اور سیکورٹی کے دائروں میں بند ہو چکی ہے۔ یہ کیسی دنیا ہے کہ جہاں قدم قدم پر نفرتوں، دشمنیوں اور رنگ و نسل، نیز جغرافیائی حد بندیوں نے انسانیت کو تنگنائے میں پھنسا دیا ہے۔ جہاں ''جس کی لاٹھی اسی کی بھینس'' کا نظریہ دستور العمل بن چکا ہے اور طاقتوروں کے آگے انسانیت کراہ رہی ہے، مگر انہیں ذرہ بھر رحم نہیں آتا۔

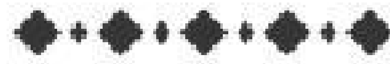
جب سے دنیا میں نائن الیون کا ڈرامہ رچایا گیا ہے، ہر آنے والا سال کچھ اور پابندیاں، کچھ اور مشکلات ساتھ لے کر آتا ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے 2007ء پر نئے خطرات منڈلا رہے ہیں۔ ایران کے ساتھ امریکہ اس سال کیا سلوک کرتا ہے؟ 2006ء جاتے جاتے یہ اہم سوال چھوڑ گیا ہے۔ سال کے آخری دنوں میں صدام حسین کو پھانسی دے کر امریکہ نے واضح کر دیا ہے کہ 2007ء کے لئے اس کے عزائم کچھ اچھے نہیں ہیں۔ مخالفین کو عبرت کا نشان بنانا شاید صدر بش کی حکمت عملی ہے۔ ایسا نہ ہوتا تو وہ صدام حسین کو پھانسی دینے کا فیصلہ نہ کرتے۔ مگر ایسے فیصلوں کا نتیجہ وہ نہیں نکلتا، جس کی فیصلہ کرنے والے امید رکھتے ہیں۔ صدام حسین عراقی عوام کے لئے زیرو ہو چکے تھے لیکن امریکہ نے انہیں پھانسی دلوا کر ہیرو بنا دیا ہے۔ ایسا ہیرو جو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے زندگی پا جاتا ہے۔ صدام حسین کو کردوں کے قتل عام پر پھانسی دی گئی ہے حالانکہ عراق پر قبضے کے بعد اتحادی فوجیں لاکھوں عراقیوں کا جو قتل عام کر چکی ہیں، اس کے مقابلے میں صدام حسین کا جرم بہت چھوٹا نظر آتا ہے۔

یہ مسئلہ بہت دیر تک حل طلب رہے گا کہ صدام حسین کو پھانسی دینے کے لئے 30 دسمبر کا دن ہی کیوں منتخب کیا گیا۔ پھانسی اس سے پہلے بھی ہو سکتی تھی اور اس کے بعد بھی۔ پھر کیا ضرورت تھی کہ دنیا کو نئے سال کے موقع پر ایک نئے خوف میں مبتلا کر دیا گیا۔ اس بارے میں ایک خیال تو یہ ہے کہ صدر بش امریکی عوام کو ہیپی نیو ایئر کا ایک انوکھا گفٹ دینا چاہتے تھے۔ 30 دسمبر کا اس لئے دن منتخب کیا گیا کہ امریکی عوام کو زیادہ جوش و خروش اور احساس تحفظ کے ساتھ نیو ایئر نائٹ منانے کا موقع فراہم کیا جائے۔ دوسری وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ امریکی تھنک ٹینک دنیا کو یہ پیغام دینا چاہتے

تھے کہ روئے زمین پر کسی امریکہ مخالف کی کوئی جگہ نہیں اور 2007ء میں اس حکمت عملی پر زیادہ شدت سے عمل کیا جائے گا۔ تیسری وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ عراقی عوام کو اس پھانسی کے ذریعے یہ پیغام دیا جائے کہ وہ ماضی کو دفن کر دیں، وہ کبھی واپس نہیں آئے گا۔ نئے زمینی حقائق کو تسلیم کر لیں نئے سال میں اپنی زندگیوں کو امریکہ کے ڈیزائن کردہ منشور کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کریں اور اپنی آزادی و اقتدار اعلیٰ کو بھول جائیں۔ صدام حسین کو عجلت میں پھانسی دینے کی وجہ چاہے کچھ بھی ہو، یہ کہنا مشکل ہے کہ مردہ صدام حسین زندہ صدام حسین سے کم خطرناک ثابت ہوگا؟ یہ تو 2007ء کے 365 دن رات بتائیں گے کہ صدام حسین قبر میں دفن ہو جاتا ہے یا اس کی روح بغداد کے تخت پر بیٹھ کر عراقی عوام کے دلوں پر راج کرتی ہے؟ صدام حسین کو پھانسی دے کر اس موہوم امید کو ختم کرنے کی کوشش کی گئی ہے، جو اتحادی فوجوں کے مقابلے میں صدام حسین کے دور کی واپسی کے حوالے سے عراقی عوام کے دلوں میں بے چینی کی آگ صدام کا دور واپس لانے کے لئے نہیں بلکہ عراق کی آزادی کے لئے ہے، جو اب مزید بھڑک اٹھے گی۔

صدام حسین کی پھانسی اپنے پیچھے بہت سے سوال چھوڑ گئی ہے۔ سب سے اہم سوال تو یہی ہے کہ آیا کسی غاصب اور ناجائز قابض کو یہ حق دیا جا سکتا ہے کہ وہ کسی آزاد ملک کے صدر کو انصاف کے نام پر معزول کر کے پھانسی پر چڑھا دے۔ کیا ایسا جارح جو کہ اپنا تسلط قائم کرنے کے لئے لاکھوں انسانوں کو موت کی نیند سلا دے۔ اخلاقی جواز رکھتا ہے۔ انصاف کا ترازو پکڑ کر اپنے ظالمانہ فیصلوں کو عدل و انصاف کا نام دے۔ دنیا کا کوئی بھی مہذب معاشرہ صدام حسین کی پھانسی کو عدل و انصاف کی فتح قرار دیا جائے گا کہ جس سے اڑنے والی گرد نے نئے سال کو بری طرح آلودہ کر دیا ہے۔

بشکریہ (نسیم شاہد)



گریبان چاک

شیخ صاحب غمزدہ تھے، ان کی آواز میں تھرتھراہٹ اور آنکھوں میں آنسو تھے، وہ بار بار افسوس سے گردن ہلاتے تھے اور ان کے منہ سے سرد آہیں نکلتی تھیں، ان کا خیال تھا امریکہ نے عید کے دن صدام حسین کو پھانسی دے کر پورے عالم اسلام کی بے عزتی کی، ان کا کہنا تھا یہ پھانسی محض پھانسی نہیں، یہ مسلمانوں کی غیرت پر حملہ ہے اور ہمیں اس حملے کا بھرپور جواب دینا چاہیے، میں نے ان سے عرض کیا ''صدام حسین کوئی سلطان صلاح الدین ایوبی، محمد بن قاسم یا محمود غزنوی نہیں تھا، وہ ایک آمر تھا اور اس نے 25 برس تک عراق میں امریکی مفادات کی کاشتکاری کی تھی، اس نے اپنے ہاتھوں سے ہزاروں، لاکھوں مسلمانوں کے حقوق کا گلہ گھونٹا تھا اور اس نے ملک میں بیسیوں اجتماعی قبریں بنائیں تھیں'' شیخ صاحب کو مجھ سے اختلاف تھا، ان کا فرمانا تھا ''صدام حسین کتنا ہی ظالم اور جابر سہی مگر وہ عالم اسلام کا ہیرو تھا، صدام حسین سے 58 اسلامی ممالک کے کروڑوں لوگوں کی ہمدردیاں وابستہ تھیں لہٰذا امریکہ کو اس سے رعایت برتنی چاہیے تھی، اگر یہ ممکن نہیں تھا تو بھی صدام حسین کو کم از کم اس دن پھانسی نہ دی جاتی جس دن پچاس لاکھ مسلمان حج ادا کر رہے تھے اور ایک ارب 46 کروڑ مسلمان عیدالاضحیٰ منا رہے تھے''

میں نے ان سے پوچھا ''امریکہ ہماری توہین کر چکا ہے لہٰذا ہمیں اب کیا کرنا چاہیے'' شیخ صاحب نے میز پر مکہ مارا اور اونچی آواز میں بولے ''ہمیں اس اقدام کے خلاف پوری دنیا میں احتجاج کرنا چاہیے، ہمیں امریکہ مردہ باد کے نعرے لگانے چاہئیں اور ہمیں جلوس نکالنے چاہئیں'' میں نے ان کی اس معصومانہ خواہش پر قہقہہ لگایا، انہوں نے مجھے کھا جانے والی نظروں سے دیکھا، میں نے فائل میں سے اخبار کا ایک صفحہ نکالا اور وہ صفحہ ان کے سامنے پھیلا دیا، اخبار کے عین درمیان میں پانچ چھ تصاویر چھپی تھیں، ایک تصویر میں پولیس کانسٹیبل کے سامنے پانچ چھ سال کی ایک بچی ہاتھ جوڑ کر کھڑی تھی، بچی کی آنکھوں میں آنسو اور چہرے پر بے چارگی تھی، دوسری تصویر میں سات آٹھ پولیس کانسٹیبل پندرہ سولہ سال کے ایک بچے پر ڈنڈے برسا رہے تھے، بچے کی شلوار اتر کر اس کے جوتوں پر پڑی تھی، قمیض پھٹ چکی تھی اور وہ سرِ عام الف ننگا کھڑا تھا، تیسری تصویر میں لیڈی کانسٹیبل بے شمار خواتین کو ہانک کر لے جا رہی تھیں اور چوتھی تصویر میں پولیس بے شمار بچوں، خواتین اور مردوں کو سڑک پر گھسیٹ رہی تھی، میں نے ان تصویروں پر انگلی رکھی اور شیخ صاحب سے پوچھا ''آپ جانتے ہیں یہ کس ملک کے منظر ہیں'' انہوں نے انکار میں سر ہلا دیا، میں نے عرض کیا ''یہ پاکستان کی راولپنڈی کا مال روڈ ہے، یہ 28 دسمبر کا دن تھا اور یہ حج اکبر سے

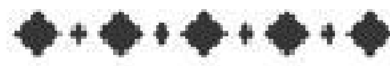
صرف ایک دن پہلے کے منظر ہیں" شیخ صاحب حیرت سے میری طرف دیکھنے لگے، میں نے عرض کیا "یہ پاکستان کے انتہائی مظلوم لوگ ہیں یہ وہ 106 خاندان ہیں جن کے مرد پچھلے تین چار برسوں سے غائب ہیں، یہ بچی جو ہاتھ باندھ کر پولیس کانسٹیبل کے سامنے کھڑی ہے اس کا والد تین برس سے غائب ہے ، یہ بچہ جس کی شلوار اس کے جوتوں پر پڑی ہے اس کا والد مسعود خواجہ دو اڑھائی سال سے غائب ہے اور یہ خاتون جسے لیڈی کانسٹیبل ہانک کرلے جا رہی ہیں اس کا خاوند پچھلے تین سال سے گھر نہیں آیا"

شیخ صاحب خاموشی سے سنتے رہے، میں نے عرض کیا "سر ان 106 خاندانوں کا خیال ہے ان کے خاوند، بھائی اور والد ایجنسیوں کی حراست میں ہیں، انہیں خفیہ والوں نے اٹھایا اور کسی سیف ہاؤس میں پھینک دیا، یہ لوگ پچھلے تین چار برسوں سے اپنے پیاروں کی راہ دیکھ رہے ہیں، ان لوگوں نے پولیس سے لے کر عدالت تک ہر دروازے پر دستک دی لیکن انہیں کسی دروازے سے انصاف نہیں ملا، پاکستان کے کسی ادارے اور کسی شخصیت نے ان کے سر پر ہاتھ نہیں رکھا، کسی نے ان کے آنسو نہیں پونچھے لہٰذا ان لوگوں نے جمعرات 28 دسمبر کو جی ایچ کیو کے سامنے مظاہرہ کرنے کا فیصلہ کیا، یہ لوگ مری روڈ پر فلیش مین ہوٹل کے چوک پر پہنچے تو پولیس نے ان کا راستہ روک لیا، انہوں نے آگے بڑھنے کی کوشش کی اور پولیس نے ان پر لاٹھی چارج شروع کر دیا، اس لاٹھی چارج کے دوران محمد بن مسعود کی شلوار اتر گئی جبکہ لاٹھی چارج اور دھکم پیل میں ایک بچی اور ایک خاتون بے ہوش ہوگئی، خواتین کے سروں سے سر عام چادریں گریں اور ان کی بے پردگی ہوئی" شیخ صاحب خاموش رہے، میں نے عرض کیا "آپ جانتے ہیں گھروں سے غائب ہونے والے یہ لوگ کون ہیں اور ان کا جرم کیا تھا" وہ چپ چاپ سنتے رہے، میں نے عرض کیا "یہ لوگ باریش اور صوم وصلوٰۃ کے پابند تھے اور صدر بش کو ان کے ارادوں سے خطرے کی بو آتی تھی لہٰذا یہ لوگ گھروں سے غائب ہوئے اور اس کے بعد کسی کو ان کی خبر نہ ملی ، ان کے گھر والے ان کی یاد میں روز جیتے اور روز مرتے ہیں ۔ یہ لوگ جب عدالتوں کے دروازے بجا بجا کر تھک گئے تو انہوں نے پرامن احتجاج کا راستہ چنا اور آپ اس راستے کا انجام ان تصویروں سے دیکھ لیجئے" شیخ صاحب نے ہاں میں گردن ہلائی اور شرمندہ سی مسکراہٹ کے ساتھ بولے "لیکن ان کا صدام حسین کی پھانسی کے ساتھ کیا تعلق" میں نے اخبار لپیٹ کر ایک طرف رکھا اور سیدھا ہو کر جواب دیا "ان لوگوں کا صدام حسین کی پھانسی کے ساتھ بڑا گہرا تعلق ہے، امریکہ عالم اسلام کا دشمن ہے، ہم صدام حسین کی غیر اخلاقی پھانسی پر امریکہ کے سامنے احتجاج کرنا چاہتے ہیں، ہم کہتے ہیں امریکہ کو عید کے دن صدام حسین کو پھانسی نہیں دینی چاہیے تھی ۔ درست، لیکن سوال پیدا ہوتا ہے ہم غیر مسلم امریکہ کے غیر اخلاقی اقدام کی مذمت کرنا چاہتے ہیں مگر ہمارے اپنے اسلامی ملک کی اخلاقی اقدار کی کیا حالت ہے؟ ہمارے اسلامی ملک سے 106 لوگ داڑھی رکھنے، نماز پڑھنے اور اسلامی نشاۃ ثانیہ کے خواب دیکھنے کے جرم میں اٹھا لیے گئے اور ہم تین چار برس بعد بھی ان کے اہل خانہ کو احتجاج کا حق نہیں دے رہے ۔ ہم سڑک پر ان کے بچوں کی شلواریں اتار رہے ہیں، ان کی ٹانگوں ان کی پیٹھوں پر ڈنڈے برسا رہے ہیں اور پورے ملک میں خاموشی ہے۔

وہ خاموشی سے سنتے رہے ۔ میں نے عرض کیا "جس ملک میں 106 لوگ چپ چاپ اٹھا لیے گئے ہوں اور ان لوگوں کے لواحقین کو کسی عدالت، کسی ادارے سے انصاف نہ ملا ہو اس ملک کے لوگوں کو صدام حسین کی پھانسی پر احتجاج کا کوئی حق نہیں ۔ جس ملک میں سر عام مظلوموں کی

شلواریں اترتی ہوں اور جس میں انصاف کے لیے سڑکوں پر نکلنے والے خاندانوں کو ڈنڈے اور گالیاں ملتی ہوں اس ملک کے لوگوں کو صدام حسین کی پھانسی پر احتجاج کا کوئی حق نہیں اور جس ملک میں آپ جیسے باضمیر لوگ 106 خاندانوں پر ہونے والے ظلم پر خاموش ہوں اس ملک کے لوگوں کو سمندر پار پھانسی پانے والے صدام حسین کا غم منانے کا کوئی حق نہیں'' شیخ صاحب خاموش رہے۔ میں نے عرض کیا'' جناب صرف انصاف دینے والوں کو انصاف طلب کرنا چاہیے، گھر میں احتجاج کرنے والوں کو گھر سے باہر احتجاج کرنا چاہیے اور گھر میں زیادتی کے خلاف ہاتھ اٹھانے والوں کو باہر کی زیادتی پر آواز بلند کرنی چاہیے، ہمیں یہ تو نظر آ رہا ہے امریکہ نے عیدالاضحیٰ کے دن صدام حسین کو پھانسی دے کر شعائر اسلام کی توہین کی لیکن ہمیں اپنی سڑکوں پر مسلمانوں کے ہاتھوں مسلمان عورتوں، بچوں اور بزرگوں کی توہین اور ذلت دکھائی نہیں دیتی، ہمیں صدام حسین تو نظر آتا ہے کہ لیکن ہمیں محمد بن مسعود، عائشہ مسعود اور آمنہ مسعود پر ہونے والا ظلم دکھائی نہیں دیتا، ہمیں عراق کے آنسو تو رات رات بھر سونے نہیں دیتے لیکن ہمیں وہ مسعود جنجوعہ نظر نہیں آتا جو دو اڑھائی برس پہلے گھر سے نکلا اور اس کے بعد واپس نہیں آیا'' میں جذباتی ہو گیا، شیخ صاحب خاموشی سے سنتے رہے، میں نے عرض کیا'' یقین کیجئے جب تک ہم آمنہ مسعود جیسی مظلوم عورتوں کو انصاف نہیں دیں گے ہم عالمی سطح پر انصاف نہیں پائیں گے۔ ہم جب تک خود حج اور عیدالاضحیٰ کا احترام نہیں کریں گے باہر کی دنیا ہماری عیدوں اور ہمارے حجوں کی عزت نہیں کرے گی اور جب تک ہم محمد بن مسعود کی عزت کو پھانسی سے نہیں اتاریں گے اس وقت تک ہمارے صدام حسین اسی طرح پھانسیوں پر لٹکتے رہیں گے، ہم اسی طرح پوری دنیا میں بے عزت ہوتے رہیں گے۔

بشکریہ (جاوید چودھری)



ایک خون آلود دلدل

صدام حسین کی پھانسی ایک بہت بڑا المیہ ہے اس حوالے سے نہیں کہ صدام کوئی بہت بڑا انسان تھا یا یہ کہ وہ عوام دوست تھا یا یہ کہ وہ کوئی سامراج دشمن رہنما تھا۔ جس نے اہلِ عرب کی آزادی اور خودمختاری کے لئے کوئی بہت بڑی جنگ لڑی تھی۔ صدام بنیادی طور پر ایک خوفزدہ آدمی تھا اس کا خوف لوگوں نے 1999ء میں بھی دیکھا جب بش سینئر نے عراق کا چپہ چپہ ادھیڑ دیا تھا اس کے بمبار عراق کے شہروں اور دیہات کے شہری علاقوں کو نشانہ بنا رہے تھے اور صدام کا کوئی جہاز ان کا راستہ روکنے والا نہ تھا۔ لوگوں نے اس کا خوف زدہ چہرہ اس وقت بھی دیکھا تھا جب اسرائیل نے عراق کے ایٹمی ری ایکٹر کو تباہ کیا اور صدام کوئی جوابی کارروائی نہ کر سکا اور صدام کو خوفزدہ اس وقت بھی دیکھا گیا جب امریکہ کے ایک صدر نے عراق پر نیٹو کے تعاون سے حملہ کر دیا جسے اس نے اتحادی فوج قرار دیا۔ صدام نے نہ صرف اس فوج کا مقابلہ نہ کیا بلکہ جنگ کے میدان سے ہی راہ فرار حاصل کر لی جب عراق کے شہر بابل اور نینوا کی تہذیب کے امین کھنڈر بن گئے تو وہ ایک تہہ خانے سے برآمد ہو گیا اس حالت میں کہ وہ ایک جنونی ذہنی مریض نظر آتا تھا اور پھر اس نے گرفتاری کے بعد ایک نیا جنم لے لیا۔ جس نے اپنے ملک کے عوام پر ظلم وستم کے ہر انداز کو آزمایا تھا۔ اچانک بہادر بن گیا۔ آمروں کے بارے میں یہ تاریخی حقیقت ہے کہ وہ بزدل ہوتے ہیں وہ اپنے آپ کو بہادر ثابت کرنے کے لئے بہت افسانے تراشتے ہیں لیکن وہ دراصل اپنے ہی عوام سے خوفزدہ رہتے ہیں۔ ایسے بھی کیا حکمران ہیں کہ جنہیں ہمیشہ اندر سے خطرہ رہتا ہے۔ صدام بھی انہی حکمرانوں میں سے تھا جنہیں ہمیشہ اندر سے خطرہ ہوتا ہے۔ اب اس کا کیا کیا جائے کہ وہ باہر سے پھیلائے ہوئے جال میں گرفتار ہوا اور اب باہر والے نئی کہانیاں تراش رہے ہیں نئے افسانے تحریر ہو رہے ہیں۔ ایک امریکی تجزیہ نگار کا کہنا ہے کہ امریکی حکومت نے طالبانی اور مالکی کو پھانسی موخر کرنے کا کہا امریکی حکمرانوں کا خیال تھا کہ عید کے روزے صدام کی پھانسی منفی ردعمل پیدا کرے گی اور عید کے روز کسی کی جان لینا عرب روایت کے بھی خلاف ہے لیکن عراق کے دیدہ دلیر ''کٹھ پتلی'' حکمرانوں نے امریکیوں کی ایک نہیں سنی کیونکہ عراق کے شیعہ حکمران ایسا کرنے کے لئے بے چین تھے جب صدام کو تختہ دار کی طرف لے جایا جا رہا تھا تو ایک گارڈ نے ''مقتدا مقتدا'' کے نعرے لگائے ''مقتدا الصدر عراق کے شیعہ رہنما جن پر سینکڑوں سنیوں کا قتل کرنے کا الزام عائد کیا جاتا ہے'' اور صدام سے کہا اب جہنم میں جاء جس پر صدام نے تھوک دیا اور کہا میں جنت میں جاؤنگا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ صدام کی موت پر ایران نے اطمینان کا اظہار کیا ہے۔ ایران کے عوام پر صدام حسین نے جس طرح جنگ مسلط کی تھی اور

جس طرح ایران کے لاکھوں شہری اس چھ سالہ جنگ کا شکار ہوئے تھے وہ اپنی جگہ ایک حقیقت ہے لیکن شاید عراق پر امریکی حملے اور امریکی قبضہ کے دوران صدام حسین کی موت پر ایرانی رہنما اگر احتیاط کا مظاہرہ کر لیتے تو بہتر ہوتا بہرحال یہ معاملہ اہل ایران ہی بہتر جانتے ہیں اور جو لوگ ایران کی تہذیب اور ان کی روایات اور عوامی ردعمل سے واقف ہیں ان کے لئے ایران کا ردعمل حیرت کا باعث نہیں ہوگا۔ لیکن اصل مسئلہ کچھ اور ہے امریکی میڈیا نے صدام حسین کی پھانسی کی جو تصویر دکھانی شروع کی ہے وہ انتہائی خطرناک ہے اور امریکی میڈیا کو جاننے والے یہ جانتے ہیں کہ دنیا میں امریکہ اور بھارت کا میڈیا ازخود اپنے ریاستی مفادات کے تحفظ کو اولیت دیتا ہے اس کے لئے جائز و ناجائز ہونا ایک ضمنی معاملہ ہوتا ہے امریکی میڈیا نے عراق میں سنی اور شیعہ تضاد کو ابھارنے کے کام کا آغاز کر دیا ہے۔ امریکیوں کا خیال ہے کہ اگر عراق میں شیعہ سنی تضاد خوفناک قتل و غارت کی شکل اختیار کر جائے تو عرب اور ایشیا کے سنی علماء کو ایران کے خلاف آسانی سے استعمال کیا جا سکتا ہے اور اگر امریکہ کا آئندہ شکار ایران ہے تو اس حوالے سے ایران کو عالمِ اسلام سے تنہا کیا جا سکتا ہے۔ نہ صرف یہ بلکہ عراق کو تین حصوں میں تقسیم کر کے اور اس کی قومی وحدت کو پارہ پارہ کر کے عراق کے تیل کے وسائل پر طویل عرصے کے لئے قبضہ کے بنیادی مقصد کو بھی حاصل کیا جا سکتا ہے لیکن امریکہ کو یہ معلوم نہیں کہ تاریخ کا دھارا اب اس کے خلاف بہہ رہا ہے۔ افغانستان میں اس کی کٹھ پتلی حکومت ناکام و نامراد ہو چکی ہے عراق میں وہ ایک خون آلود دلدل میں پھنس چکا ہے۔ یورپی اتحادی اس سے منہ موڑ رہے ہیں۔ چند عوام دشمن مسلمان آمروں کی ہوس اقتدار تاریخ کا دھارا امریکہ کے حق میں موڑنے پر قادر نہیں امریکی اندازے اب اسی نتیجہ پر پہنچیں گے جس نتیجہ پر ویت نام کی جنگ کے بعد پہنچے تھے۔

بشکریہ (صدیق اظہر)

اس کو خبر نہیں کہ لہو بولتا بھی ہے

موت طبعی زندگی کے ختم ہو جانے کا نام ہے' ہر ذی روح کو موت کا ذائقہ چکھنا ہے' یوں سمجھ لیجئے کہ زندگی موت کی امانت ہے۔ انسان موت کے منہ میں بہرصورت جاتا ہے۔ کبھی وہ طبعی موت مرتا ہے' کبھی وباؤں مثلاً ہیضہ' طاعون' کینسر وغیرہ کے ذریعے وہ موت کی آغوش میں جاتا ہے' کبھی آفات سماوی مثلاً زلزلہ' سیلاب' طوفان وغیرہ انسان کی موت کا سبب بنتی ہیں۔ خودکشی کے ذریعے بھی انسان اپنی زندگی کا خاتمہ کرتا ہے۔ کبھی انسان ایسی راہوں کا مسافر بن جاتا ہے جہاں اسے نافرمانی' قانون کی خلاف ورزی اور سنگین جرائم کے ارتکاب کے باعث تختہ دار پر لٹکانا پڑتا ہے اس سنگین سزا کو سزائے موت کہا جاتا ہے یعنی ملکی قانون کے مطابق کسی شخص کو جان سے مار دینا۔

یہ بتانا مشکل ہے کہ دنیا میں سزائے موت کب سے رائج ہے مگر یہ ضرور ہے کہ انسان اور سزائے موت کا ساتھ چولی دامن کا ہے' انسان اپنی خواہشات اور مفادات کے لئے معمولی جرائم پر بھی موت کی سزا دیتا رہا ہے۔ دنیا کے مختلف ممالک میں یہ سزا مختلف طریقوں سے نافذ رہی جن میں ہاتھ پاؤں باندھ کر زندہ دفن کرنا' صلیب کشی (سولی پر لٹکانا) پیٹ چیر کر اعضاء نکال لینا' زہریلے اور وحشی جانوروں کے آگے ڈالنا' ہاتھی کے نوکیلے دانتوں کے ذریعے مارنا' ہاتھی کی سونڈ سے مارنا' ہاتھی کے پاؤں تلے مجرم کے سر کو کچل دینا' عہد حاضر میں سزائے موت کا ایک روایتی طریقہ پھانسی ہے۔ یہ طریقہ غیر متمدن اینگلوسیکسن اقوام میں صدیوں سے رائج تھا' برطانیہ میں اسے ہنری دوم نے بارہویں صدی میں اپنایا' بعدازاں انگریزوں نے سزائے موت کا یہی طریقہ اپنے مقبوضات خصوصاً جنوبی ایشیا میں رائج کیا' امریکا کی اکثر ریاستوں میں سزائے موت کے مجرموں کے جسم و جان کا رشتہ اسی طرح منقطع کیا جاتا تھا' گیس چیمبرز' گولی مارنے اور گلا گھونٹ کر بھی موت کی سزا دی جاتی رہی۔

گیلوز (Gallows) پھانسی دینے کا چوکھٹا۔ لکڑی کے دو کھمبے کچھ فاصلے پر گاڑ دیے جاتے ہیں جن کے اوپر کے سرے ایک شہتیر سے پیوستہ ہوتے ہیں دونوں کھمبوں کے درمیان ایک پختہ خانہ ہوتا ہے جس پر دو تختے رکھے ہوتے ہیں' یہ تختے کواڑ کی طرح گڑھے کے کناروں سے جکڑے ہوتے ہیں اور کواڑ ہی کی طرح ان کے اندرونی سرے ایک کنڈے سے بند ہوتے ہیں اوپر کے شہتیر کے عین وسط میں ایک کنڈا ہوتا ہے جس میں رسا بندھا ہوتا ہے۔ جب کسی ملزم کو پھانسی دینی ہوتی ہے تو اسے تختوں کے مقام اتصال پر کھڑا کر دیا جاتا ہے اور اس کے گلے میں مرکزی رسا باندھ کر گرہ دے دی جاتی ہے ملزم کے ہاتھ پیچھے کی طرف باندھ دیے جاتے ہیں' سر اور آنکھوں پر ٹوپی چڑھا دی جاتی ہے' اس کے بعد نچلے کواڑ کا پیرم

(لیور) کھینچ لیا جاتا ہے جس سے چھت کے کواڑ کھل کر نیچے کی طرف ڈھلک جاتے ہیں اور ملزم لٹک جاتا ہے' گردن کا منکا ٹوٹنے سے اس کی موت واقع ہوجاتی ہے۔ جب ملزم مرجاتا ہے تو اس کی لاش کو نیچے گڑھے میں اتار دیا جاتا ہے' جہاں ڈاکٹر اس کی موت کی تصدیق کرتا ہے۔ پھانسی دینے کے جو دوسرے طریقے مروج رہے ان میں ایک شارٹ ڈراپ ہے' جس میں سزا یافتہ فرد کی گردن میں پھندا ڈال کر اسے کسی گھوڑے یا کسی دوسری گاڑی کی پشت پر ڈال دیا جاتا پھر گاڑی کو حرکت دی جاتی جس سے آدمی رسی پر لٹکا رہ جاتا۔ 1850ء سے قبل پھانسی کا یہ سب سے مقبول ترین طریقہ تھا۔ اسٹینڈرڈ ڈراپ اس طریقے میں 4 سے 6 فٹ کے درمیان گرائے جانے کا عمل شامل ہے۔ اس کا استعمال انیسویں صدی میں شروع ہوا' اسے ہم شارٹ ڈراپ کا ترقی یافتہ طریقہ کہہ سکتے ہیں' لانگ ڈراپ 1872ء میں ولیم مارورڈ نے بطور سائنٹیفک ایڈوانسمنٹ متعارف کرایا' اس طریقے میں ہر ایک کو کسی طے شدہ فاصلے سے گرانے کی بجائے اس فرد کے وزن کو یہ معلوم کرنے کے لئے استعمال میں لایا جاتا ہے کہ رسی میں کتنا ڈھیلا پن ہے تاکہ گرائے جانے کا فاصلہ اتنا کافی ہو کہ گردن ٹوٹنے کی یقین دہانی ہوجائے۔ دورِ حاضر میں سزائے موت کے پھانسی کے علاوہ یہ تین طریقے مروج ہیں ان میں برقی کرسی (Electric chair)' فائرنگ اور مستقل انجکشن (کیمیاوی زہر کے ذریعے موت) شامل ہے۔

اس وقت سزائے موت کے حوالے سے دنیا کے ممالک 4 درجوں میں منقسم ہیں۔ 69 ممالک میں سزائے موت کا قانون پوری طرح نافذ ہے' 88 ممالک میں اسے ختم کر دیا گیا ہے' 11 ممالک میں عام حالات میں سزائے موت ممنوع مگر خاص حالات مثلاً جنگی جرائم میں اس کی اجازت ہے' 29 ممالک میں سزائے موت کا قانون نافذ ہے مگر اسے 10 سال تک موخر کیا جاسکتا ہے۔ دنیا میں قتل' غداری' جاسوسی' کرپشن' منشیات اور انسانی اسمگلنگ جیسے جرائم کی سزا موت ہے۔ دنیا کے زیادہ تر ممالک میں سزائے موت پھانسی کے ذریعے دیئے جانے کا طریقہ پسندیدہ ہے حیران کن امر یہ ہے کہ جہاں سزائے موت کا قانون لاگو ہے وہاں سزائے موت کی مخالفت ہورہی ہے اور جن ملکوں میں سزائے موت نہیں وہاں کے عوام سزائے موت کے حق میں ہیں۔ اعداد و شمار سے اندازہ ہوتا ہے کہ جنوبی یورپ اور لاطینی امریکا کو چھوڑ کر باقی ساری دنیا میں سزائے موت کی حمایت کی جاتی ہے۔ امریکا کی 30 ریاستوں میں سزائے موت کو قانونی حیثیت حاصل ہے' سزائے موت کے وہاں صرف دو طریقے ہیں برقی کرسی اور زہریلا انجکشن۔ دو ریاستوں کنساس اور نیویارک میں 2004ء میں سزائے موت کو غیر قانونی قرار دے دیا گیا' چین دنیا کا واحد ملک ہے جہاں سزائے موت پانے والے افراد کی تعداد دوسرے ممالک سے بہت زیادہ ہے۔ چین میں ہر سال 10 ہزار ایسے مقدمات درج ہوتے ہیں جن کی سزا موت ہوتی ہے۔ آسمانی مذاہب میں یہودیت اور عیسائیت میں یہ طریقہ مروج رہا۔ اسلام میں قتل عمد کی سزا قصاص ہے یعنی مقتول کے بدلے قاتل کو قتل کیا جانا' اسی طریقہ محاربہ (کسی منظم اور مسلح جتھے کا افراد اور گروہوں پر حملہ کرنا' قتل و غارت گری' سلب و نہب' اغوا اور آبروریزی کرنا وغیرہ) کی سزا قتل کرنا اور سولی پر چڑھانا بھی ہے' اسی طرح شادی شدہ مجرم کو اسلامی حکومت میں سنگساری (پتھر مار مار کر ہلاک کرنا) کی سزا دی جاتی ہے۔

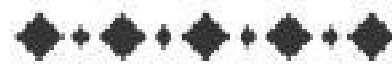
مغربی تاریخ سے واضح ہوتا ہے کہ سزائے موت کا انہوں نے بے دریغ استعمال کیا جس میں خصوصی نشانہ مسلمان تھے۔ برطانیہ اور دیگر ممالک میں 156 سے 220 تک جرائم ایسے تھے جن پر سزائے موت دی جاتی تھی' مہذب دنیا میں جدید ٹیکنالوجی کے باعث سزائے موت کے طریقوں

کی اشکال کو تبدیل کر لیا ہے مگر کسی کو تختہ دار پر لٹکانا مہذب دنیا کے قائد امریکا کا محبوب مشغلہ ہے جس کے لئے وہ اپنے غلام ملکوں کے قانون اور کینگرو روایتوں کا سہارا لیتا ہے جس کی بھینٹ اکثر وہی آمر چڑھتے ہیں جو اس کے پروردہ اور مفادات کے امین ہوتے ہیں۔ ان کے دل میں جب قوم و ملک کی محبت جاگتی ہے تو امریکا کی ان سے دشمنی کا نقطہ آغاز ہوتا ہے' پھر وہی مجرم مجرم بن جاتے ہیں' ان پر کردہ و نا کردہ ہر قسم کے گناہ ڈال دیئے جاتے ہیں' ان پر جھوٹی سچی فرد جرم عائد کی جاتی ہے اور کٹہرے میں لا کھڑا کیا جاتا ہے۔ بین الاقوامی جرائم پر بھی انہیں بین الاقوامی عدالت تک رسائی سے محروم رکھا جاتا ہے کہ کہیں اصل حقیقت لوگوں کے سامنے نہ آ جائے اور پس پردہ ہاتھ جنہوں نے اپنے لے پالک کو جرائم کی دنیا میں دھکیلا بے نقاب نہ ہو جائیں۔ ملکی عدالتوں میں بھی قانون اور ضابطوں کی دھجیاں اڑائی جاتی ہیں' وکلائے صفائی کو موقف پیش کرنے کی کھلی اجازت نہیں ملتی' اگر وکیل صفائی کی کوشش کرے تو اسے قتل کر کے راستے سے ہٹا دیا جاتا ہے۔

حالیہ مثال صدام کی ہے جسے امریکا نے پالا پوسا' اس کی پیٹھ ٹھپکی' اسے 10 برس تک ایران کے خلاف اپنے مفادات کے لیے استعمال کیا۔ سی آئی اے' ریگن اور رمزفیلڈ اس کے جرائم میں برابر کے شریک تھے۔ اگر صدام نے کیمیاوی گیس اور کیمیاوی ہتھیار استعمال کیے تو انہیں فراہم کرنے والے کون تھے؟ استعمال کرنے والا تختہ دار پر جھول گیا' یہ ہتھیار فراہم کرنے والا اور اسے شاباش دینے والا منصف بن بیٹھا۔ جس مقدمہ میں اسے سزائے موت دی گئی ان افراد کی نشاندہی کرنے والا امریکی ادارہ سی آئی اے تھا۔ اس واقعہ پر ہالینڈ اور برطانیہ نے اقوام متحدہ میں قرارداد لانا چاہی تو امریکا نے اس کی مخالفت کر کے قرارداد واپس لینے پر مجبور کر دیا۔ صدام کی پھانسی پر فی الحال یہی کہا جا سکتا ہے۔

قاتل نے کس صفائی سے دھوئی ہے آستین
اس کو خبر نہیں کہ لہو بولتا بھی ہے

بشکریہ (حافظ سجاد ستی)



شیعہ سنی فساد کرانے کا پختہ امریکی عزم

عراق کے سابق صدر صدام حسین کو امریکی دباؤ کے زیر اثر عدالتوں نے سزائے موت دے دی۔ یہ سزا بلاشبہ امریکی صدر بش اور ان کی انتظامیہ کی سوچی سمجھی منصوبہ بندی کا نتیجہ ہے۔ صدر بش اور ان کے حواریوں نے منصوبے کے مطابق اور یہودی ایجنسیوں کی نگرانی میں خفیہ ایجنسیوں کے ذریعہ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف انسداد دہشت گردی کی آڑ میں جو عالمی مہم جوئی شروع کر رکھی ہے اس میں مسلمانوں میں باہمی اختلافات اور انتشار پھیلا کر انہیں آپس میں لڑانا اور ان کی مشترکہ اور اجتماعی قوت کو پارہ پارہ کرنا بھی شامل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ صدام حسین کو شیعوں کا بدترین مخالف باور کرا کر عراق میں شیعہ سنی فساد پیدا کر کے ہزاروں افراد کو موت کے گھاٹ اتارا جا چکا ہے۔ اقتدار کے ذریعہ ہزاروں بے گناہ عراقیوں کو موت کی نیند سلایا جا چکا ہے۔ امریکہ مسلمانوں کو آپس میں لڑوانے اور مروانے کے لئے اب ایک نئی سمت سے مسلمانوں پر حملہ آور ہونے کی تیاری کر رہا ہے۔ ایک طرف عراق میں شیعہ اکثریت کا حق حکمرانی تسلیم کر کے سنی اور کرد مسلمانوں کو ان کے خلاف اکسا رہا ہے تو دوسری طرف ایران کے ایٹمی پروگرام کی آڑ میں عراق پر ایرانی مداخلت کو بڑھا چڑھا کر پیش کر رہا ہے تاکہ سعودی عرب اور خلیج کی سنی ریاستوں میں شیعہ مخالف کا تاثر پیدا کیا جا سکے۔ ایک تاثر یہ بھی دے رہا ہے کہ ایران اگر ایٹمی قوت حاصل کر لیتا ہے تو وہ دنیا بھر کے مسلمانوں کے لئے خطرہ بن سکتا ہے امریکا نے اپنی صلیبی جنگ کی حکمت عملی میں بڑی اہم تبدیلی کی ہے وہ اب براہ راست مسلمان ممالک پر شاید ہاتھ ڈالنے سے کترا رہا ہے کیونکہ عراق اور افغانستان میں اسے جس طرح کی مزاحمت کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے اس کی وجہ سے اسے ان دونوں ممالک میں بڑی ہزیمت کا سامنا ہے اور دونوں جگہ امریکا کا قبضہ برائے نام ہی رہ گیا ہے ورنہ امریکی انتظامیہ اپنی فوجی برتری کے باوجود شکست سے دوچار ہے جس کا اظہار بھی ہونے لگا ہے۔

سابق صدر صدام حسین چاہے جتنا بھی ظالم اور سفاک رہا ہو لیکن اگر اس کے دور حکومت کے عرصے کو دیکھا جائے تو عراق ایک پرامن اور خوشحال ملک کے طور پر سامنے آتا ہے اور ترقی اور خوش حالی کا ہی ثمر تھا جو عراق بقول امریکا جوہری توانائی کے حصول کی کوشش میں مصروف ہوا۔ پھر کل کے عراق اور آج کے عراق کا اگر سرسری نظر سے بھی موازنہ کیا جائے تو عراقیوں کو صدر صدام حسین کے مظالم سے نجات دلانے والی امریکی افواج نے تو اس سے بھی کہیں زیادہ مظالم کے پہاڑ بے گناہ عراقی عوام پر توڑ رکھے ہیں جس دہشت و درندگی کا مظاہرہ تمام تر عالمی اپیلوں کے باوجود

امریکی عراق میں کر رہے ہیں اس کی نہ کوئی حد ہے نہ حساب۔ بلاشبہ صدام حسین نے اپنے مخالفین کی سرکوبی کی ہوگی ان سے نجات حاصل کرنے کے احکامات بھی دیئے ہوں گے۔ لیکن ان کے مقابلے میں خود امریکا کیا کر رہا ہے کیا وہ اپنے مخالفین کو ہار پہنا رہا ہے ان کی تاج پوشی کر رہا ہے؟ امریکی افواج جس درندگی کا مظاہرہ کر رہی ہے اس کے مقابلے میں تو صدام حسین کے مظالم عشر عشیر بھی نہیں معلوم ہو رہے اور امریکیوں کے لئے یہ مظالم ڈھانا اور ڈھٹائی سے تمام تر عالمی اپیلوں کو رد کرتے ہوئے اپنے مذموم عزائم کو پورا کرنے میں تمام تر اخلاقی عالمی اقدار کو پامال کرنا کوئی نئی بات نہیں۔ ماضی میں بھی جنگ عظیم دوم کے موقع پر جاپان کے دو شہروں پر ایٹم بم گرا کر انہیں صفحۂ ہستی سے نیست و نابود کر دیا تھا۔ پہلے اس بدترین ظالمانہ عمل پر امریکا کو شرمندگی تک نہیں ہوئی تھی تو پھر اب عراق اور افغانستان میں ہونے والی خونریزی اس کے لئے کیسے نئی بات ہو سکتی ہے اور پھر یہ تو خالصتاً مسلمانوں کے خلاف جنگ ہے۔ جس طرح امریکا نے صدام حسین کو قاتل قرار دے کر پھانسی کی سزا دی ہے کیا وہی طریقہ کار وہی اصول انصاف امریکا خود اپنے لئے بھی اپنا سکتا ہے؟ نہیں ہرگز نہیں وہ ایسا کرنے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا۔ کیونکہ ہر صاحب اقتدار جسے یہ گمان ہوتا ہے کہ وہی سب طاقت کا مرکز و محور ہے کوئی اس کی مخالفت کی طاقت نہیں رکھتا اور اگر کسی طرح مخالفت کی تو اس کی زبان گدی سے کھینچنے میں کتنی دیر لگتی ہے۔ صدام حسین اگر آمر تھا اور اس نے اپنے مخالفین کو اپنی مرضی کے خلاف عمل کرنے پر ٹھکانے لگایا تو خود امریکا نے کیا وہی روش اختیار نہیں کر رکھی۔ کیا امریکی صدر خود صدام حسین سے بڑا آمر ہونے کا ثبوت نہیں دے رہے۔ اگر صدر بش صدام حسین کو گرفتار کر کے عدالت کے ذریعہ پھانسی کی سزا دینے کی جگہ گرفتاری کے وقت ہی جعلی مقابلے کا ڈھونگ رچا کر گولی مار کر ہلاک کرا دیتے تو آج عالمی سطح پر انہیں یوں انگشت نمائی کا سامنا نہ کرنا پڑتا لیکن ہر آمر باہر سے جتنا مضبوط نظر آتا ہے اندر سے اتنا ہی کمزور اور کھوکھلا ہوتا ہے۔ صدر بش نے اپنی انصاف پسندی کا رعب عالمی سطح پر قائم کرنے اور دنیا کے سامنے اپنی صفائی پیش کرنے کی نرالی خواہش کے پیش نظر صدام حسین کو اپنی من پسند اور اپنی مقرر کردہ عدالتوں سے سزا دلوانے کا ڈرامہ رچانے کی مذموم کوشش کی ہے جبکہ روز اول سے ہی دنیا کا بچہ بچہ یہ سمجھ رہا تھا کہ صدام حسین کو امریکا موت سے کم کوئی سزا دے ہی نہیں سکتا۔ حالانکہ خود امریکا میں بڑے بڑے جرائم میں ملوث مجرموں تک کو اب سزائے موت نہیں دی جاتی۔ پھر دیکھنا یہ بھی ہے کہ بوسنیا ہرزیگووینا میں ایک یہودی نژاد حکمران نے ہزاروں مسلمانوں کا قتل عام کیا اور ہزاروں افراد اس کے دور حکمرانی کے عرصے میں قتل ہونے والوں کی اجتماعی قبریں دریافت ہوئیں۔ کیا اس حکمران کو پھانسی دی گئی؟ اور اگر نہیں دی گئی تو کیوں؟ صرف اس لئے کہ وہ غیر مسلم اور یہودی تھا اور صدام حسین کو گھیر گھار کر اس لئے پھانسی دی جا رہی ہے کہ وہ مسلمان ہے۔ یقیناً اس طرح وہ مسلم دنیا پر یہ واضح کرنا چاہتے ہیں کہ ان کی نظروں میں مسلمانوں کی کیا اہمیت و حیثیت ہے ان کے ساتھ جب چاہیں جیسا چاہیں برتاؤ کر سکتے ہیں۔ اس طرح تمام مسلم ممالک سربراہوں کے لئے ایک تنبیہ بھی ہے کہ وہ عبرت حاصل کریں اور امریکی احکامات کے آگے سر تسلیم خم ہی رکھیں سرتابی و مخالفت کی کسی طرح جرأت نہ کریں۔ امریکی تسلط کے زیر اثر عدالت نے دو ٹوک انداز میں صدام حسین کو پھانسی کی سزا دی اور یہ بات بھی اپنی جگہ ہے کہ صدام حسین کو سزا دینے والے عدالتی افراد عراقی ہیں اور مسلمان ہیں یعنی صدام حسین کو سزا سنانے والے صدام حسین کے اپنے ہی لوگ ہیں اور سزا پر عملدرآمد کرنے والے بھی اس کے اپنے ہی ملک کے لوگ ہیں تا کہ امریکا سینہ تان کر دنیا کے سامنے یہ کہہ سکے کہ ہم نے تو کچھ نہیں کیا۔ صرف انصاف کے تقاضے پورے کئے ہیں۔

صدام کے خلاف فیصلہ عین انصاف کے مطابق کیا گیا اور یہ فیصلہ خود صدام حسین کے ہم مذہب اور ہم وطنوں نے کیا ہے۔ اس میں ہمارا کوئی دوش نہیں۔ صدام حسین نے اس جبری سزا کو قبول کرلیا۔ انہیں بھی یہ احساس تھا کہ موت وزندگی اللہ کے ہاتھ میں ہے جب زندگی پوری ہوگئی تو کوئی طاقت بچا نہیں سکتی۔ اس لئے انہوں نے عراقی عوام کے نام اپنے آخری پیغام میں کہا ہے کہ وہ متحد رہیں اور وہ اپنے ملک اور عوام کے لئے قربانی دے رہے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ انہیں یقین ہے کہ انہیں سچے لوگوں اور شہیدوں کے درمیان جگہ ملے گی یہ تو اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ ان کے ساتھ کیسا معاملہ ہوتا ہے لیکن بظاہر تو یہی نظر آتا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ سے بڑا عادل اور انصاف کرنے والا کون ہے امریکا اپنے تمام تر اختیارات جبر وظلم اور خواہشات کے باوجود صدام حسین کو ان کی موت کے مقررہ وقت سے پہلے نہیں مار سکا۔ اللہ بہتر جاننے والا اور نگہداشت کرنے والا ہے اللہ تمام عالم اسلام کو اپنی پناہ میں رکھے۔ امریکا اور اس کے حواریوں کی سازشوں سے محفوظ فرمائے۔ اللہ مسلمانوں کی حفاظت فرمائے۔ (آمین)

بشکریہ (مشتاق احمد قریشی)

اب مزاحمت شدت اختیار کر جائے گی

زندگی کا سب سے بڑا راز موت ہے، مگر موت کے لیے زندگی نہیں۔ دانا کہتے ہیں کہ جو زندگی کے اسرار سے آگاہ ہونے لگتے ہیں، گا ہے ان میں موت کا شوق پیدا ہونے لگتا ہے۔ مگر صدام حسین کی موت اس کے شوق کی پیداوار نہیں، تاہم وہ زندگی کے کچھ بھیدوں سے آگاہ ضرور ہوا تھا، اسی لئے موت نے اسے بے آرام نہیں کیا۔ اس نے جیل کی تاریک کوٹھڑی سے روشنی پھوٹنے والی ساعتوں میں اپنی قوم کو مخاطب کیا میں آپ کو الوداع کہتا ہوں، کیونکہ میری روح اللہ کے پاس پہنچنے والی ہے۔" راہِ موت کے اس عجیب وغریب مسافر نے اپنے خط کے اختتام پر یہ نعرے لکھے: "عراق زندہ باد، فلسطین زندہ باد، جہاد زندہ باد، مجاہدین زندہ باد، اللہ اکبر"۔

انسان کا خاکی بیج غلامی کی بنجر زمین میں پیدا نہیں ہوتا۔ یہ حرکت کی کھاد میں نمو پاتا اور برگ وبار لاتا ہے۔ یہ انسانیت کے جلیل القدر مقاصد کا ترجمان ہوتا ہے اور حیات کے ازلی منصوبے کی تکمیل میں کوشاں رہتا ہے۔ اس پر موت حرام ہے۔ صدام حسین جو زندگی گزار نہیں سکا، اب اس کی آرزو میں موت سے ہمکنار ہوا۔ اس موت کی عظمت یہ ہے کہ یہ ایک ایسی زندگی کو خراجِ تحسین پیش کرتی ہے جو استعمار کے خلاف جدوجہد میں گزرتی ہے اور امریکی غلامی سے آزاد رہتی ہے کچھ دیر کے لئے اس "زندگی" کو نظر انداز کر دیجئے جو اس نے قابلِ اعتراض حالت میں برسوں گزاری اور جو تاریخ کے کٹہرے سے مخالف وموافق دلائل کے باوجود کبھی بری نہ کی جا سکے گی...... لیکن اس موت کو یاد کیجئے جس سے اس نے نظریں چار کیں، اس کی ہیبت کو دم بخود کر دیا اور پھر اسے ایک عجیب بانکپن سے گلے لگایا۔ صدام حسین کو پھانسی دینے کے موقع پر وہاں 20 افراد موجود تھے، جن میں سے ایک عراقی قومی سلامتی کا مشیر موافق الربیع تھا۔ موافق الربیع کو ایک انٹرویو میں تسلیم کرنا پڑا کہ "صدام حسین کو صبح سویرے جگا کر جب پھانسی گھاٹ تک چلنے کے لئے کہا گیا تو انہوں نے کسی قسم کی مزاحمت نہیں کی"۔ یہی وہ موقع تھا، جب ایک جج نے انہیں سزائے موت کا حکم نامہ سنایا۔ موافق الربیع کی سی این این سے ہونے والی گفتگو کے مطابق "صدام حسین کو جب پھانسی کے لئے لایا جا رہا تھا تو انہوں نے قرآن مجید کو اپنے سینے سے لگایا ہوا تھا"۔

صدام حسین نے قیدیوں کا لباس بھی گوارا نہ کیا تھا۔ وہ ایک اوورکوٹ پہنے ہوئے تھے اور پھانسی گھاٹ تک آتے ہوئے ایک ہیٹ بھی، جو اتار لیا گیا تھا۔ صدام حسین تب تک خاموش تھے، یہاں تک کہ انہیں کچھ کہنے کے لئے کہا گیا، تب بھی انہوں نے حیات آشنا سکوت اختیار کئے رکھا

۔صدام حسین نے ایک امام کی اقتدا میں نمازِ فجر بھی ادا کی۔ بعدازاں انہیں تختہء دار تک لے جایا گیا۔صدام حسین تختہء دار پر آتے ہوئے نہ جھجکے، نہ سہمے۔صدام حسین کو پھانسی دینے والے اپنا منہ چھپائے ہوئے تھے۔انہوں نے صدام کے منہ پر بھی کپڑا ڈالنا چاہا۔تب صدام حسین نے مستحکم لہجے میں انکار کرتے ہوئے کہا:"میں موت سے آنکھیں چار کرنا چاہتا ہوں"۔البتہ صدام نے اپنی اس گردن کے گرد کپڑا لپیٹنے سے انکار نہ کیا جہاں ابھی کچھ لمحوں بعد پھانسی کی رسی ڈالی جانی تھی۔

تاریخ کا عجیب وغریب کردار اب تختہء دار پر تھا، ایک ایسی موت کے انتظار میں جو اس کے لئے ایک حیات بخش پیغام رکھتی تھی۔اس کی زیست کے تمام کالے داغ اس کے اپنے خون سے دُھلنے والے تھے،اس کی بدعمل تاریخ کی وجہ روسیاہی ختم ہونے والی تھی۔وہ جانتا تھا کہ کچھ لمحوں بعد تاریخ کا اُفق اس کے خون سے رنگین ہونے والا ہے،مگر اسے یقین رہا ہوگا کہ یہ آثار صبح گاہی ہیں۔وہ اپنی پوری زندگی امریکہ کے کام آتا رہا تھا ،آج امریکا اس کے کام آرہا تھا۔اس کے خون کی برسات سے اس کی زندگی کے دھبوں کو دھو رہا تھا۔مگر فطرت کی حسن بُنت دیکھئے کہ تب پہلی بار امریکہ اور صدام حسین ساتھ ساتھ بھی نہیں تھے۔آج امریکہ وہ غلطی کر رہا تھا جو صدام زندگی بھر کرتا رہا تھا۔اگر سپر پاور ممالک ایسی غلطی نہ کریں تو انہیں کبھی زوال نہ ہو اور تاریخ کا سینہ بس ایک ہی قوم کی داستان محفوظ رکھتے رکھتے اوبھ سا جائے۔تاریخ کا یہ قیدی زندگی سے نہیں، تاریخ کی قید سے آزاد ہو رہا تھا اور اپنی نئی زندگی کے نقش ونگار اور رخ ورخسار سنوار رہا تھا۔اس منفرد واقعے کی دو فلمیں منظر عام پر آچکیں۔شاید پہلی فلم وہاں پر موجود "علی المسدی" نامی ایک شخص نے بنائی تھی، جو عراقی وزیر اعظم نوری المالکی کا سرکاری ویڈیو ریکارڈر اور فوٹو گرافر ہے اور جس میں صدام حسین کو تختہ دار پر جاتے ہوئے اور منہ پر کپڑا ڈالنے سے صرف انکار کرتے ہوئے دکھایا گیا ہے۔

وہ آخری منظر جو تاریخ کا سینہ ہمیشہ چھلنی رکھے گا اور آنے والے وقتوں میں امریکہ اور عراق کی طفیلی حکومت کا تعاقب کرتا رہے گا،اس ویڈیو فلم میں سے حذف کر دیا گیا تھا۔مگر تب سیلولر فون کی ویڈیو سہولت سے فائدہ اٹھانے والا کوئی اور فرد بھی وہاں موجود تھا جس نے اس منظر کو فلمبند کیا اور اب یہ منظر عام پر ہے۔اس فلم میں اسے پھانسی دینے والے اور اس کے گرد کھڑے محافظین صدام حسین کے حریف نظر آتے ہیں۔یوں لگتا ہے کہ صدام حسین کو ان کے مخالفین کے درمیان ملامت کے لئے تنہا چھوڑ دیا گیا تھا۔ایک ہجوم صدام کو کوسنے دے رہا تھا، اسے ملامت کر رہا تھا، تب صدام حسین مستحکم لہجے میں انہیں جواب دے رہا تھا جو خود کو شیعہ حریف کے طور پر پیش کر رہا تھا اور کٹہرے میں کھڑے شخص کو ایک سنی رہنما باور کرا رہا تھا۔ملت اسلامیہ کے وجود کو پہلے بھی نہایت گہرے گھاؤ لگتے رہے ہیں،مگر یہ ایسا گھاؤ ہے جو شاید مشرقِ وسطیٰ میں کبھی نہ بھرا جاسکے۔دوسری ویڈیو فلم کے آغاز میں پہلی آواز کلمہ شہادت کی ابھرتی ہے۔

اشهد ان لا اله الا الله واشهد ان محمدً اعبده ورسوله .

پھر ایک اور آواز آتی ہے: یا اللہ......صدام

اب صدام درود کا پھول برساتا ہے: **اللهم صل علی محمدٍ وعلی آلِ محمد......**

اس دوران شور اٹھتا ہے اور پھانسی دینے والا عملہ چیخنے لگتا ہے:تم نے ہمیں تباہ کیا......تب صدام مستحکم لہجے میں جواب دیتا ہے:"میں نے تمہارا

تحفظ کیا، تمہیں تمہارے دشمنوں سے بچایا“۔ اب ہجوم مقتدیٰ الصدر کے نعرے بلند کرتا ہے۔ اس دوران ہجوم سے ایک اور آواز بلند ہوتی ہے: ”خدارا خاموش رہو“۔ تب صدام امریکہ اور فارس پر آخری ملامت بھیجتا ہے اور ہجوم سے بے پرواہو کر اپنے خالق کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے اور اس بحث و تکرار کے بعد پہلی مرتبہ کلمہ شہادت پڑھتا ہے: اشھد ان لا الہ الا اللہ ......

صدام اب دوسری مرتبہ بھی بآواز بلند کلمہ شہادت کا ورد شروع کرتا ہے اور جب پیغمبر صادق و آخر کے اسم مبارک ”محمدؐ“ تک پہنچتا ہے تو تختہ دار کا لیور کھینچ دیا جاتا ہے۔

تب ہجوم سے ایک آواز بلند ہوتی ہے: ”ظالم صدام مرگیا“۔ پھر ایک آواز آتی ہے: ”اسے تین منٹ تک جھولنے دو“۔

یہ مشرق وسطیٰ میں سنی مسلمانوں کی عیدالاضحیٰ کا دن تھا، حجاج کرام بھی آج ہی عید منا رہے تھے اور عراق کے تمام سنی مسلمانوں کے لئے بھی یہ یوم عید سعید تھا۔ بغداد ابھی پوری طرح نہ جاگا تھا اور وہاں کے سنی مسلمان نہیں جانتے تھے کہ ان کی قربانی تو صبح سویرے ہو چکی۔ البتہ عراق کے اہل تشیع بھائی ایک روز بعد ایران کے ساتھ عید منانے والے تھے۔ خبر جب عام ہوئی تو اہل تشیع کی عظیم اکثریت خاموش رہی، مگر صدام کی موت کی طرح اس پر جشن منانے کا انتظام بھی پہلے سے ہی تھا۔ یہ بھی اس کھیل کی بُنت کا ہی حصہ تھا کہ صدام کی موت پر جشن منانے والے صرف اہل تشیع ہی نظر آسکیں۔ بات پھر دہرائی جاتی ہے کہ صدام کی موت پر اہل تشیع کی عظیم اکثریت خاموش رہی تھی۔ وہ اس جشن کا حصہ بننے کے لئے آمادہ نہیں ہوئی۔ تو پھر یہ سب کیا تھا؟ آخر کیوں عراق کے سنی مسلمانوں کو ایک شہید دیا گیا اور عراق کے اہل تشیع کو صدام کی موت عید کے تحفے کے طور پر دی گئی۔ آخر کیوں ایران نے ”لاشرقیہ ولاغربیہ، اسلامیہ اسلامیہ“ کے نعرے کی لاج نہ رکھی؟ اور صدام کی موت پر اپنے ردعمل میں وہ امریکہ اور اسرائیل کی صف میں جا کھڑا ہوا؟ صدام حسین کا عدالتی قتل عراق سٹڈی گروپ کے مقاصد کی کس طرح تکمیل کرے گا؟ اور مشرق وسطیٰ کی تشکیل نو میں عدالتی قتل کا یہ ڈرامہ کتنا سازگار رہو گا؟ اگر اب بھی تعصبات سے بلند ہو کر غور و فکر نہ کیا گیا تو رسوائیوں اور کھائیوں میں لڑھکنے کا یہ عمل اپنے منطقی انجام تک جا پہنچے گا۔ صدام حسین کا عدالتی قتل اور اس قتل کا ایک خاص بندوبست مشرق وسطیٰ کے بھید بھرے واقعات کا محض ایک منظر نامہ ہے، جس میں صدام حسین کی زندگی کو اس کی موت سے بڑا راز بنا دیا گیا اور صدام ایک ایسے زندہ کردار کے طور پر سامنے آیا، جہاں اس کی موت اس کی زندگی سے زیادہ افضل ثابت ہوئی۔

تاریخ بالآخر تسلیم کرے گی کہ صدام حسین کی موت اس کی زندگی سے زیادہ افضل تھی اور اس کی زندگی کی اپنی تاریخ بھی وہ ہرگز نہیں تھی جو مغرب کی ایک آنکھ سے دیکھی گئی، جس میں حقائق آدھے سچ کی مانند تھے جو پورے جھوٹ سے زیادہ خطرناک نتائج رکھتے ہیں۔ جس میں بیشتر واقعات دروغ کو فروغ دیتے ہیں، افسانوں میں لتھڑے رہتے ہیں اور من بھاتی تعبیروں کی گرد سے اُٹے رہتے ہیں۔ صدام کی موت نے ثابت کیا ہے کہ اس کی اگلی زندگی، پچھلی زندگی کی ساری سچائیوں کو بے نقاب کر دیتی، چنانچہ اسے ایک ایسی موت کے حوالے کیا گیا، جس کے بعد عراق باقی نہ رہ سکے۔ کسی کو اس پر حیرت نہیں ہونی چاہئے کہ پیٹر گالبرائتھ نے تو ”اینڈ آف عراق“ نامی کتاب تحریر بھی کر ڈالی اور اگر کوئی عبرت پکڑنے کو تیار ہو تو صدام کی پھانسی کا منظر ہی نہیں، اس کی موت کے نفرت بڑھاتے انتظامات بھی بہت سی حقیقتوں کو عریاں کر دیتے ہیں۔

آشکار ہوا کہ مقدمے سے قبل ہی فیصلہ طے کرلیا گیا تھا، اگر کوئی نہیں جانتا تو ان کی خدمت میں عرض ہے کہ نیویارک بار ایسوسی ایشن کے رکن اسکاٹ ہورٹن نے 1982ء کے دوجیل کیس سے لے کر اس کا مقدمہ صدام حسین کے خلاف قائم کئے جانے تک کے معاملے پر ایک جامع رائے دیتے ہوئے کہا تھا: ''سانحہ دوجیل میں بھی امریکی ہاتھ موجود تھا اور اب اس کے مقدمے میں بھی امریکی کردار موجود ہے''۔

تحریر کیا گیا تھا کہ صدام کی موت کا آخری منظر امریکا اور عراق کی طفیلی حکومت کا تعاقب کرتا رہے گا۔ پورا ایک دن بھی نہیں گزرا کہ عراق کے صدر جلال طالبانی نے ذرائع ابلاغ کے نمائندوں سے کہا کہ وہ صدام کی سزائے موت کے مخالف تھے اور اس پورے واقعے سے بری الذمہ ہیں۔ عراقی وزیر اعظم نوری المالکی بھی کسی وقت مستعفی ہو سکتے ہیں، اگرچہ انہوں نے یہ کہا ہے کہ وہ عراق میں تشدد ختم کرانے میں ناکام رہے اور شیعہ جماعتوں کے درمیان بڑھتے اختلافات بھی قابو نہیں کر سکے، مگر جاننے والے جانتے ہیں کہ یہ معاملہ ان کے بس میں بھی نہیں تھا۔ دراصل صدام حسین کے عدالتی قتل کی گونج اب ان کے مسلسل تعاقب میں رہے گی اور اس کا پورا ملبہ خود امریکا بھی ان ہی پر گرائے گا۔ رہا امریکہ تو وہ اپنے داغدار چہرے کو کب تک مصنوعی غازوں سے چھپاتا پھرے گا۔ نیوز ویک کے ایک ایڈیٹر فرید زکریا تک کو کہنا پڑا کہ ''ہم نے عراقیوں کو ایک جمہوری ملک کے بجائے خانہ جنگی کا تحفہ دیا ہے۔'' صدام حسین کا عدالتی قتل اور مقدمہ اسی خانہ جنگی کی آگ کو مزید بھڑکانے کے امریکی بندوبست کا محض ایک حصہ ثابت ہوا اور کچھ نہیں۔ ذرا یاد کیجئے صدام حسین کے خلاف مقدمے کے دوران کیا کیا کچھ ہوا تھا؟

امریکا نے صدام حسین کے خلاف ایک اسپیشل ٹریبونل عراق کے عدالتی نظام سے نہیں، بلکہ امریکی وکلاء سے تیار کروایا تھا۔ پھر ''عدالت'' اور ٹریبونل کے معاملات چلانے کے لئے عراقی حکومت نے نہیں، خود امریکا نے سو ملین ڈالر مختص کئے تھے۔ اس کے باوجود اس عدالت کے سب سے پہلے جج نے استعفیٰ دے دیا تھا، بعد ازاں دوسرے جج کو بھی عدالت کی سربراہی سے امریکا نے اچانک ہٹا دیا تھا۔ جج پر یہ الزام لگایا گیا کہ وہ ماضی میں بعث پارٹی کے ایک رہنما رہ چکے ہیں۔ جبکہ معاملہ صرف اتنا تھا کہ وہ صدام حسین کے خلاف مقدمے کی سماعت کے دوران انصاف کے تقاضوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے دکھائی دیئے تھے، امریکا نے یہ گوارا نہیں کیا۔ بالآخر امریکا نے تیسرا جج ایک ایسا کرد منتخب کیا، جس کے عزیز و اقارب کردوں کے خلاف زہریلی گیس کے استعمال میں لقمۂ اجل بن گئے تھے۔ اس طرح تیسرا جج جذباتی طور پر صدام حسین کا مخالف بن کر سامنے آیا، حالانکہ پیٹر گالبرائتھ نے اپنی تازہ کتاب میں واضح کردیا کہ کردوں کے خلاف زہریلی گیس خود امریکا نے فراہم کی تھی اور اسے استعمال کے اہداف بھی سی آئی اے نے طے کئے تھے۔

صدام حسین کے خلاف دوجیل کیس کے اس مقدمے میں وکلاء کا معاملہ بھی ججوں سے مختلف ثابت نہیں ہوا تھا۔ صدام کے پہلے وکیل نے مقدمے کے آغاز میں ہی عدالت کے استحقاق اور دائرہ کار کے حوالے سے امریکی توقعات کے برعکس سوال اٹھا دیا۔ وکیل نے اپنے دلائل سے ثابت کردیا تھا کہ یہ مقدمہ نہ تو اس عدالت کے دائرہ کار میں آتا ہے اور نہ ہی وہ اس کی سماعت کا استحقاق رکھتی ہے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ اگلے ہی روز صدام حسین کے وکیل کو انتہائی سفاکی سے قتل کردیا گیا۔ اس مقدمے کے دوران صدام حسین کے تین وکلاء یکے بعد دیگرے قتل کئے گئے۔ صدام حسین کے مقدمے کا فیصلہ بھی امریکی حکومت نے اپنے کاروبار سیاست کے لئے بطور ایک جنس استعمال کیا۔ صدام حسین کے خلاف مقدمے کا فیصلہ 16

اکتوبر کو سنایا جانا تھا، مگر امریکی وسط مدتی انتخابات کے لئے اسے مؤخر کر دیا گیا۔ یہاں تک کہ انتخابات سے ٹھیک دو روز قبل ری پبلکن جماعت کی حمایت بڑھانے کے لئے یہ فیصلہ سنایا گیا۔ امریکا کے سابق اٹارنی جنرل رمزے کلارک تب عدالت میں موجود تھے۔ انہوں نے ایک پرچی جج کو بھیجی، جس پر لکھا تھا کہ "یہ عدالت نہیں، بلکہ ایک مذاق ہے"۔ امریکی وکلاء کی طرف سے طے کیا گیا کہ جج اس پر بپھر گیا اور اس نے رمزے کلارک کو 'عدالت' سے باہر نکال دیا۔ اس معاملے کا ایک اور دلچسپ پہلو یہ ہے کہ صدام حسین کے وکیل کے طور پر رمزے کلارک اس مقدمے کو لڑنا چاہتا تھا، مگر عدالت نے اس کی اجازت دینے سے انکار کر دیا تھا۔

صدام حسین کی پھانسی کا وقت اور اس کے انتظامات دونوں ہی بہت سوچ سمجھ کر طے کئے گئے تھے۔ عراقی وزیر اعظم نوری المالکی اسے عراق کی شیعہ برادری کے لئے عید کا تحفہ بنانا چاہتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے پھانسی کے انتظامات اپنے ایک معتمد "باسم الحسینی" کے سپرد کر دیئے تھے، جنہوں نے صدام حسین کی سزائے موت کو ان کے لئے زیادہ سے زیادہ اذیت ناک بنانے کی کوشش کی۔ دوسری طرف امریکا پھانسی کے وقت اور اس کے مخصوص انتظامات کے ذریعے عراق کی سنی آبادی کو زیادہ سے زیادہ برانگیختہ کرنا چاہتا تھا۔ دونوں نے ہی اپنے مقاصد حاصل کئے، اگرچہ اب دونوں ہی اس سے بری الذمہ ہونے کی کوشش کر رہے ہیں۔ مگر حقیقتیں کب مخفی رہتی ہیں؟ 29 اور 30 دسمبر کی شب، بغداد کے گرین زون میں قائم ہیلی پیڈ پر دو ہیلی کاپٹروں سے 20 افراد اترے تھے۔ جو بعدازاں ایک شیعہ اکثریتی علاقے "الکاظمیہ" کی جانب روانہ ہو گئے تھے۔ ان کی منزل الکاظمیہ کی وہ دو منزلہ عمارت تھی، جہاں پہلے کبھی صدام حسین کی انٹیلی جنس کا مرکز قائم تھا، مگر اب وہاں صدام حسین کو پھانسی دی جانی تھی۔ 20 افراد پر مشتمل یہ قافلہ مقتدیٰ الصدر کے حامیوں پر مشتمل تھا اور جنہیں صدام کی پھانسی کے انتظامات کا حصہ بنایا گیا تھا، یہی وہ لوگ تھے جن کے لئے تمام مغربی ذرائع ابلاغ نے "مخالفین" کی اصطلاح استعمال کی ہے۔

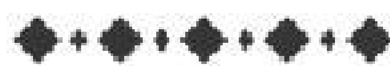
امریکی افواج نے رات کے درمیانی حصے میں صدام حسین کو بغداد ائیر پورٹ سے منسلک کیمپ کروپر سے نکال کر جب عراقی فوج کے حوالے کیا تھا تو عراقی حکومت کی طرف سے ان ہی بیس افراد نے صدام حسین کو وصول کیا تھا۔ یہ سب کچھ ایک مخصوص بندوبست کا نتیجہ تھا۔ مقتدیٰ الصدر ایک ایسے کھیل کا حصہ بن چکا تھا جو مشرق وسطیٰ اور خود عراق میں شیعہ مفادات کے لئے نہایت مضرت رساں ہے۔ مقتدیٰ الصدر عراق میں امریکی منصوبوں کا بہت پہلے ہی حصہ بن چکے تھے، اگرچہ وہ عراق میں امریکا کو اعلانیہ طور پر ایک قابض فوج ہی قرار دیتے ہیں۔ امریکا اور مقتدیٰ الصدر کے درمیان خاموش مفاہمت کے خدوخال سنوارنے میں احمد شبلی نے نہایت ہی فعال کردار ادا کیا تھا۔ جس کے نتیجے میں عراق کے اندر جنوری 2005ء کے انتخابات میں 23 نشستیں حاصل کر لی تھیں۔ ایک سال بعد ہی ہونے والے انتخابات میں یہ تعداد بڑھ کر 30 ہو گئی تھی اور تب مقتدیٰ الصدر کی جماعت نے خاموشی سے صحت اور ٹرانسپورٹ کی وزارتیں بھی حاصل کر لی تھیں۔ بعدازاں مقتدیٰ الصدر نے جتنے بھی راستے اختیار کئے، وہ سب ایک بندوبست کا ہی نتیجہ تھے۔ اب کوئی بھی مقتدیٰ الصدر کو خوئی کے قتل میں گرفتار کرنے کی بات نہیں کرتا۔ یہاں تک کہ امریکا بھی نہیں۔ ٹھیک اس طرح جب وہ دوجیل کے 148 افراد کے قتل پر 1998ء سے ایک عشرے تک چپ سادھے رہا۔

22 جنوری 2006ء کی تاریخ اس اعتبار سے کافی اہم کہلائے گی کہ تب مقتدیٰ الصدر نے عراق میں جاری مزاحمت کا رخ امریکا سے موڑ کر

فرقہ وارانہ بنا دیا تھا۔ اگرچہ اس تاریخ کو اہل تشیع کے دسویں اور گیارہویں امام کے روضوں پر بم دھماکے ہوئے تھے، مگر مقتدیٰ الصدر نے اس کارروائی کے متعلق حقائق جاننے کا انتظار کرنے کے بجائے مہدی آرمی کے ذریعے امریکا کے خلاف جاری سنی مزاحمت سے مقابلہ آرائی شروع کر دی، تب پہلی بار عراق میں خانہ جنگی کے آثار صاف دکھائی دینے لگے تھے اور اب صدام حسین کے عدالتی قتل کے امریکی بندوبست میں حصہ لے کر مقتدیٰ الصدر نے اس خانہ جنگی کو عراق کے لئے ایک حقیقی خطرہ بنا دیا ہے، جس پر عراق میں سب سے زیادہ ناراض خود شیعہ برادری ہے۔ مقتدیٰ الصدر کے لئے اب اپنی ساکھ بچانے کے لئے ضروری ہو گیا ہے کہ وہ امریکا کے خلاف اپنے مزاحمانہ کردار کو ایک بار پھر زندہ کریں۔ شاید مقتدیٰ الصدر کی ساکھ کو سنبھالا دینے کے لئے آئندہ دنوں میں امریکا کی طرف سے کچھ کارروائیاں بھی ہوں۔ اس امر کے قوی امکانات ہیں کہ الصدر سٹی میں امریکی آپریشن کا آغاز کر دیا جائے، ایران کے لئے عراق کی یہ صورت حال انتہائی خطرناک ثابت ہوگی، کیونکہ عراق میں فرقہ وارانہ خانہ جنگی کے نتیجے میں مشرق وسطیٰ کے دیگر ممالک وہاں پر اپنی اپنی ہم مسلک آبادیوں کے تحفظ کے لئے متوجہ ہوں گے، جو ایران کے آئندہ منصوبوں کے لئے ہرگز سازگار نہیں۔

جہاں تک صدام حسین کی پھانسی کے بعد کے عراق کا منظرنامہ ہے تو وہ اندھے کو بھی نظر آ سکتا ہے کہ امریکا کے لئے اب عراق مزید دشوار سے دشوار تر ہوتا چلا جائے گا۔ معروف مصنف رابرٹ فسک نے اپنے تازہ مضمون میں واضح کیا کہ صدام حسین کی گرفتاری نے عراق میں جاری مزاحمت کو دوگنا بڑھا دیا تھا اور اب صدام کی پھانسی کے بعد اس رواں مزاحمت میں مزید دوگنا اضافہ ہو جائے گا، مگر ایک بات جو سب ہی نظرانداز کر رہے ہیں وہ یہ کہ شاید پہلی بار القاعدہ اور بعث پارٹی میں عراق کے اندر ایک زبردست مفاہمت کے آثار پیدا ہو گئے ہیں۔ امریکا نے عراق پر قبضے کے بعد عراقی فوج کو غیر قانونی قرار دے دیا تھا۔ سرکاری ملازمین کو اپنے گھروں میں بھیج دیا تھا اور حکومت کے زیر انتظام چلنے والے بیشتر اداروں کو بند کر دیا تھا، جس میں لاکھوں افراد منظم و متحرک رہتے تھے۔ پھر بعث پارٹی کے کارکنان اور صدام دور کی انٹیلی جنس سے وابستہ افراد تھے۔ اب اس کا غالب ترین حصہ مزاحمت کا حصہ بن چکا ہے۔ دوسری طرف عراق میں القاعدہ بھی متحرک ہے، جن کا غالب حصہ وہ ہے جو قریبی ممالک سے وہاں پہنچا تھا، اگرچہ ان دونوں کے اہداف میں دو باتیں مشترک تھیں اولاً قابض افواج کا عراق سے انخلاء اور ثانیاً عراق کی طفیلی حکومت کا خاتمہ، مگر ان دونوں اہداف میں اشتراک کے باوجود ان کی باہمی مفاہمت بہت زیادہ نہ تھی، مگر صدام حسین کے عدالتی قتل نے اس کے امکانات کو بہت زیادہ روشن کر دیا ہے۔ آئندہ دن عراق کے لئے مزید سخت ہوں گے اور امریکی مفادات کے لئے شاید سب سے زیادہ مشکل ترین ثابت ہوں گے۔

بشکریہ (محمد طاہر)



کیا ایسی قوم جاگ سکتی ہے؟

جمعہ کی رات ختم ہورہی تھی گھڑی کی سوئی دھیرے دھیرے 12 کی طرف بڑھ رہی تھی اور میں سوچ رہی تھی کاش کوئی معجزہ ہوجائے۔ سنیچر کی صبح ہوئی میں ہزار کوشش کے باوجود T.V نہیں آن کرسکی، ڈر تھا، خوف تھا کہ یہ منحوس خبر نہ ملے۔ گیارہ بجے ہمت کر کے CNN لگایا تو پتہ چلا جس خبر سے ڈر رہی تھی وہ خبر دکھائی جارہی تھی۔ خبر یہ تھی کہ جس وقت صدام کو پھانسی دی گئی اس وقت فجر کی اذان ہورہی تھی۔

خدا کبھی تکبر کو پسند نہیں کرتا۔ وہ بار بار بندوں کو موقع دیتا ہے اپنی غلطی سدھارنے کا، خواہ مسلم ہو یا غیر مسلم۔ عید کے دن صدام کو پھانسی دینا انتقام کی جنون کی اور خوف کی انتہا ہے ایسا لگتا ہے جیسے صدر بش کے ذہن پر صدام حسین مرحوم کے ڈر کا بھوت سوار تھا جو صدر بش کو اعصابی طور پر کمزور بنا رہا تھا۔

صدام حسین پر 148 لوگوں کو زہریلی گیس کے ذریعے ہلاک کرنے کا الزام تھا اور انہیں پھانسی دیدی گئی۔ صدر صدام حسین پر اور بھی بہت سے الزامات تھے۔ سب کا فیصلہ موت ہی ہونا تھا۔ مگر کردوں کا قتل عام اور کرپشن کے مقدمہ کا فیصلہ ہونے سے پہلے ایک ہی الزام میں سزا سنادی گئی یہ اس بات کا کھلا ثبوت ہے کہ عراق میں امریکہ کی مسلط کردہ کٹھ پتلی حکومت اس رکاوٹ کو دور کردینا چاہتی تھی جو امریکہ کی راہ میں صدام حسین کی شکل میں حائل تھی۔ صدام حسین بھلے ہی بدترین آمر حکمران تھے مگر وہ عراق کے تھے۔ وہ ایک ایسے حکمران تھے جو آمریت کے باوجود عراق کے مستحق لوگوں کو فاقوں سے بچاتے تھے، انہوں نے اپنے آمرانہ دور میں بھی ملک کو ذہنی روشنی، پڑھا لکھا طبقہ اور سوچتا ہوا ذہن دیا تھا۔ تاریخ گواہ ہے کہ کسی بھی لیڈر یا حکمران کا اس طرح کا قتل سیاست کے صفحے سے اسے نہیں مٹاتا اور نہ اس کا نام نہیں ختم کرسکتا ہے۔

صدام کی پھانسی کی انسانی حقوق کے عالمی اداروں نے مذمت کی ہے۔ قانونی کمزوری کیا ہے۔ مشرق وسطیٰ کے ایمنسٹی انٹرنیشنل کے ڈائریکٹر میلکم اسمارٹ نے قانونی کارروائیوں کو 'خامیوں سے بھرا' قرار دیا ہے۔ صدام حسین دوران جنگ گرفتار ہوئے تھے، اس لئے وہ خالصتاً جنگی قیدی تھے جن کو 148 لوگوں کے مارنے کے جرم میں پھانسی کی سزا سنادی گئی، پھانسی دیدی گئی۔ ان نہتے مظلوم عراقی عوام جن میں بچے' بوڑھے' جوان' عورتیں سبھی شامل ہیں اور جن کا قتل عام ہوا اور ہورہا ہے۔ ان کو مارنے والوں کی کیا سزا تجویز کریں گے صدر بش کے مقرر کردہ عراقی ڈمی جج اور وکیل حضرات وہی جنہوں نے صدر صدام حسین کو سزا دی۔ صدام حسین کا بس ایک جرم تھا وہ اسرائیل کے خلاف تھے اور وہ شخص جو امریکہ کی آنکھوں

کی روشنی تھا اسے اسرائیل کے خلاف ہونے کے جرم میں بجھا دیا گیا۔

یہ سب کچھ مسلم ممالک کے لئے، مسلم حکمرانوں کے لئے ایک مقام فکر ہے اور یہ ایک حقیقت ہے کہ امریکہ اسلام کے خلاف اپنی تمام مکروہ اور گندی سازشوں کے منصوبے کی تکمیل میں سب کچھ کرسکتا ہے ہر حد سے گزر سکتا ہے اور کسی کو بھی کسی بھی جرم میں پھانس کر پھانسی پر چڑھا سکتا ہے۔

دریائے دجلہ کے کنارے تکریت کے علاقے میں پیدا ہونے والا ایک غریب کسان کا بیٹا صدام تھا جس نے 15 مارچ 2006ء کو اپنے مقدمے کے بیان کے دوران کہا تھا عراقی عوام کو آپس میں لڑنے کے بجائے امریکی افواج سے لڑنا چاہئے...... اور جج نے صدام حسین کا مائیک بند کروایا۔ صدام حسین کو اگر 28 دسمبر 2006ء کو پھانسی نہیں دی جاتی تو بھی انہیں 28 اپریل 2007ء سے پہلے مرنا ہی تھا کیوں کہ عراقی قانون کے تحت 70 سال سے زیادہ یا 70 سال کی عمر کے مجرم کو پھانسی نہیں دی جاتی اور 28 اپریل 2007ء کو صدام حسین 70 سال کے ہوجاتے۔

عراق کے قانون میں سنا ہے یہ بھی شامل ہے کہ پھانسی مذہبی تہوار پر نہیں دی جاسکتی مگر صدام حسین کو دیدی گئی کیونکہ یہ ایک وارننگ ہے کہ مسلمانوں کو کبھی بھی کہیں بھی کسی بھی جرم کا مجرم بنا کر کسی بھی وقت کسی بھی دن پھانسی دے سکتے ہیں۔ خدا اور مجازی خدا...... تو امریکہ خود کو مجازی خدا ہی سمجھتا ہے۔ مجازی کا مطلب ثانوی ہوتا ہے دوسرے درجے کا ہوتا ہے مگر امریکہ خود کو خدا سمجھتا ہے جس کے ہاتھوں میں سب کی تقدیر سب کی زندگی سب کی موت لکھی ہے۔

اتوار کی صبح چار بجے (مقامی وقت) کے حساب سے صدام حسین کو خاموشی سے دفن کر دیا گیا۔ سینکڑوں، ہزاروں لوگوں نے صدام حسین کی پھانسی پر آنسو بہائے ماتم کیا۔ وہ عراق کا بیٹا تھا، عراقی اس کے لئے تمام عمر روئیں گے شیعہ سنی کا فرق بھول کر ہر عراقی ایک نہ ایک روز ضرور سوچے گا کہ "وہ سنی تھا تو کیا ہوا، ہم شیعہ تھے تو کیا ہوا" تھا تو وہ ہمارا ہی۔

صدام حسین کی پھانسی کیا عالمی امن کے لئے خطرہ بنے گی خاص کر اس حالت میں جب کالعدم بعث پارٹی نے صدام حسین کی پھانسی کا انتقام لینے کا اعلان کیا ہے؟؟ بعث پارٹی نے صدر بش کو وارننگ بھی دی ہے کہ وہ پھانسی دے کر خوش نہ ہوں" 2003 11 / 9 کے بعد سے امریکہ اور اس کے اتحادیوں کی وجہ سے عراقی عوام کو مفلس، آزمائشوں اور مصیبتوں کا سامنا ہے۔ تیل کے کنوؤں اور معیشت پر امریکہ کی لائی تباہی ہے، اور اب پھانسی بچے کھچے عراق کا کیا حال کرے گی وقت بتائے گا؟؟ لوگ کہتے اور میں بھی کہتی ہوں کہ شاید عوام جاگ اٹھیں گے صدام حسین کے آخری پیغام کو سننے والے عراقی خاموش نہیں رہیں گے مگر...... کیا ایک پسی ہوئی اجڑی ہوئی قوم جاگ سکتی ہے؟؟ شیعہ اور سنی کے سوال میں الجھی ہوئی قوم جاگ سکتی ہے؟؟ ایک فرقہ ماتم کررہا ہے دوسرا خوشیاں منا رہا ہے، کیا ایسی قوم جاگ سکتی ہے۔ کیا یہی جو کچھ میں نے ڈر کے مارے سوچا ہے وہی عراق کا مستقبل ہے؟؟ کیا عراق جیسا انجام کسی بھی ملک، کسی بھی قوم جو لفظ "مسلمان" کے نام سے موسوم ہے۔ مستقبل ہے؟؟

بشکریہ (عابدہ اقبال آزاد)

غاصبوں کے آلہ کار

صدام حسین نے اپنے آخری لمحات میں پوری دنیا کے مسلمانوں کا سر فخر سے بلند کر دیا۔ ہم تو کتابوں میں پڑھتے آئے تھے کہ کلمہ حق کہنے والے کس طرح مسکراتے ہوئے تختہ دار پر چڑھ جاتے ہیں مگر ہمیں یہ ہمیشہ ذرا افسانوی سا لگا کیونکہ موجودہ دور میں ایسی کوئی مثال نہیں تھی اور اگر کسی کو ناحق تختہ دار پر چڑھایا بھی گیا تو تمام تر بلند و بانگ دعووں کے باوجود وہ کانپتے ٹانگوں اور لڑکھڑاتے قدموں سے ہی تختہ دار پر گیا اور کہیں تو یہ بھی مشہور ہو گیا کہ پھانسی کے تختے کی دہشت نے جلاد سے اس کا شکار ہی چھین لیا اور جلاد بلاوجہ ہی بدنام ہوا۔ صدام حسین نے ہماری لاج رکھ لی جبکہ اس کے برعکس امریکہ کے جو پٹھو اپنے آقاؤں کے کہنے پر اسے پھانسی دے رہے تھے اس قدر خوفزدہ تھے کہ ایک لمحے کے لئے بھی اپنے چہروں سے نقاب نہ اٹھا سکے ان بزدلوں کے مقابلے میں اجل کے منہ میں کھڑا صدام ان سے کہہ رہا تھا کہ مجھے نقاب کی ضرورت نہیں میں موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اس کا سامنا کرنا چاہتا ہوں۔ امریکہ کی سنگینوں کی چھاؤں میں حکمرانی کرنے والے اچھل اچھل کر اس آہنی اعصاب رکھنے والے رہنما کا مذاق اڑانے کی کوشش کر رہے تھے مگر صدام ان سے نہایت اطمینان سے پوچھ رہا تھا کہ کیا بہادر عربوں کا یہی وطیرہ ہوتا ہے۔ اس پھانسی کے بعد صدام تو امر ہو گیا اور جنہوں نے اس کو امریکہ کے اشارے پر اور اس کی فوجوں کی حفاظت میں لٹکایا وہ پوری دنیا کے سامنے ننگے ہو گئے اور سب کو اندازہ ہو گیا کہ استعماری طاقتوں کے آلہ کار کس طرح تاریخ میں ہمیشہ سے یہی کردار ادا کرتے آئے ہیں۔ تاریخ ہمارے سامنے لکھی جا رہی ہے اور الیکٹرونک میڈیا کے اس دور میں سب کچھ ہماری آنکھوں کے سامنے ہو رہا ہے اور اس میں مبالغے ملاوٹ اور جھوٹ کی کوئی گنجائش نہیں۔ پوری دنیا دیکھ رہی ہے کہ یزید وقت کے ساتھ کون کھڑا ہے اور کون اس کے خلاف علم بغاوت بلند کر کے پھانسی کے پھندے کو چوم رہا ہے۔

صدام کی موت کا وقت بہت اہم ہے۔ اسے عید کے دن اس وقت پھانسی چڑھایا گیا جب پورے عراق میں فجر کی اذان مسلمانوں کے کان میں گونج رہی تھی۔ کسی کی کسی سے کتنی ہی دشمنی ہو ظالم بھی عید اور تہوار کے دن یہ حرکت نہیں کرتا مگر امریکہ صرف صدام کو پھانسی نہیں دینا چاہتا تھا وہ پوری مسلمان امہ کا مذاق اڑانا چاہتا تھا اور انہیں بتلانا چاہتا تھا کہ مغرب کی نظر میں مسلمانوں کے تہواروں ان کے مقدس دنوں اور خوشی کے موقعوں کی کوئی اہمیت نہیں اور وہ ان کے تکریم و تقدس کو جب جی چاہے پامال کر سکتا ہے اور اس کے لئے اسے اپنے سپاہیوں کی بھی ضرورت نہیں اس کی خدمت کیلئے وہ عناصر کافی ہیں جو ہمیشہ سے مسلمانوں کی صفوں میں میر جعفر اور میر صادق کا کردار ادا کرتے آئے ہیں۔ کاش ان لوگوں میں اتنا حوصلہ اور اسلام کی اتنی محبت اور عظمت تو ہوتی کہ وہ اس مقدس دن یہ گھناؤنا کام کرنے سے انکار کر دیتے اور کم سے کم اسے دو چار دن ٹال کر

مسلمانوں کی تاریخ میں اس بدنما داغ کو لگنے سے روک دیتے۔ اب ہم کس طرح اپنے بچوں کو بتائیں گے کہ مسلمانوں کے ملک پر قابض ایک غیر ملکی طاقت نے خاص عید کے دن مسلمانوں کے ہاتھوں ہی اس ملک کے سربراہ کو پھانسی پر چڑھایا اور ہم ایک دوسرے کا منہ تکتے رہ گئے اور پوری دنیا کے مسلمان رہنما دبی دبی زبان میں احتجاج کرنے کے علاوہ کچھ نہ کر سکے۔ تاریخ میں ہمارا ذکر آنے والی نسلوں کیلئے کوئی زیادہ قابل رشک نہ ہوگا۔ صدام کا جرم کیا تھا۔ اسے جس الزام میں سزا ہوئی اس کے مطابق اس نے اپنے ملک کے لوگوں کو بغاوت کے جرم میں موت کے گھاٹ اتارا تھا۔ کیا یہ کوئی انوکھا رہنما تھا جس نے یہ کیا اور کیا یہ آج بھی نہیں ہو رہا۔ کیا کئی ممالک میں ببانگ دہل یہ اعلان نہیں کیا جا رہا کہ حکومت کے اقتدار اعلیٰ کی حفاظت کی جائے گی چاہے اس کے لئے کچھ بھی کرنا پڑے اور اس کا ثبوت بھی پیش کیا جا رہا ہے۔ بغاوت کے نام پر بمباری کر کے تراسی نوجوان بوڑھے اور بچے مار دینا اب ایک عام سی بات ہے اور اس کے بعد کہا جاتا ہے کہ یہ قومی مفاد میں تھا۔ صدام نے بھی قومی مفاد میں بغاوتوں کو کچلا اور اگر اس کا جرم اتنا سنگین تھا تو پھر وہ دوسرے رہنما کیوں بچے ہوئے ہیں جو اپنے ہی لوگوں کے خلاف اعلان جنگ کئے ہوئے ہیں اور انہیں اجتماعی اور انفرادی طور پر چن چن کر قتل کر رہے ہیں۔ کیا ان کے خلاف مقدمات اور پھانسی کا عمل اسی وقت شروع ہوگا جب امریکہ کی نظر میں ان کی افادیت ختم ہو جائے گی اور پھر صدام کی طرح ان کے ساتھ بھی انصاف کا ڈھونگ رچایا جائے گا اور وہ بھی کسی دن اسی طرح اپنوں ہی کے ہاتھوں تختہ دار پر انصاف وصول کر رہے ہونگے۔ جس وقت صدام نے یہ جرم کیا اسے امریکہ کی مکمل سرپرستی حاصل تھی۔ وہ کیمیکل ہتھیار جو کردوں کے خلاف استعمال ہوئے وہ گولیاں جن کا نشانہ معصوم اور بے بس عراقی بنے ان سب پر مہریں مغربی ممالک کی تھیں جو اس وقت صدام کو ہانکا دے رہے تھے کہ آگے بڑھو اور بغاوتوں کا سر کچل دو بالکل اسی طرح جیسے آج کل امریکہ دوسرے اسلامی ممالک میں رہنماؤں کی پیٹھ ٹھونک رہا ہے کہ اپنے لوگوں کا قتل عام کرو انہیں دہشت گرد قرار دے کر غائب کردو اور جو اس پر احتجاج کرے اسے ننگا کر کے مارو اور تشدد کا نشانہ بناؤ۔ ناعاقبت اندیش حکمران طاقت کے نشے میں سرشار آنکھیں بند کر کے اس کے احکامات پر عمل کر رہے ہیں اور اس قاتل کا پیٹ بھر رہے ہیں جو کسی نہ کسی دن ان کے خلاف عدالت میں پیش کی جائے گی اور امریکہ حیرت کا اظہار کرے گا کہ یہ شخص اس قدر ظالم تھا اور اس نے اپنے لوگوں کو اس بے دردی سے مارا۔

اگر عراقیوں کا قتل اتنا بڑا جرم ہے تو پھر امریکہ اس کا سب سے بڑا مجرم ہے۔ صدام ہزار بار بھی پیدا ہو جائے تو اتنے عراقی نہیں مار سکتا جو امریکہ نے مارے ہیں اور میں صرف ان عراقیوں کی بات نہیں کر رہا جو امریکہ کے عراق پر قبضے کے بعد مارے گئے ہیں حالانکہ ان کی تعداد بھی لاکھوں میں ہے اور اس کی ذمہ داری مکمل طور پر امریکہ پر ہے کیونکہ نہ امریکہ عراق پر قبضہ کرتا اور اس کے معاشی اور معاشرتی ڈھانچے کو برباد کرتا اور فرقہ واریت کو ہوا دیتا نہ اتنی تعداد میں معصوم لوگ ہلاکت کا شکار ہوتے۔ میرا اشارہ تو ان لاکھوں بچوں کی جانب بھی ہے جو امریکہ کے اشارے پر اقتصادی پابندیوں کے نتیجے میں دواؤں اور غذا کی قلت کے باعث مارے گئے۔ پوری دنیا چیختی رہی اور عراقی مائیں رو رو کر ان معصوموں کی جان کی بھیک مانگتی رہیں مگر شقی القلب مغربی رہنماؤں پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ جو پھانسی کا پھندہ صدام کے گلے میں ڈال رہے تھے ان میں اتنی اخلاقی جرات بھی نہیں تھی کہ کم سے کم اپنے مغربی آقاؤں سے ان لاکھوں معصوموں کی جان کا حساب مانگ سکیں۔

کہا جا رہا ہے کہ صدام کا اس طرح عدالتی قتل مسلمانوں کو لڑانے کی سازش ہے۔ افسوس کہ مسلمان ہمیشہ دشمن کا آلہ کار بن کر واویلا مچا دیتا ہے کہ

اس کے خلاف سازش ہورہی ہے۔ کیا جن لوگوں نے پھانسی کا پھندہ صدام کے گلے میں ڈالا امریکہ سے یہ نہیں کہہ سکتے تھے کہ یہ کام خود کرو تا کہ دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہوجائے اور دنیا کو پتہ چل جائے کہ یہ سزا عراق کی عدالت کی نہیں امریکہ کے سفید ہاتھی کی ہدایت ہے۔ پہلے تو دشمن کے ساتھ مل جاؤ اور اس کے ساتھ سازباز کرو پھر کہو کہ یہ مسلمان کو لڑانے کی سازش کبھی کامیاب نہیں ہوسکتی کیونکہ مسلمانوں میں بس دو گروہ ہیں۔ ایک وہ جو حق اور صداقت کا علمبردار ہے اور دوسرا وہ جو طاغوتی قوتوں کا اور غاصبوں کا آلہ کار۔ مقام حیرت اور عبرت ہے کہ کربلا کی سرزمین نے ایک دفعہ پھر دونوں کا چہرہ دنیا کو دکھادیا۔

بشکریہ (ضیاء الاسلام زبیری)

خانہ جنگی کا تحفہ

صدام حسین کا قصہ تمام ہوا۔اس کی گرفتاری' مقدمہ اور پھانسی عراق پر امریکی قبضے کا افسوس ناک پہلو ہے۔ مناسب انداز میں ہوجانے والا کام بدترین انداز میں کیا گیا۔یاد رہے صدام حسین کوئی غیر معمولی ڈکیٹٹر نہیں تھے۔عہد جدید میں ان کی حکومت تاریخ کی ایک ظالم کرپٹ اور متشدد حکومت تھی جو روس کے سٹالن اور شمالی کوریا کے کم جونگ ال سے مماثلت رکھتی تھی۔اس میں امریکہ کیلئے سٹرٹیجک حکمت جو بھی ہو'ان کی معزولی بلا مبالغہ طور پر عراق کیلئے مفید ثابت ہونا شروع ہوگئی۔

جلد ہی بش حکومت نے صدام پر بین الاقوامی قانون کے تحت یا ایک بہتر قانونی ساکھ رکھنے والی عدالت میں مقدمہ چلانے کا فیصلہ ترک کردیا۔آخر یہی حکومت تھی جسے عراق پر حملے اور قبضے کیلئے اقوام متحدہ سے مینڈیٹ نہ مل سکا۔اس نے صدام کی قسمت کا فیصلہ ایک ایسی عراقی حکومت کے ہاتھ میں دے دیا' جس پر شیعہ اور کرد سیاستدانوں کا غلبہ تھا جو مبینہ طور پر صدام کے عہد میں ظلم وستم کا شکار رہے۔چنانچہ صدام کے خلاف مقدمہ جو ایک مہذب معاشرے کا ایک ڈکٹیٹر کے خلاف فیصلہ ہونا چاہیے تھا اب سنی اور عرب مسلمانوں کی اکثریت اسے ایک تماشہ اور فاتح کا انتقام سمجھ رہی ہے۔

یہ کوئی ناگزیر عمل نہیں تھا۔صدام کی اقتدار سے محرومی پر عوام کی اکثریت خوش تھی۔امریکی قبضے کے بعد ابتدائی مہینوں میں عبوری اتھارٹی کیلئے عوام کی حمایت 70 فیصد سے زائد تھی۔اس کے حامیوں میں عراق کے سنی عوام بھی شامل تھے۔بغاوت کے ابتدائی مہینوں میں صرف 14 فیصد عوام امریکی فوجیوں پر حملے کے حق میں تھے۔آج یہ تعداد 70 فیصد ہوچکی ہے۔ان مہینوں میں شورش کا مرکز سنی فلوجہ نہیں۔

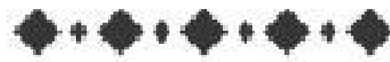
ان ابتدائی مگر اہم مہینوں میں امریکی حکومت نے عراقی فوج کو تحلیل کردیا' پچاس ہزار بیوروکریٹس کو برطرف کردیا گیا اور حکومتی سرپرستی میں چلنے والے وہ ادارے بند کردیئے گئے جہاں عراقی عوام کی اکثریت برسرروزگار تھی۔درحقیقت امریکہ نے عراقی ریاست کا تیاپانچا کردیا۔عدم تحفظ' بدانتظامی اور بیروزگاری عروج پر پہنچ گئی۔حکومت جس پر سنی عوام کا غلبہ تھا وہ اسے محض حکومت کی تبدیلی نہیں بلکہ ایک دوسری ڈکٹیٹرشپ سمجھتے ہیں جس میں انہیں اچھوتوں کا درجہ حاصل ہے۔امریکہ نے سوچے سمجھے بغیر اتنا سنگین قدم کیوں اٹھایا۔بش حکومت کی خارجہ پالیسی کے حوالے سے یہ ایک معمہ ہے' سمجھنے کا نہ سمجھانے کا۔بعض فیصلے تو آئیڈیالوجی کے پس منظر میں کیئے گئے۔بعث پارٹی کو ایک فاشسٹ پارٹی قرار دیا گیا۔ہر سکول ٹیچر جس نے نوکری کیلئے بعث پارٹی کی رکنیت لی اسے نازیوں کا ہم پلہ اور تمام حکومتی اداروں کو ملعون ٹھہرایا گیا۔

حکومت نے اپنی پالیسیوں کے فرقہ وارانہ پہلو کا ادراک نہ کیا۔ چنانچہ وہ قوم کی تعمیر نو کے بجائے اس کی تباہی کا سبب بن گئیں۔ اس نے ایک ہی رٹ لگا رکھی تھی کہ وہ قومی فوج اور پولیس فورس کی تشکیل میں مصروف ہے جبکہ یہ بات کالم نگاروں پر بھی عیاں تھی کہ ان دونوں اداروں میں شیعہ اور کرد لوگوں کی اکثریت ہے جن کا تعلق ملیشیا گروپوں سے تھا اور وہ ریاست کے بجائے مختلف سیاسی جماعتوں کے وفادار تھے۔ ان بنیادی سیاسی اعتراضات کا جواب تھا کہ ان کی مزید تربیت کی جائے لیکن ایک مضبوط شیعہ فوج نے سنی عوام میں عدم تحفظ کا شدید احساس پیدا کر دیا اور وہ بغاوت کی حمایت کو ترجیح دیتے ہیں۔

عراق کے سنی عوام کوئی فرشتے نہیں ان کی جو اقلیت القائدہ کی حامی ہے انتہائی ظالم اور سنگدل ہے لیکن یہاں میرا مقصد ان کی برائیوں کی نہیں اپنی حماقت کی نشاندہی کرنا ہے۔ ہم نے عراق سے صرف صدام حکومت نہیں بلکہ صدیوں پرانی حکمران اشرافیہ کا بھی خاتمہ کر دیا۔ اس کے برعکس جب نیلسن منڈیلا جنوبی افریقہ میں برسر اقتدار آئے تھے تو انہوں نے ایک بھی سفید فام فوجی یا بیورو کریٹ کو برطرف نہیں کیا تھا۔ انہوں نے یہ اس لئے نہیں کیا تھا کہ وہ انہیں اپنے عوام کا ہمدرد اور بہی خواہ سمجھتے تھے بلکہ انہوں نے یہ پالیسی اور حکمت عملی ایک افریقی بغاوت روکنے کیلئے اپنائی۔ واشنگٹن میں یہ فیشن بن گیا ہے کہ عراق میں ہونے والے کسی بھی واقعے کی ذمہ داری عراقی عوام پر ڈال دی جاتی ہے مثلاً چارلس کراٹ ہیمر اظہار افسوس کرتے ہوئے کہتے ہیں ''ہم نے عراقی عوام کو ایک جمہوری ملک دیا ہے' مگر وہ خود کو اس کا اہل ثابت نہیں کر رہے۔

بعض لوگ ماہرین بشریات سے خواستگار ہیں کہ وہ عراقی کلچر کی بے عملی اور بے اعتدالی کی وجود کا پتہ چلائیں۔ ممکن ہے ان تمام دعوؤں میں کسی حد تک سچائی اور حقیقت ہو لیکن عراق ایک مشکلات سے لبریز سرزمین ہے۔ اس کے باوجود بش حکومت الزامات سے اپنا دامن نہیں بچا سکتی۔ اس نے بلا سوچے سمجھے وہاں فرانس اور ایران جیسا انقلاب لانے کی کوشش کی اور پھر حیران دکھائی دینے لگے کہ عراق اس انقلاب کو اتنے پرامن انداز میں ہضم نہیں کر سکتا۔ ہم نے عراقی عوام کو ایک جمہوری ملک کا نہیں بلکہ ایک خانہ جنگی کا تحفہ دیا ہے۔

بشکریہ فرید زکریا (''نیوز ویک'' ترجمہ: زاہد رامے)



ایک نامعلوم راز

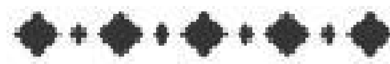
13 دسمبر 2003ء کی ایک سرد اور اداس شام کو صدام حسین کو ان کے آبائی قصبے تکریت کے مضافات میں ایک زمین دوز غار سے گرفتار کیا گیا۔ صدام حسین جس رسوا کن انداز میں گرفتار ہوئے وہ منظر عالم اسلام خاص طور پر عرب قوم کے لیے باعث شرم تھا۔ گرفتاری کے وقت اس کے پاس تو بندوقیں 400 گولیاں اور 97 ہینڈ گرنیڈ تھے۔ مسلمانوں کی روائتی غیرت کا تقاضا تو یہ تھا کہ "مجاہد اعظم" صدام مردانہ وار امریکی کافروں پر کبھی نہ مٹنے والا ایک نقش چھوڑ جاتا۔ پتہ نہیں امریکیوں کے ہاتھوں گرفتاری کے وقت وہ موت سے اتنے خوفزدہ کیوں تھے۔ اصیل گائے کی طرح منہ کھول کر اپنا معائنہ کراتا رہا۔ صدام کی گرفتاری کے مناظر دیکھ کر زمانہ قدیم کے ان رومن حکمرانوں کا دور یاد آ گیا جو قیدیوں کو لوہے کے پنجروں میں بند کر کے رعایا کے سامنے اپنی طاقت کی نمائش کیا کرتے تھے۔ امریکن عدالتی سٹیج سجا کر صدام کے ذریعے مسلمان عربوں کو بے بسی اور ذلت کا احساس دلاتے اور ان کی عزت نفس، خودداری، غیرت وحمیت کا جنازہ نکالتے رہے۔ صدام کو زندہ بچ جانے کی کوئی امید نہ ہوتی تو صدیوں پرانا کوئی نہ کوئی آزمودہ طریقہ استعمال کر کے موت کو گلے لگانے کا کوئی راستہ ڈھونڈ سکتا تھا۔ صدام کی گرفتاری پر تبصرہ تھا کہ عراق کے اس ڈکٹیٹر کو تکریت کے غار سے یوں نکالا گیا جیسے چوہے کو دم سے پکڑ کر نکالا جاتا ہے۔

یہ تھی اس کی اصل بہادری باقی ساری بہادری امریکہ کے دم قدم سے قائم تھی ورنہ عراقی قوم کے لیے تو وہ ظلم وستم اور دہشت گردی کی علامت تھا۔ وہ ایک سیکولر حکمران تھا۔ اس نے افغانستان پر سوویت حملے کی حمایت کی اور اس کا ساتھ دیا۔ اس کے تعلقات پاکستان کے برعکس بھارت سے انتہائی دوستانہ اور خوشگوار رہے۔ اس نے بین الاقوامی فورموں میں کشمیر سمیت ہر اہم معاملے پر بھارت کی حمایت کی اور پاکستان کی مخالفت کی۔ 70ء کے عشرے میں جب بغداد میں بعث پارٹی کے بانی عیسائی عرب لیڈر مائیکل افلق کی قیادت میں خدا کا جنازہ (نعوذ باللہ) نکالا گیا، صدام اس میں بھی شامل تھا۔ دس سال بعد برطانوی صحافی کو انٹرویو دیتے ہوئے صدام نے اس جلوس کا یہ جواز پیش کیا کہ "مذہب ہماری زندگی میں انتشار اور لامرکزیت پیدا کرتا اور انسانوں میں تقسیم کا باعث بنتا ہے۔ ہم نے اپنی پارٹی کے بانی کے کہنے پر جلوس نکالا تھا، مجھے آج بھی اس پر کوئی شرمندگی نہیں ہے۔" صدام نے اپنی سیاست کا آغاز بعث پارٹی سے کیا جو ایک مذہب دشمن جماعت تھی اور اس پارٹی کا منشور خدا کے وجود سے انکار تھا۔ ہوس اقتدار اور امریکہ کی پشت پناہی پر جنرل قاسم پر قاتلانہ حملے کی سازش میں حصہ لینے کے بعد سی آئی اے اور مصری ایجنسی کی مدد سے صدام فرار

ہو کر بیروت پہنچ گیا تھا جہاں سی آئی اے نے ان کی خصوصی تربیت کی۔ اس کے بعد وہ قاہرہ پہنچا جہاں امریکی سفارت خانے میں اس کا آنا جانا ہوا اور یوں اسے امریکہ کے خصوصی ایجنٹ کا مرتبہ ملا۔ لاکھوں کی تعداد میں سنی مسلم کردوں کا قتل عام اور امریکہ کے فراہم کردہ کیمیکل ہتھیاروں سے ان کی نسل کشی کے علاوہ جنوب کے شیعہ آبادی کا قتل عام امریکہ کی اجازت سے صدام نے ہی کرایا لیکن صدام کو سزائے موت ان 144 شیعوں کے قتل پر ہوئی جن پر صدام کا تختہ الٹنے کا الزام عائد کیا گیا تھا، یہ واحد جرم تھا جس میں امریکہ شریک نہیں تھا۔ یہ سانحہ اس لمحے سے پندرہ ماہ پہلے رونما ہوا جب رمزفیلڈ نے اپنے دورہ عراق میں صدام سے بالمشافہ ملاقات میں ایران کیخلاف امریکی حمایت اور آشیر باد کا یقین دلایا تھا۔ فروری 79ء کے ایرانی انقلاب کے چندماہ بعد یعنی جولائی 79ء میں صدام نے امریکی اشارے پر حسن البکر کی حکومت کا تختہ الٹ کر عراق پر قبضہ کرلیا۔ امریکی اشارے پر ہی ایرانی انقلاب کو تباہ کرنے کے لیے صدام نے ایران کے خلاف ایسی جنگ چھیڑی جو آٹھ سال تک جاری رہی اور اس خونی کھیل میں کم ازکم پندرہ لاکھ ایرانی اور عراقی کام آئے۔ نتیجہ دونوں ملکوں کی ناقابل تلافی جنگی اور معاشی تباہی کی شکل میں نکلا۔ عراق 75 ارب ڈالر کا مقروض ہو گیا، جس میں سے تیس ارب ڈالر کی کویت سے معافی کے جھگڑے پر صدام نے کویت پر حملہ کر دیا۔ کویت پر ناجائز قبضے کو جواز بنا کر موجودہ صدر بش کے والد سینئر بش نے صدام کو عبرت ناک شکست دی اور خلیج کی ریاستوں میں فوجی اڈے قائم کیے۔ وہ دنیا میں تیل کے سب سے بڑے ذخائر رکھنے والے ملک سعودی عرب پر بھی قابض صدام کی بدولت ہوا، امریکی فوجیں آج بھی مکہ مکرمہ سے چالیس کلومیٹر کے فاصلے پر پڑاؤ ڈالے ہوئے ہیں۔ عراق ایران جنگ کے نتیجے میں سعودی عرب کویت اور متحدہ عرب امارات کی معیشتیں ایسی تباہی سے دوچار ہوئیں کہ آج تک نہیں سنبھل سکیں۔ امریکہ نے اس جنگ کے تمام اخراجات خلیجی ملکوں سے تاوان کے طور پر وصول کیے۔ مضحکہ خیز اور تاریخ کی انوکھی مثال یہ تھی کہ عراقی فضاؤں پر امریکی عملداری تھی اور زمین پر صدام کی حکومت تھی، امریکہ کی مجبوری اور بے بسی یہ تھی کہ 91ء میں عراق سے صدام کے اقتدار کا مکمل طور پر خاتمہ بھی نہیں کیا جا سکتا تھا کیونکہ اس وقت ایرانی انقلاب اپنے شباب پر تھا جس نے مشرق وسطی سمیت پوری دنیا کو ہلا رکھا تھا۔ امریکیوں کو صدامی اقتدار کے خاتمے کے لیے مناسب وقت یعنی اپنی یہ خواہش پوری ہونے کا انتظار تھا کہ ایرانی انقلاب کا دم خم نکل جائے۔ یہ تاریخ کی عجب ستم ظریفی ہے کہ جو شخص بلاشک وشبہ امت مسلمہ کا مجرم ہے، اسے امریکہ نے سوچے سمجھے منصوبے کے تحت ہیرو بنا دیا۔ کیا ہم میں سے کوئی شخص اپنے کسی عزیز کے قاتل کو صرف اس وجہ سے معاف کر سکتا ہے کہ جب وہ تختہ دار پر چڑھا تو اللہ اکبر کے نعرے لگا رہا تھا اور اس کے ہاتھ میں قرآن مجید تھا۔ کیا دنیا کی کوئی عدالت اس عمل سے متاثر کسی قاتل کو ہیرو قرار دے سکتی ہے۔ ایرانیوں سے اس بات کی توقع کیوں کی جاتی ہے کہ وہ اپنے لاکھوں باشندوں کے قاتل کی مغفرت اور بلند درجات کی دعائیں کریں۔ صدام تختہ دار پر اللہ اور اس کی مخلوق کے سامنے اپنے سنگین جرائم پر شرمساری کا اظہار کرتا اور معافی کا خواستگار ہوتا تو شاید اسے بڑا آدمی کہا جا سکتا لیکن وہ تو آخر تک اپنے جرم پر ناز کرتا رہا۔ زندگی کے آخری لمحوں میں اپنے کرتوتوں پر شرمسار نہ ہونا اس کی شقی القلبی کی انتہاء ہے اسے اس کی ضرورت اس لیے نہیں تھی کیونکہ اس کا نہ آخرت پر ایمان تھا نہ روز جزا و سزا پر۔ صدام کو پھانسی صرف انتقام اور نفرت کے تحت نہیں، سوچ سمجھ کر دی گئی۔ عید کے دن پھانسی دے کر مسلمانوں کے لیے شاک تھیراپی کا اہتمام کیا گیا۔ امریکیوں کے لیے کوئی مشکل نہیں تھا کہ اس کے بیٹوں کی طرح اسے گولی مار کر یہ مشہور کر دیتے کہ وہ مقابلہ کرتے ہوئے مارا گیا لیکن ان

کے جنگی ماہرین نے ایک سوچی سمجھی حکمت عملی کے تحت تمام دنیا کے سامنے عدالتی سٹیج سجائی۔ شاک تھیراپی اس وقت استعمال میں لائی جاتی ہے جب کسی فرد، گروہ یا قوم کو بڑے صدمے سے دوچار کر کے اس کے ہوش و حواس مضمحل کرنا مقصود ہو۔ ایسی پھانسی دراصل اس قوم کو دی جاتی ہے جس کا وہ غلط یا صحیح ...... ہیرو ہوتا ہے۔ صدام امریکی حملے سے پہلے بڑھکیں مارتا رہا جب امریکہ نے حملہ کیا اور اس کی آٹھ لاکھ فوج 400 جنگی طیارے اور 700 سے زائد سکڈ میزائل نہ جانے زمین کی کونسی پاتال میں گم ہو گئے۔ یہ ایک ایسا راز ہے جو تین سال گزرنے کے باوجود بھی نہیں کھل سکا، دنیا خاص طور پر مسلم دنیا کے عظیم جرنیل اور دانشور بھی اس پر دماغ سوزی کرنے پر تیار نہیں ...... ہو سکتا ہے اس نامعلوم راز سے مارچ 07ء سے مارچ 08ء تک پردہ اٹھ ہی جائے، جب تک امریکہ نے چاہا نہ صرف صدام زندہ رہا بلکہ اس کا اقتدار بھی باقی رہا...... صرف اس ایک راز میں بہت سے راز پنہاں ہیں...... صدام اور اس کی فوجوں کا مقابلہ کیے بغیر دم دبا کر غائب ہونا مسلمانوں کی طویل تاریخ کا ایک عجیب حادثہ ہے۔ تمام دنیا کے جرنیل اور فوجی دانشور اب تک تو عقل ماؤف کرنے والے اس واقعہ کی توجیہ کرنے سے قاصر رہے ہیں...... سوال صرف یہ ہے کہ صدام اور اس کی فوجیں اس وقت کا انتظار کیوں کرتی رہیں کہ امریکہ عراق پر حملے کے لیے اطمینان سے اپنی فوجیں جمع کر لے۔ پتہ نہیں ہماری سائیکی میں خرابی ہے یا ہماری صدیوں کی غلامی، جہالت اور پس ماندگی کا نتیجہ ہے جس نے صدیوں سے ہمارا مزاج ہی یہ بنا کر رکھ دیا ہے کہ ہم اپنے تعصبات کے زیر اثر آ کر زیرو کو ہیرو اور ہیرو کو زیرو بنا ڈالتے ہیں۔ ہمارے اہل فکر و نظر اور دانشوروں کا اخلاقی اور انسانی فرض ہی نہیں ان پر تاریخ کا قرض ہے کہ وہ ہر قسم کے مذہبی، مسلکی، نسلی، لسانی قومی تعصبات کو بالائے طاق رکھتے ہوئے انتہائی غیر جانبداری سے حقائق کو سائنسی بنیادوں پر رکھ کر عوام کے سامنے پیش کر دیں تا کہ سچ اور جھوٹ کا فیصلہ ہو سکے۔ وقت آ گیا ہے کہ ہم اپنی اس صدیوں پرانی قبیح عادت سے نجات پائیں ورنہ ہمیں مزید صدیوں کی غلامی کے لیے تیار رہنا ہوگا۔ مغرب نے سیکولرازم کے زیر اثر اپنی ایسی عادت قبیح سے چھٹکارا پا کر اپنے تقدس مآب روحانی اور دنیاوی رہنماؤں کا اس طرح پوسٹ مارٹم کیا تھا کہ جھوٹ کو سچ بنا کر اپنی مرضی کی شکل دینا ناممکن ہو گیا۔ جنوری اور مئی جون 2007ء سے عراق اپنے مستقبل کے حوالے سے فیصلہ کن مرحلے میں داخل ہو جائے گا۔

بشکریہ (زمرد نقوی)



ٹائلٹ پیپر

فلم ایکٹر، ڈائریکٹر ٹیری جونز (Terry Jones) ''گارجین'' میں لکھتے ہیں کہ صدر جارج واکر بش کی انتظامیہ ڈیموکریٹس کی اکثریت کے اختیار میں جانے والی امریکی کانگریس سے عراقیوں کی زندگی اجیرن بنائے رکھنے کے لئے مزید ایک سو ارب ڈالر کے جنگی خرچ کی اجازت یا منظوری طلب کرنے والی ہے۔ یہ اجازت یا منظوری مل گئی تو امریکی ایوان صدر کے جنگ بازی کے شوق، کاروبار یا مرض پر اخراجات تقریباً پانچ سو ارب ڈالروں تک پہنچ جائیں گے۔

ٹیری جونز نے حساب لگایا ہے کہ عراق پر قبضہ کرنے کے شوق پر بش انتظامیہ کے یہ اخراجات اگر امریکی شہریوں میں برابر تقسیم کر دیئے جاتے تو ہر امریکی شہری کے حصے میں ایک ہزار چھ سو ڈالر آتے۔ ٹیری جونز کے خیال میں سوچا اور سمجھا جا سکتا ہے کہ اگر امریکی شہریوں سے پوچھا جاتا کہ وہ فی کس ایک ہزار چھ سو ڈالر لینا چاہتے ہیں یا مشرق وسطیٰ کے ایک ایسے عرب ملک پر بم برسانے کے لئے خرچ کرنا چاہتے ہیں جہاں کے غسل خانوں میں ٹائلٹ پیپرز استعمال نہیں ہوتے تو وہ کیا فیصلہ کرتے؟

ٹیری جونز کے مطابق صدر بش پانچ سو ارب ڈالرز کے ساتھ یہ بھی کر سکتے تھے کہ یہ رقم عراق کے باشندوں میں مساوی طور پر تقسیم کر دیتے تو ہر عراقی کو 18700 ڈالر مل جاتے اور عالمی سطح پر دہشت گردی کی وارداتوں کے اندیشہ میں کچھ کمی آ جاتی۔ ٹیری کے الفاظ میں ''مجھے پرانے خیالات کا سمجھا جاتا ہے مگر یہ سوچنے پر مجبور ہوں کسی کو 18700 ڈالر دے کر اپنے قریب لانا اس کے اوپر آسمان سے آگ برسا کر دوست بنانے سے زیادہ آسان اور یقینی ہے جبکہ اتنی رقم سے اچھی خاصی تعداد میں ٹائلٹ پیپرز خریدے جا سکتے ہیں۔''

یہ بحث کسی اور وقت کے لئے چھوڑ دیتے ہیں کہ غسل خانوں میں ٹائلٹ پیپرز کے استعمال سے لوگوں کی غربت ناپی جا سکتی ہے یا ان کے مہذب یا غیر مہذب ہونے کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے اور عراق پر قبضے کے امریکی خرچ کے موضوع پر واپس آتے ہیں۔ ٹیری جونز بتاتے ہیں کہ 2002ء میں عراق کو فتح کرنے کے خرچ کا اندازہ تقریباً پچاس ارب ڈالر لگایا گیا تھا۔ اس کے مقابلے میں پانچ سو ارب ڈالر کا خرچہ کچھ زیادہ لگتا ہے اور اگر اس قبضہ کے دوران مارے جانے والے پانچ لاکھ عراقیوں کو پیش نظر رکھا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ دنیا کی سب سے بڑی جنگی طاقت نے ہر عراقی کو قتل کرنے پر دس لاکھ ڈالر خرچ کیے ہیں۔ دولت اتنی مہنگی بھی کبھی نہیں ہوئی تھی اور انسانی زندگیوں نے بھی اتنی ارزانی کبھی نہیں دیکھی ہوگی۔

عراق میں امریکی ٹیکس دہندگان سے نچوڑے گئے ڈالر کیسے خرچ کیے جا رہے ہیں اس کا کچھ اندازہ امریکہ کے نائب صدر ڈک چینی کی سابق کمپنی کے حسابات سے لگایا جا سکتا ہے۔ یہ کمپنی ''ہیلی برٹن'' عراق میں خدمات سرانجام دینے والے ہر مزدور کے روزانہ خرچے کے 50 سے 80 ڈالر وصول کر رہی ہے جبکہ محنت کشوں کو فی کس 5 سے 16 ڈالرز تک ادا کیا جاتا ہے۔ دسمبر 2003ء میں امریکی فوج نے اس کمپنی کے ایندھن اور خوراک کے اخراجات میں 61 ملین ڈالرز اور 67 ملین ڈالرز کی ''اوور چارجنگ'' دریافت کی تھی۔

معاملات اور بھی پراسرار ہو رہے ہیں کیونکہ بتایا جاتا ہے کہ ہیلی برٹن اور اس کی ضمنی اور اضافی کمپنیوں نے اتنا اچھا بزنس کبھی نہیں کیا تھا جیسا کہ جنوری 2006ء میں ظاہر ہو رہا ہے۔ گزشتہ سال کے آغاز میں بش انتظامیہ نے ہیلی برٹن اور پینٹاگان (دفتر جنگ) کے درمیان تنازع حل کروایا تھا جس کے ذریعے ہیلی برٹن کو 19 کروڑ 90 لاکھ ڈالرز کی اضافی آمدنی ہوئی تھی۔ 26 جنوری 2006ء کو ہیلی برٹن کی انتظامیہ نے بتایا تھا کہ کمپنی نے اپنی 86 سالہ تاریخ میں سب سے زیادہ منافع کمایا ہے۔ ہیلی برٹن اور اس کے ضمنی ادارے عراق کے ٹھیکوں میں اب تک 16 ارب ڈالرز کما چکے ہیں۔

ٹیری جونز بتاتے ہیں کہ نائب صدر ڈک چینی کی سال 2005ء کی ''ٹیکس ریٹرن'' بتاتی ہے کہ انہوں نے ہیلی برٹن کے ''سٹاک آپشن'' سے ایک لاکھ 94 ہزار 862 ڈالرز کمائے ہیں یہ تو کچھ بھی نہیں ہے۔ جب ڈک چینی نے ہیلی برٹن سے علیحدگی اختیار کی تھی تو کمپنی نے Pay off کے طور پر انہیں تین کروڑ ساٹھ لاکھ ڈالر ادا کیے تھے۔ کچھ پتہ نہیں کہ یہ رقم ان کی سابقہ خدمات کی پیشگی ادائیگی تھی جو وہ بطور نائب صدر ''ہیلی برٹن'' کے بہترین مفاد میں سرانجام دے سکتے تھے اور سرانجام دے رہے ہیں اور ٹیری جونز جیسے اعتراض کرنے والوں کے اعتراضات کو اپنے غسل خانے میں بطور ''ٹائلٹ پیپرز'' استعمال کر رہے ہیں۔

بشکریہ (منو بھائی)

زمین میں عبرتیں

صدام حسین نے جس انداز میں دار پر شجاعت کا مظاہرہ کیا ہے، اس نے صدام کے آمرانہ ماضی کو قصہ پارینہ بنا دیا ہے۔ سب کے سامنے اس کی اس جرات میں وہ عسکری کارروائیاں ماند پڑ چکی ہیں جن میں اس کے ہزاروں مخالفین کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا تھا۔ مرتو سب نے ہی جانا ہے کوئی آج کوئی کل، موت سے کسی کو مفر نہیں، صدام حسین اگر آج نہ مرتا تو شاید سال بعد یا چند سال بعد کسی بیماری کی شکل میں اسباب اجل کو میسر آ جاتے، اس صورت میں صدام حسین واقعی مرجاتا اور لوگ جلد اسے ذہنوں سے بھی فراموش کر دیتے۔ ایک عرب خطیب قس بن ساعدہ ایادی نے اسلام سے بہت پہلے زندگی اور موت کے اس باریک فرق کو اپنے ایک خطبہ کے شروع میں اس انداز میں بیان کیا تھا کہ:

من عاش مات، ومن مات فات، ان فی السماء لخبرا ان فی الارض لعبرا.........

ترجمہ: جو زندہ رہا وہ مرا اور جو مرا وہ ذہنوں سے بھی گم ہوا، بے شک آسمانوں میں ایک خبر ہے اور زمین میں عبرتیں (قبریں).........

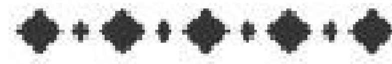
صدام حسین شاید ذہنوں سے گم ہو جاتا مگر امریکہ نے اس کے ذریعے علاقے میں جو کام لئے تھے ان کی تلخ یادیں شاید کبھی عرب عوام کے ذہنوں سے محو نہ ہوتیں لیکن اس کی پھانسی کے ڈراپ سین نے ثابت کیا کہ وہ عاقبت نا اندیش ضرور تھا مگر بزدل نہ تھا۔ صدام حسین جس وقت برسر اقتدار آیا تو امریکیوں نے سب سے پہلے اس کے ذریعے عراق کی کمیونسٹ پارٹی کا خاتمہ کروایا۔ پچاس کی دہائی میں بغداد سی آئی اے کا پسندیدہ علاقہ تھا کیونکہ یہاں پر بیٹھ کر ایران کے وطن پرست لیڈر ڈاکٹر مصدق کی حکومت کا تختہ الٹنے کے منصوبے بنائے جاتے تھے۔ ڈاکٹر مصدق کی تودہ پارٹی پر سابق سوویت یونین کی کمیونسٹ پارٹی کا اتحادی ہونے کا الزام عائد کیا جاتا تھا تیل کی دولت قومیانے کے جرم میں امریکہ اور برطانیہ کے معاشی لٹیروں نے سی آئی اے کے ذریعے ایک ''کو ڈیٹا'' ترتیب دیا اور ڈاکٹر مصدق کو راستے سے ہٹا کر شاہ ایران کی آمریت میں ایران کو امریکی اور برطانوی غلامی میں دے دیا گیا۔ اس کے بعد عراق میں عبدالکریم قاسم کی حکومت کا تختہ الٹنے کے لئے کویت کی سرزمین پر سی آئی اے نے اڈہ بنایا اور آزاد عراق ریڈیو کے نام پر قاسم حکومت کے خلاف شرپسندانہ پراپیگنڈہ شروع کر دیا اور اسے اقتدار سے محروم کروا کر پہلے حسن البکر کو اور پھر اس کے بعد صدام حسین کو تخت بغداد پر بٹھا دیا گیا۔ صدام حسین نے سی آئی اے کی فراہم کردہ لسٹوں کے مطابق عراق میں موجود عراقی کمیونسٹ لیڈروں اور ارکان کو ان کے بیوی بچوں سمیت قتل کروا دیا۔ اس قتل عام میں امریکہ اور برطانیہ صدام کے ساتھ برابر کے شریک رہے۔ اس کے

بعد صدام کی بعث پارٹی جو ایک لادین پارٹی تھی، نے کمیونسٹ روس کے ساتھ خود دوستی کی پینگیں بڑھانا شروع کر دیں۔ بعث پارٹی عالم عرب کی ایسی سیاسی جماعت تھی جس میں مذہب کے تصور کی ذرا برابر گنجائش نہ تھی۔ شام میں حافظ الاسد کی قیادت میں اس پارٹی نے ابوجہل اور ابولہب کے نام سے کلب بنا رکھے تھے ان کے نزدیک یہ افراد عرب نیشنلزم کی علامت تھے۔

زر پرست مغربی مافیا کے نزدیک لادین بعث پارٹی سوویت قربت کی حامل کمیونسٹ پارٹی کی نسبت زیادہ قابل قبول تھی۔ ایران اور عراق چونکہ شرق الاوسط کی دو ابھرتی ہوئی قومیں تھیں اس لئے اسرائیل کے وجود کو خطرات سے بچانے کے لئے اور علاقے میں تیل کے مفادات کو محفوظ کرنے کے لئے ان دونوں ملکوں کو لڑا کر کمزور کرنا مغربی صیہونی اقتصادی مافیا کے نزدیک ضروری تھا یہی وجہ ہے کہ ریگن انتظامیہ کا ادنیٰ سا گماشتہ اور امریکی ایلچی رمزفیلڈ صدام حسین کو برابر ایران کے خلاف اکساتا رہا اور پھر صدام نے ایک ایسی غلطی کا ارتکاب کیا جس کا خمیازہ نہ صرف ان دونوں ملکوں نے بھگتا بلکہ تمام امت مسلمہ ناقابل تلافی نقصان سے دوچار ہوئی۔ اس کے بعد جب امریکہ نے عملاً شرق الاوسط میں مداخلت کا ارادہ کر لیا تو بے قابو ہوتے صدام حسین کا رخ کویت کی جانب کر دیا جس کے بعد عالم عرب میں ایک ایسی آگ بھڑکی جس کے شعلے آسمان سے باتیں کر رہے ہیں۔ جب امریکیوں اور اسرائیل کے ساتھ صدام کا براہ راست واسطہ پڑا تو اسے فوراً اللہ یاد آگیا اور بعث پارٹی کے لیڈر نے عراقی جھنڈے پر اللہ اکبر کا نعرہ درج کروالیا مگر اب بہت دیر ہو چکی تھی۔

اس وقت صورت حال یہ ہے کہ عالم عرب کی اسلامی تحریکوں نے امریکی اور برطانوی شیطانی عزائم کے سامنے ایک دیوار کھڑی کر دی ہے مغرب یہاں مرضی کے مطابق اقدامات تو کر سکتا ہے مگر مرضی کے نتائج کا حصول اس کے بس کی بات نہیں یہی وجہ ہے کہ عراق سے ذلیل ہو کر نکلنے سے پہلے بش انتظامیہ نے عراقی مسلمانوں کے دو فرقوں میں نفاق کا بیج بو دیا ہے۔ امریکی سفیر اور تیل مافیا کے کارندے زلمے خلیل زاد کا عراقی وزیر اعظم مالکی کو امریکی سفارت خانے میں طلب کرنا اور عیدالاضحیٰ کے روز صدام کو پھانسی دینے کا حکم دینا امریکی فرقہ واریت کی سوچ کا عکاس ہے۔ صدام پھانسی چڑھا اور خوب چڑھا جس سے ثابت ہوا وہ ظالم ضرور تھا مگر بزدل نہیں۔ بے شک زمین میں بہت سی عبرتیں ہیں۔

بشکریہ (محمد انیس الرحمان)



بغداد پر تیسرے ہلاکو کا حملہ

17 جنوری 2003ء کو تقریر کرتے ہوئے اس وقت کے عراقی مرد آہن صدام حسین نے کہا تھا کہ بغداد کی زمین پر خدا کا نیزہ تھا اور عربوں کے کاسۂ سر دانش اور رفعت نشان عرب ورثے کا سرچشمہ رہے ہیں۔ ان کی تقریر کی یہ چند سطریں پڑھتے ہوئے میں تاریخ میں بغداد کا سراغ تلاش کرتی ہوں۔

1800 قبل مسیح حمورابی کی ایک قانونی دستاویز میں ایک شہر 'بگداد' کا نام آیا ہے۔ ایک روایت کے مطابق اس شہر میں 'بغ' نام کا ایک بت تھا، اسی لیے یہ شہر 'بغ داد' کہلایا۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ یہ بادشاہ نوشیرواں کا وہ باغ تھا جہاں وہ انصاف کرتا تھا اور اسی لیے یہ جگہ 'باغ داد' کہی گئی یعنی وہ باغ جہاں انصاف ملتا ہو۔ کچھ اس کا رشتہ آرامی زبان سے جوڑتے ہیں، جس سے مطلب 'بھیڑوں کا باڑہ' نکلتا ہے۔

یہ بستی جو 'بگداد' 'باغ داد' اور پھر 'بغداد' کہلائی، واقعی 'بھیڑوں کا باڑہ' ہے جس پر ہر زمانے میں بھیڑیے ٹوٹتے رہے۔ یہ 9 ویں صدی قبل مسیح میں لوٹا گیا اور سینکڑوں برس تک ایک گم نام بستی رہا۔ اس کی قسمت اس وقت جاگی جب عباسی خلیفہ منصور نے اسے اپنے دارالخلافہ کے طور پر منتخب کیا، اس کی تعمیر کا کام اگست 762ء سے شروع ہوا، جس میں ایک لاکھ مزدوروں نے حصہ لیا۔ اور پھر بغداد دنیائے اسلام کا وہ شہر بن گیا جو سلطنتوں کی تقدیر کے فیصلے کرتا تھا اور جہاں کی دولت و حشمت کے قصے فرنگیوں کو اپنی طرف کھینچ لاتے تھے۔

اور پھر بغداد کے عروج کے دامن سے زوال کی گرد بھی لپٹی۔ اس زوال کا آغاز فرقہ وارانہ اور نسلی فسادات سے ہوا۔ وہ خلیفہ جو دور دراز کے ملکوں میں صاحب اقتدار بن بیٹھنے والے طالع آزماؤں کو اپنے دربار سے سندِ حکمرانی عطا کرتا تھا، وہ اپنے دارالخلافہ میں اپنا حکم منوانے سے قاصر ہوتا چلا گیا۔ بغداد کبھی شیعہ سنی فساد کا نشانہ بنا، کبھی حنبلی اور شافعی دست و گریباں ہوئے۔ یہ ایسے بھیانک فسادات تھے جن میں ہر مرتبہ دونوں طرف کے ہزار ہا افراد مارے گئے، گھر اور محل لوٹے گئے، ایک فرقے کی عورتیں دوسرے فرقے کے لیے مال غنیمت بنیں۔ یہودی جو چالیس ہزار کی تعداد میں بغداد کے شہری تھے، ان پر حملہ ہوا، ان کی جان، مال اور آبرو کچھ بھی محفوظ نہیں رہی۔ دو سے تین سو برس کے اس انتشار اور افتراق نے خلافت عباسیہ کو کھوکھلا کر دیا اور جب ہلاکو خان غول بیابانی کی طرح بغداد پر نازل ہوا تو چند دنوں کی مزاحمت کے بعد تاتاریوں کا ٹڈی دل سلطنت عباسیہ کی عظمت و شوکت کو یوں چاٹ گیا جیسے وہ کبھی موجود ہی نہیں تھی۔ ہلاکو نے لاکھوں کا سر اڑا دیا، کروڑوں کی دولت اپنے چھکڑوں پر بار کی۔ ہزار ہا

عورتوں کو باندی بنایا اور ہزاروں مرد غلام ہوئے۔ ہر شاندار عمارت، ہر مقدس مقبرہ مسمار کیا گیا اور دجلہ کی لہریں لاکھوں کتابوں کی راکھ کو مہینوں بہا کر لے جاتی رہیں، اس راکھ میں ان شہریوں کا خون بھی شامل تھا جو زندہ تھے تو مسلمان، عیسائی، یہودی، سنی، شیعہ، حنبلی اور شافعی تھے۔ تاتاری تلواروں سے قتل ہوئے تو ان کا سرخ لہو یک جان ہو کر دجلہ کی لہروں کو اپنے رنگ میں رنگتا رہا۔ تاریخ اسلام کا یہ وہ سانحۂ عظیم ہے جس نے مسلمانوں کی تاریخ کا رخ بدل دیا۔ ہلاکو ستارہ پرست تھا جبکہ تیمور لنگ کو مسلمان مؤرخین 'الامیر الکبیر' اور 'صاحب قرآن' لکھتے رہے وہ حیات تھا تو اسے 'سلطان' لکھا گیا، موت کا نوالہ بنا تو 'جنت مکان' کے لقب سے یاد کیا گیا۔ یہ وہ سلطان تیمور ہے جس کے بارے میں مسلمان مؤرخین یہ کہتے ہیں کہ "حامی اسلام ہونے کی حیثیت سے تیمور علماء اور نو ظہور سلسلہ نقشبندیہ کی بڑی پاسداری کیا کرتا تھا اور جب کبھی وہ جنگ کے لیے نکلتا تو صلحاء، علماء، ادیبوں اور فن کاروں کا ایک جم غفیر اس کے ہم رکاب ہوتا تھا۔"

ہمارے اس اسلامی ہیرو کے "حامی اسلام" ہونے کا اندازہ اس امر سے کیا جا سکتا ہے کہ کبھی وہ ماوراء النہر پر عمر شیخ کے خلاف لشکر کشی کرتا ہے، کبھی سلطان احمد جلائر کو شکست دیتا ہے۔ اہل اصفہان بغاوت کرتے ہیں تو وہاں کے ستر ہزار باشندے تہ تیغ کیے جاتے ہیں۔ غیاث الدین "روز نامۂ غزوات ہندوستان" میں لکھتا ہے کہ "کشتگان کی کھوپڑیوں سے جو مینار بنائے گئے وہ بلند عمارتوں سے بھی اونچے ہو گئے۔" یہ "حامی اسلام" ہندوستان پر حملہ آور ہوا۔ دلی فتح کی، 80 ہزار لوگوں کا قتل عام کیا، کروڑوں کا مال و متاع اور عورتیں ساتھ لے گیا۔ اس کے ہاتھوں سلطان بایزید کا جو انجام ہوا، اس سے تاریخ کا ہر طالب علم آگاہ ہے۔ ابھی بغداد کے سقوط کو بہ مشکل ڈیڑھ صدی گزری تھی کہ تیمور لنگ اپنی شہنشاہیت کا اعلان کرتا ہوا بغداد پر نازل ہو گیا۔ چالیس ہزار شہری تہ تیغ ہوئے جو کچھ ایک سو چالیس برس کے اندر تعمیر ہوا تھا وہ اس "حامی اسلام" کے ہاتھوں برباد ہوا۔

بغداد اس کے بعد بھی چین سے نہیں رہا، چھوٹے بڑے حملے اور تاخت و تاراج اس شہر کا مقدر رہی۔ یہاں کبھی اموی خاندان کے شہزادوں کے تڑپتے ہوئے لاشوں پر دسترخوان چنے گئے اور کبھی ہلاکو اور تیمور لنگ کے ہاتھوں اس کے شہریوں کی کھوپڑیاں مٹی اور گارے کے میناروں میں چنی گئیں۔ بیسویں صدی میں بھی یہ شہر کئی مرتبہ دریائے خوں میں نہایا۔ اور یہ کوئی پرانا قصہ تو نہیں ہے جب بعث پارٹی نے بغاوت کی، شاہ فیصل دوم اور نوری السعید کو صرف قتل ہی نہیں کیا گیا، ان کی لاشیں برسر عام پہلے الٹی لٹکائی گئیں اور پھر لوگ انہیں سڑکوں پر گھسیٹتے پھرے۔ یہاں تک کہ وہ ریزہ ریزہ ہو گئیں۔ ان کا بھی یہ عالم ہے کہ "ہمیں یاد ہے سب ذرا ذرا، تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو۔"

صدام نے 17 جنوری 2003ء کی تقریر میں کہا تھا کہ تاریخ دائروں میں سفر کرتی ہے لیکن ہر زمانے کے حوالے سے اس دہرائے جانے کے عمل میں نام، کردار اور مقامات بدل جاتے ہیں۔ آج بغداد پر تیسرے ہلاکو کا حملہ بھی تاریخ کے دہرائے جانے کے عمل کا ایک عکس ہے۔ نام اور کردار بدل گئے ہیں لیکن بغداد کی غارت گری میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی گئی۔ یہ بھی تاریخ کا ایک المناک مذاق ہے کہ جس طرح ہلاکو کی فوجوں کو اپنے اوپر چڑھا کر لائے تھے، اسی طرح اس بار بھی صدام حسین خود ہی تیسرے ہلاکو کی فوجوں کو بغداد کی فصیلوں کے اندر لانے کا سبب بنے۔

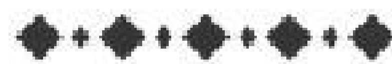
1258ء میں ہلاکو نے شہر تاراج کیا تھا، 1401ء میں یہی سب کچھ تیمور لنگ نے کیا اور 2003ء میں بھی تاریخ دہرائی گئی۔

آج کا بغداد جہاں پانچ ہزار برس کی عظیم الشان تاریخ کے آثار قومی عجائب گھر میں محفوظ تھے۔ اشوریوں، سمیریوں، کلدانیوں، میدیوں اور بعد کی اقوام کے وہ نوادرات جو زمین کی گہرائیوں سے نکالے گئے تھے، انہیں حملہ آور فوجیوں نے نہیں "نامعلوم" شہریوں نے یوں خاک میں ملایا کہ اب ان کے ٹکڑے بھی نہیں جوڑے جاسکتے، ہر الماری کے شیشے توڑ دیے گئے اور اس میں محفوظ آثار قدیمہ کو نابود کر دیا گیا، پھر باری قومی لائبریری کے نادر ترین مخطوطے، نایاب کتابیں، وہ قرآنی نسخے جن کا کوئی عکس بھی موجود نہیں، مٹی کا تیل چھڑک کر نذر آتش کیے گئے۔ عراق کی تہذیب اور تاریخ گھنٹوں میں نیست و نابود کر دی گئی۔ اس "کام" سے پہلے امریکہ کی عاید کردہ پابندیاں اور حملہ لاکھوں بچوں، بوڑھوں، عورتوں اور مردوں کو فاقوں، گولیوں اور کلسٹر بموں سے ختم کر چکا تھا۔ مقدس مقامات کی بے حرمتی ہو چکی تھی اور عورتیں روندی جا چکی تھیں۔

بغداد پر قبل مسیح سے 1258ء، 1401ء اور پھر آج تک اپنے اپنے دور کے ہلاکو حملہ آور ہوتے رہے ہیں۔ تیسرا ہلاکو امریکا ہے جس نے اپنے تمام اخلاقی، سیاسی اور قانونی اصول روند کر رکھ دیے۔ ہلاکو یا تیمور لنگ نے انسانی حقوق کا عالمی منشور نہیں مرتب کیا تھا، ہیومن رائٹس کمیشن نہیں بنائے تھے، کسی جنیوا کنونشن پر دستخط نہیں کیے تھے۔ وہ کتابوں اور نادر مخطوطوں کی اپنے شہروں میں نمائش نہیں کرتے تھے، وہ میدانوں اور صحراؤں سے اٹھنے والے وحشی اور طاقت و جبروت کے ماننے والے تھے لیکن اکیسویں صدی کے ہلاکو کے بارے میں کیا کہا جائے کہ اسے انسان پرستی کے دعوے ہیں۔ اس کے لوگ چاند کو تسخیر کر چکے اور دور دراز کے سیاروں پر ان کے سیارچے اتر چکے۔ اس فرعونیت اور ہامانیت کا حساب کون لے گا؟ افغانی اور عراقی، ویت نامی اور جاپانی، کوریائی اور سلواڈوری نہیں لے سکتے، لیکن وقت سے بڑا منتقم المزاج بھلا کون ہو سکتا ہے۔ صدام حسین نے 17 جنوری 2003ء کو کہا تھا کہ ہر وہ فرد جس کی روح اور بدن میں ہلاکو کا ارادہ اور عمل پل رہا ہے وہ بغداد کی فصیلوں کے سائے میں خودکشی کرے گا۔ ان کا یہ دعویٰ تو پورا نہ ہو سکا لیکن یہ بات اب نوشتۂ دیوار ہو چکی ہے کہ اکیسویں صدی کا ہلاکو اپنے کبر و نخوت کے خنجر سے خودکشی کرے گا۔ ناانصافیوں اور بے رحمیوں کے تیر پلٹ کر آتے ہیں اور ظالم و بے رحم کے بدن میں پیوست ہو جاتے ہیں۔

کچھ ظالم اور بے رحم اپنے ہی تیروں کا شکار ہو چکے، کچھ کی گھات میں وقت بیٹھا ہے اور وقت سے بڑا شکاری کائنات میں موجود نہیں۔

بشکریہ (زاہدہ حنا)



صدام میرا ہیرو نہیں تھا

صدام حسین کبھی میرا ہیرو نہیں تھا، ڈکٹیٹر ہونے کی وجہ سے میں اسے پسند نہیں کرتا تھا لیکن جس سج دھج سے وہ مقتل کو گیا اس نے عالمی سامراج کے خلاف برسر پیکار مسلمانان عالم کے سر فخر سے بلند کر دیئے۔ کسے خبر تھی کہ 28 اپریل کو عراقی قصبے تکریت میں پیدا ہونے والا یتیم بچہ بہت جلد عراقی سیاست پر چھا جائے گا۔ کم و بیش 25 سال عراق کے سیاہ سفید کا مالک رہا۔ عراق کی المناک تاریخ ہے، حکومتیں قتل و غارت سے ہی تبدیل ہوتی رہی ہیں۔ حکمرانوں کی لاشیں سڑکوں پر گھسیٹی جاتی رہی ہیں لیکن صدام حسین تو اپنوں کی بجائے غیروں کے ہاتھوں مارا گیا اور شہادت کا رتبہ پا گیا۔ صدام حسین نے عراق کو عسکری لحاظ سے اس قدر مضبوط بنا لیا کہ وہ نہ صرف اسرائیل کے لئے ایک بہت بڑا خطرہ بن گیا بلکہ مشرق وسطیٰ کے دیگر ممالک بھی اس کی عسکری قوت سے خوفزدہ نظر آتے تھے۔ اس نے ایک ایسے جنگجو کی حیثیت سے شہرت پائی جس نے ہمیشہ اپنے ہمسایوں پر چڑھائی کی۔ وہ 1980ء سے 1988ء کے دوران ایران کے ساتھ برسر پیکار رہا' اس لاحاصل جنگ میں اڑھائی لاکھ عراقی مارے گئے۔ اس سے کہیں زیادہ ایرانی جنگ میں کام آئے' اس جنگ میں اسے امریکہ کی آشیرباد حاصل تھی' لیکن جب اس نے 1990ء میں کویت پر قبضہ کر لیا تو امریکہ نے اپنے اتحادیوں کے ساتھ مل کر عراق پر حملہ کر دیا جس کے باعث عراق کو کویت سے نکلنا پڑا۔ اس جنگ میں عراق کو نہ صرف بے پناہ جانی و مالی نقصان اٹھانا پڑا بلکہ اس کی عسکری قوت کو تباہ کر دیا گیا سینئر بش نے عراق کی کمر توڑ دی لیکن وہ عراق کی مکمل تباہی کے عزائم کو پایہ تکمیل تک نہیں پہنچا سکا لیکن جونیئر بش نے نائن الیون کی آڑ لیکر اتحادی فوجوں کی مدد سے عراق پر قبضہ کر کے اپنے باپ کے عزائم کی تکمیل کر دی۔ پورا عالم اسلام امریکہ کی عسکری طاقت کے سامنے خاموش تماشائی بنا رہا۔ اسرائیل کو اس بات کی خوشی تھی کہ مشرق وسطیٰ میں اس کے سب سے بڑے دشمن عراق پر امریکہ نے قبضہ کر لیا ہے جبکہ ایران سمیت مشرق وسطیٰ کے وہ تمام ممالک جو عراق کی عسکری قوت سے خوفزدہ تھے، نے عراق پر امریکی قبضے پر اطمینان کا سانس لیا۔ امریکہ نے کیمیائی ہتھیار برآمد کرنے کے لئے عراق پر حملہ کیا لیکن وہ عراق سے نیوکلیئر یا کیمیائی ہتھیار برآمد نہ کر سکا۔ 19 مارچ 2003ء کو امریکہ نے اپنے اتحادیوں کی مدد سے عراق پر حملہ کیا تو صدام حسین روپوش ہو گیا لیکن اپنوں کی مخبری پر اسے 13 دسمبر 2003ء میں ان کے آبائی قصبے سے تلاش کر کے گرفتار کر لیا گیا۔ اس کے خلاف 5 نومبر 1982ء کو دجیل گاؤں میں 148 شیعوں کی ہلاکت کے خلاف ایک قابض فوج کی عدالت میں قتل کا مقدمہ چلایا گیا محکوم قوم کے سابق صدر کو نام نہاد عدالت کے ذریعے عالمی سامراج نے موت سے کم سزا کیا

دیتا تھی عالمی انسانی اداروں، یورپ، بھارت اور عالم اسلام نے ان کو سزائے موت دینے کی مخالفت کی حتیٰ کہ نام نہاد عراقی صدر نے بھی صدام حسین کو سزائے موت دینے کے فیصلے پر عمل درآمد سے اختلاف کیا لیکن امریکہ یہ بات بخوبی سمجھتا تھا کہ موت سے کم سزا عراق میں تحریک مزاحمت کو کم نہیں کرسکتی اس لئے پانچ نومبر 2006ء میں سزائے موت سنائی گئی اور ڈیڑھ ماہ سے زیادہ عرصہ گزرنے نہ پایا تھا کہ 30 دسمبر 2006ء کو عید الاضحیٰ کے روز صدام حسین کو تختہ دار پر لٹکا دیا گیا۔ یہ امریکی حکام کی خوش فہمی ہے کہ صدام حسین کے سیاسی منظر سے ہٹ جانے سے تحریک مزاحمت کمزور ہو جائے گی یا اپنے منطقی انجام کو پہنچ جائے گی ۔ اب تک عراق کی جنگ میں تین ہزار امریکی فوجی کام آچکے ہیں۔ صدام حسین کی شہادت کے بعد یہ سلسلہ ختم ہوتا نظر نہیں آتا۔ صدام حسین جرات و بہادری سے جس طرح تختہ دار پر چڑھ گیا اس سے ایک بار پھر انہوں نے عربوں کی بہادری کی یاد تازہ کردی ہے۔ صدام حسین نے بغداد کے قریب امریکی جیل میں اپنے دو سوتیلے بھائیوں سے الوداعی ملاقات میں کہا کہ انہیں اس بات پر خوشی ہے کہ وہ جیل میں مرنے کی بجائے دشمن کے ہاتھوں شہادت کا رتبہ حاصل کرنے کی سعادت حاصل کر رہے ہیں۔ صدام حسین نے اپنے آخری خط میں عراقی عوام کو اتحاد قائم رکھنے کی تلقین کی ہے اور کہا ہے کہ جابر ممالک کا اتحاد کے ساتھ ہی مقابلہ کیا جاسکتا ہے۔ حملہ آور دشمنوں کے سامنے عراقیوں کا اتحاد ہی سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ صدام حسین کی پھانسی عراق کو تین حصوں میں تقسیم کرنے کے امریکی ایجنڈے کا حصہ ہے۔ کیونکہ امریکہ نے صدام حسین کو پھانسی کی سزاء دلوا کر عراق میں شیعہ سنی تفریق بڑھانے کی کوشش کی ہے۔ بغداد کی تاریخ کشت وخون کی تاریخ ہے ہی لیکن جس شان سے صدام حسین مقتل کو گیا تاریخ نے اسے ایک ایسے ہیرو کی طرح امر کردیا ہے جسے صدیوں یاد رکھا جائے گا۔ صدام حسین نے پھانسی کے وقت قرآن پاک اٹھا رکھا تھا اور نعرہ تکبیر اللہ اکبر بلند کر کے جدید تاریخ کی سب سے بڑی ناانصافی کی بھینٹ چڑھ گیا۔ صدام حسین نے اپنے اقتدار کو طوالت بخشنے کے لئے اپنے مخالفین کو موت کے گھاٹ اتارا اور ان کی اجتماعی قبریں دیکھ کر اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ کس طرح انہیں ہلاک کیا گیا۔ اس نے اپنے مخالفین کا عرصہ حیات تنگ کردیا حتیٰ کہ اس نے اقتدار کو چیلنج کرنے والے اپنے دونوں دامادوں کو بھی معاف نہیں کیا۔ ان کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ اسے ایک ''ظالم حکمران'' کے طور پر شہرت حاصل تھی ۔ اس کے بارے میں یہ تاثر بھی تھا کہ وہ امریکہ کا ایجنٹ ہے لیکن جب اس کی امریکہ سے ٹھن گئی تو امریکہ نے اس کے اس جرم کو معاف نہیں کیا اور پھر اسے اس طرح مارا کہ اس کے تمام جرائم ختم ہوگئے اور وہ زیرو سے ہیرو بن گیا۔ صدام حسین نے تیل کی آمدنی کا بڑا حصہ عراق کو عسکری قوت بنانے پر صرف کیا۔ تاہم دیگر عرب حکمرانوں کی طرح ریاستی وسائل سے حاصل ہونے والی آمدنی کو ذاتی تصرف میں نہیں لایا۔ صدام حسین نے 70 سے زائد محلات بنائے لیکن اس کے دور حکومت میں تعلیم اور صحت کی سہولتیں مفت فراہم کی جاتی تھیں۔ اس کی جنگجویانہ پالیسی کی وجہ سے عراق پر مختلف پابندیاں عائد کی گئیں۔ لاکھوں عراقی باشندے بالخصوص بچے ادویات نہ ملنے کی وجہ سے زندگی کی بازی ہار گئے۔ لیکن یہ بات ریکارڈ پر موجود ہے۔ اس کے دور میں کوئی عراقی بھوکا نہیں مرا۔ یہ بات قابل ذکر ہے جب صدام حسین کو پھانسی لگائی جارہی تھی تو اس وقت وہ کلمہ طیبہ، درود شریف کا ورد کر رہا تھا اور پھانسی کے وقت نعرہ تکبیر بلند کیا۔ اس کی پھانسی کے ان مناظر کو موبائل ٹیلیفون کے کیمرے نے محفوظ کرلیا ہے۔ جس سے صدام حسین کی بہادری وجرات کو دیکھا جاسکتا تھا۔ جب صدام حسین کو امریکی حکام نے پھانسی کے لئے عراقی حکام کے حوالے کیا تو صدام حسین نے انہیں ایک لمحہ کیلئے بھی اس تاثر کا احساس نہیں ہونے دیا کہ وہ موت

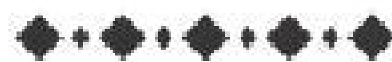
سے خوفزدہ ہیں۔انہوں نے موت کا پروانہ جاری کرتے پر امریکی حکام کا شکریہ ادا کیا۔فیض احمد فیض نے ان ہی لمحات کیلئے یہ شعر کہا تھا

جس دھج سے کوئی مقتل میں گیا وہ شان سلامت رہتی ہے

یہ جان تو آنی جانی ہے اس جان کی کوئی بات نہیں

صدام نے کہا کہ "عراق تا ابد قائم رہے گا۔فلسطین عربوں کا ہے" صدام حسین کو گرین زون کے نواح میں واقع خادمیہ میں قائم جیل کے اندر پھانسی دی گئی جو بغداد میں سب سے زیادہ محفوظ علاقہ تصور کیا جاتا ہے۔اس احاطے کو امریکی کیمپ جسٹس (مقام انصاف) کہتے ہیں۔یہی وجہ ہے مسلمانانِ عالم کی اکثریت یہ کہتی ہے کہ دنیا کی سب سے بڑی ناانصافی "مقام انصاف" پر کی گئی ہے۔جب صدام حسین کو پھانسی کے تختہ پر لے جایا جارہا تھا تو سکیورٹی کے ایک اہلکار نے اپنے دوسرے ساتھی سے کہا کہ" آج صدام حسین کو موت سے ڈرلگ رہا ہوگا۔تو وہ ان کی یہ بات سنکر رک گیا اور مڑ کر اس اہلکار کو مخاطب ہو کر کہا کہ "ساری زندگی موت سے کھیلتا رہا ہوں اور کافروں سے لڑتا رہا ہوں آج موت سے خوفزدہ نہیں" جب صدام حسین کو پھانسی دینے کے لئے انہیں نقاب پہنانے کی کوشش کی گئی تو انہوں نے یہ کہہ کر نقاب پہننے سے انکار کر دیا کہ "میں موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھنا چاہتا ہوں" صدام حسین اپنے مخالفین سے خوفناک انتقام لیتے تھے ان کے کم و بیش 25 سالہ اقتدار میں ایک لاکھ کرد، شیعہ اور بعث پارٹی کے مخالف مارے گئے ان کو دورِ جدید کا ہٹلر اور مسولینی کہا گیا لیکن پچھلے ساڑھے تین سال میں عراق کی خانہ جنگی اور مزاحمتی تحریک میں چھ لاکھ عراقی مارے جاچکے ہیں۔18 لاکھ عراقی بیرون ملک چلے گئے ہیں جبکہ ہر ماہ ایک لاکھ افراد عراق چھوڑ کر جارہے ہیں صدام حسین کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ جو انصاف اس نے اپنی زندگی میں اپنے مخالفین کو نہیں دیا وہ انصاف انہیں اقتدار سے معزولی کے بعد نہ مل سکا۔عراقی قوانین کے مطابق کسی شخص کو عید یا حج کے روز پھانسی نہیں دی جاسکتی لیکن امریکیوں نے عید الاضحیٰ کے روز مسلم امہ کو صدام حسین کی پھانسی کا تحفہ دیا۔عسکری امور کے ماہر لیفٹیننٹ (ر) جنرل حمید گل نے صدام حسین کی موت کو المیہ قرار دیتے ہوئے کہا کہ جب تک امریکہ کو صدام حسین کی ضرورت تھی وہ اس سے کام لیتا رہا لیکن جب اس کی ضرورت نہ رہی تو تختہ دار پر لٹکا دیا۔انہوں نے پوری دنیا میں امریکی اشاروں پر کام کرنے والے حکمرانوں کو متنبہ کیا کہ وہ امریکہ کے آلہ کار نہ بنیں۔صدام حسین اُسامہ بن لادن اور ملا عمر مسلمانوں کے کبھی آئیڈیل نہیں رہے لیکن امریکہ کے خلاف مزاحمتی تحریک میں حصہ لینے کے باعث انہوں نے عالم اسلام میں اپنا مقام بنالیا۔مزاحمتی تحاریک کے نتیجے میں امریکہ کو امت مسلمہ پر اپنا تسلط جمانے کی پالیسی پر نظرثانی کرنا ہوگی۔امریکی عوام بذات خود بہت اچھے ہیں وہ دنیا میں انصاف و آزادی کے علمبردار ہیں لیکن نہ جانے ان کی حکومتیں یہودیوں کے زیرسایہ آکر مسلمانانِ عالم کے خلاف کیوں صف آرا ہیں اب امریکہ افغانستان اور عراق کے بعد ایران کے خلاف جنگ مسلط کرنے کی سوچ رہا ہے لیکن اسے یہ بات ذہن میں رکھنی چاہیے کہ ایران، افغانستان یا عراق ثابت نہیں ہوگا بلکہ اسے ایرانیوں کی جانب سے شدید مزاحمت کا سامنا کرنا پڑے گا۔

بشکریہ (نواز رضا)



عالم اسلام کے اتحاد کی ضرورت

عراق پر بلاشرکت غیرے مسلسل 23 سال تک حکمرانی کرنے اور اپنے دور اقتدار میں عراقی عوام کو ترقی وخوشحالی کی منزل سے ہمکنار اور تعلیم وصحت کی سہولتوں سے آراستہ کرنے والے صدام حسین کو جس توہین آمیز انداز میں پھانسی کے تختے تک لے جایا گیا' وہ انسانیت کے خلاف ہی جرم نہیں' مسلمانوں کے جذبات دانستہ طور پر برانگیختہ کرنے کی کوشش بھی نظر آتی ہے۔ انہیں مسلمانوں کے مذہبی تہوار عیدالاضحیٰ کے روز پھانسی دینا بھی اسی امریکی سازش کا حصہ نظر آتا ہے جس کے تحت عالم اسلام کو منتشر کرنا مقصود ہے۔

صدام حسین کو پھانسی کی سزا قانون کا انصاف نہیں' فاتح کا انصاف تھا جس کی نشاندہی خود امریکہ کے انسانی حقوق کے ایک ادارے ہیومن رائٹس واچ کی جانب سے اپنے ردعمل کے ذریعہ کی جاچکی ہے۔ انہیں جن جرائم کے الزام میں موت کی سزا دی گئی' وہ اس دور کے جرائم ہیں' جب صدام حسین امریکہ کے آلہ کار بن کر اس کے مقاصد کی تکمیل کر رہے تھے اور یہ مقاصد بھی عالم اسلام کو منتشر کرنے کی امریکی منصوبہ بندی کا حصہ تھے' جب تک صدام حسین امریکہ کے ہاتھ میں کھلونا بنے رہے' انہیں امریکہ کی پشت پناہی حاصل رہی اور جب انہوں نے امریکہ کی مزید ڈکٹیشن قبول کرنے سے انکار کیا تو امریکہ نے نہ صرف انہیں نشان عبرت بنانے کی ٹھان لی بلکہ اس عمل میں شیعہ سنی تنازعہ کو فروغ دے کر مسلمانوں کو آپس میں لڑانے کا منصوبہ بھی تیار کرلیا' جس انداز میں صدام حسین کو پھانسی پر لٹکایا گیا' وہ سب امریکی گیم پلان کی چغلی کھا رہا ہے۔ ان کی پھانسی کے لیے عیدالاضحیٰ کے دن کا اسی لئے انتخاب کیا گیا کہ مسلمانوں کے زخموں پر نمک پاشی کی جائے حالانکہ مروجہ قانون کے تحت صدام حسین کی اپیل مسترد ہونے کے بعد 30 دن کے اندر اندر ان کی سزا پر عمل درآمد ہونا تھا' جس کے لئے جلد بازی ضروری نہیں تھی جبکہ متعدد ممالک کی جانب سے عراق کی امریکی کٹھ پتلی حکومت سے اپیل بھی کی جارہی تھی کہ ان کی پھانسی کی سزا پر عمل درآمد نہ کیا جائے۔ انہیں عید کے روز پھانسی دینا اور اس کے لئے اس وقت کا انتخاب کرنا' جب عراق کی مساجد میں فجر کی اذانیں دی جارہی تھیں' اس امر کی غمازی کر رہا ہے کہ کام ذاتی انتقام کے جذبے کے ساتھ ساتھ امریکی آقاؤں کو خوش کرنے کی نیت سے کیا جارہا تھا۔

پہلے تو صدام حسین کے خلاف مقدمہ کی سماعت کے لئے کر دجوں کا انتخاب کیا گیا جو ان کے معاملہ میں انصاف کے تقاضے پورے کر ہی نہیں سکتے تھے پھر ان کی سزائے موت پر عمل درآمد کے لئے اس عملہ کا انتخاب کیا گیا جو ان کے کٹر مخالفین میں شمار ہوتے تھے تاکہ صدام حسین کو نشان عبرت بنانے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہ دیا جائے۔

صدام حسین کی پھانسی کے لمحات پر مشتمل جو ویڈیو فلمیں جاری ہوئی ہیں' ان سے صاف نظر آتا ہے کہ صدام حسین اس وقت مزاحمت کے بجائے تعاون پر آمادہ نظر آئے تھے اور اپنے طرز عمل کے ذریعہ ایسا کوئی تاثر نہیں دینا چاہتے تھے جو ان کی پھانسی کے بعد شیعہ سنی کے حوالے سے مسلمانوں میں کسی افتراق وانتشار کا باعث بنے مگر انہیں پھانسی دینے والے عملہ کی حتی الوسع یہ کوشش رہی کہ صدام حسین کی توہین کرکے انہیں مشتعل

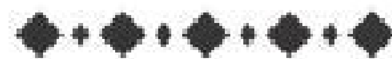
کیا جائے اور ان کی زبان سے ایسے الفاظ نکلوائے جائیں جو اہل تشیع اور ان کے مقبول لیڈر مقتدا الصدر کی مخالفت میں ہوں تا کہ اس کی بنیاد پر شیعہ سنی فسادات کی راہ ہموار کی جا سکے۔ مگر صدام حسین نے اپنے ساتھ ہونے والے ناروا سلوک کے باوجود اپنی زندگی کے آخری لمحات میں انتہائی صبر و تحمل اور دور اندیشی کا مظاہرہ کیا اور اپنی زبان سے مقتدا الصدر کے حق میں نعرے لگائے گئے جس کا مقصد محض صدام حسین کو مشتعل کرنا تھا۔ صدام حسین نے اس موقع پر ماسوائے اس کے کہ انہیں دھکے دے کر تختہ دار تک لانے والے سیکورٹی گارڈ کی طعنہ زنی کا یہ کہہ کر جواب دیا کہ عراق کو میں نے نہیں' امریکہ نے برباد کیا ہے اور میں نے عراقی عوام کو غربت اور محتاجی سے بچایا ہے' انہوں نے فرقہ واریت کے حوالے سے کوئی ردعمل ظاہر نہ کیا۔

صدام حسین نے تو موت کو اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھ کر بھی اور پھر پھانسی کا پھندا اپنے گلے میں ڈالتے ہوئے بھی تدبر اور فہم و فراست کا مظاہرہ کیا اور مسلمانوں کے اتحاد کا درس دیا مگر ان کی پھانسی کی صورت میں اپنے انتقام کی آگ بجھانے والوں نے انسانیت کی بھی پرواہ نہ کی اور صدام حسین کے ماضی کے مقام و مرتبہ کا بھی خیال نہ رکھا اور وہ اس اندوہناک مرحلہ میں بھی اسلام دشمنوں کے عزائم کی تکمیل کی راہ ہموار کرتے رہے۔ صدام حسین کی المناک پھانسی کے بعد عالم اسلام بالخصوص عراقی عوام میں اس وقت غم و غصہ لہر پیدا ہو چکی ہے اور عراقی عوام پھانسی کے وقت صدام حسین سے توہین آمیز سلوک پر مظاہروں کے ذریعے اپنے غم و غصے کا اظہار کر رہے ہیں۔

اسلام دشمن طاغوتی طاقتوں کی تو یہی کوشش رہی ہے کہ مسلمانوں کو آپس میں لڑا کر ان کے اتحاد و یکجہتی کو پارہ پارہ کر دیا جائے۔ اب بھی صدام حسین کے حوالے سے اہل تشیع کے جذبات برانگیخت کرنے کی سازش جاری ہے جبکہ پھانسی کے وقت ان کے ساتھ ننگ انسانیت سلوک کرنے کا مقصد مسلمانوں میں فرقہ واریت کی آگ کو تیز کرنا تھا کیونکہ یہی مسلمانوں کا ایک کمزور پہلو ہے جس کی بنیاد پر وہ باہم دست و گریباں نظر آتے ہیں۔ مسلمانوں کے مذہبی جذبات سے کھیل کر امریکہ اور اہل مغرب تو دین اسلام کے خلاف اپنے کروسیڈی جذبات کی تسکین کی شعوری کوشش کر رہے ہیں اور ہمیں اب بھی سمجھ نہیں آ رہی ہے۔

اس موقع پر تمام مسلم ممالک بالخصوص ایران کی ذمہ داری بنتی ہے کہ وہ عالم اسلام کا اتحاد برقرار رکھنے کے لئے اقدامات کریں اور صدام حسین کی پھانسی کے بعد ابھرنے والے شیعہ سنی جذبات کو اشتعال اور انتشار کی جانب نہ جانے دیں۔ اگر ایران کی جانب سے صدام کی پھانسی پر فوری ردعمل کے اظہار سے گریز کیا جاتا تو یہ بھی اس کی دانش مندی ہوتی۔ تاہم اب بھی وقت ہے کہ عالم اسلام کے مشترکہ دشمن کو پہچان لیا جائے۔ ذاتی دشمنی میں اس سے صرف نظر نہ کیا جائے کہ امریکہ اپنے اگلے ہدف ایران کو نشانہ بنا کر اسلام دشمنی پر مبنی اپنے عزائم پورے کرنا چاہتا ہے جبکہ امریکہ اور دیگر اسلام دشمنوں کے ان عزائم کی کوئی حد نظر نہیں آ رہی۔ ہمیں اپنے فروعی اختلافات و تنازعات میں الجھنے کی بجائے' عالم اسلام کے اتحاد اور اس کی بقاء کی فکر کرنی چاہیئے۔ دشمن کی گولی یا گولہ نشانہ بناتے وقت سنی یا شیعہ کو نہیں دیکھتا۔

بشکریہ (ارشاد احمد عارف)



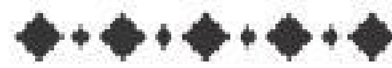
اللہ مسلمانوں کی حفاظت کرے!

امریکہ ایران کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑا ہوا ہے اس کا بس نہیں چل رہا کہ فی الفور ایران کو کچا چبا ڈالے ایک تو پہلے ہی وہ ایران سے جوہری پروگرام کی وجہ سے ناراض تھا دوسرے عراق میں متوقع امریکی فتح کو شکست میں بدلنے میں ایران کا بڑا ہاتھ ہونے کی وجہ سے اب ایران امریکی نشانے پر سب سے اوپر آ گیا ہے۔ ایران کی ہی کوششوں سے عراق میں شیعہ سنی فسادات ابھرے اور بڑھتے چلے جا رہے ہیں۔ جنہیں روکنا امریکی فوجوں کے بس سے باہر ہوتا جا رہا ہے اور اب نوبت یہاں تک پہنچ رہی ہے کہ امریکی حکام عراق میں اپنی شکست کا اعتراف کرنے لگے ہیں۔ عراق پر امریکی قبضے کی ابتداء میں امریکی حکام نے صدر صدام حسین کی مخالفت میں شیعوں کی حوصلہ افزائی کی تاکہ ان کے ساتھ صدام کی طرف سے کی گئی زیادتیوں کا ازالہ ہو سکے۔ اس لئے امریکی سرپرستی میں قائم ہونے والی حکومت میں انہیں فوقیت دی گئی جس کا فائدہ اٹھاتے ہوئے مقتدی الصدر نے ایران اور شام کی مدد سے خود امریکہ کے خلاف کارروائیاں شروع کر دیں اب امریکہ کی پریشانی دیدنی ہے اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا کہ عراق میں کس طرح کنٹرول کرے اگر وہ موجودہ سیٹ اپ کو رہنے دیتا ہے تو عراق' شام' ایران مل کر ایک بڑا شیعہ اتحاد بن کر ایران کے دفاع کو مضبوط پلیٹ فارم مہیا کرنا ہوگا جسے کسی بھی قیمت پر امریکہ پسند نہیں کر سکتا کیونکہ تمام غیر مسلم قوتوں اور خصوصاً امریکہ کی یہ پالیسی ہے کہ مسلمانوں کو آپس میں لڑا کر کمزور سے کمزور کر دو اور ایران پر اپنا قبضہ جمالو جیسا کہ امریکہ نے خود عراق کے صدر صدام حسین کو شہ دے کر ایران پر چڑھائی کرائی تھی پہلی ایران عراق جنگ میں سوویت یونین کے ساتھ ساتھ امریکہ خود عراق کی بھرپور مدد کر رہا تھا تاکہ ایران شہنشاہ ایران کی املاک اور کھربوں ڈالر کا سونا اور سرمائے کی واپسی کا تقاضہ نہ کر سکے اور ایران جنگ میں الجھ کر شہنشاہ ایران کے بعد اپنے زخم بھرنے اور اس جنگ سے ہونیوالے نقصانات کا مداوا کرنے میں لگ گیا اس سارے عرصے میں امریکہ مختلف پہلوؤں سے ایران پر دباؤ ڈالتا رہا جو آج بھی جاری ہے۔ پھر امریکہ ہی نے صدام حسین کو اکسایا اور کویت جو تیل کی دولت سے مالا مال تھا اور امریکہ کے قابو میں نہیں آ رہا تھا وہ اپنی دولت کی فراوانی کے باعث امریکہ کو واجبی سی ہی لفٹ کراتا تھا اور اپنے تیل کے نرخ اپنی مرضی سے چارج کرتا تھا امریکہ نے عراق کے ہاتھوں چڑھائی کرا کے اس کی اینٹ سے اینٹ بجوادی اور پھر کویت کی تعمیر نو کے لئے اپنے خزانوں کے منہ کھول دیئے اس سے امریکہ نے دوہرا فائدہ اٹھایا۔ کویت کی امداد کے نام پر اربوں ڈالر کے قرضے دے کر اپنا دست نگر بنالیا اور اپنی من مانی کے معاہدے کرائے۔ دوسری طرف تعمیر نو کے تمام کام امریکی فرموں کو دلا کر آدھے سے کہیں زیادہ سرمایہ

بھی بچالیا۔امریکہ نے اپنے اسی تیر سے سعودی عرب کی معیشت کو تباہ و برباد کر کے اسے بھی اپنا مقروض بنالیا۔سعودی عرب سے بھی اپنی پسند اور ضرورت کے معاہدے کیئے اور اسے بھی اپنا پابند بنالیا۔اب کویت عراق اور سعودی عرب کے تیل کے دام امریکہ اپنی مرضی سے طے کرنے لگا اور یوں اس نے نا صرف قرضوں پر سود وصول کیا بلکہ تیل کے نرخ کم سے کم ادا کر کے بے پناہ فائدہ حاصل کیا۔امریکہ جو سوویت یونین کی موجودگی میں دوسری بڑی طاقت کے طور پر مانا جاتا تھا جبکہ سوویت یونین نے نا صرف ایٹمی میدان میں بلکہ خلائی میدان میں بھی امریکہ پر سبقت حاصل کر رکھی تھی جو امریکی حکمرانوں کو کسی کانٹے کی مانند کھٹکتی تھی دوسری سب سے اہم بات سوویت یونین میں شامل مسلم ریاستوں کے تیل کی کشش اسے اپنی طرف کھینچ رہی تھی جس کے لیئے اس نے خود پس پردہ رہ کر مسلم قوتوں کا سہارا لے کر افغانستان میں میدان کارزار گرم کرایا۔مسلمانوں نے یہ سوچے سمجھے بغیر کہ اس جنگ کے نتائج کیا ہوں گے امریکہ کی طرف سے ملنے والی امداد اور سرپرستی نے وہ کام کر دکھایا جس کا تصور کرنا بھی امریکیوں کے لیئے محال تھا۔سوویت یونین کے ٹوٹنے سے جہاں وسط ایشیا میں کھلبلی مچی وہیں امریکہ نے جب یہ دیکھا کہ افغانستان پاکستان' ایران' کویت اور مشرق وسطیٰ کی دیگر چھوٹی بڑی ریاستوں عراق سعودی عرب مصر وغیرہ مل کر سوویت یونین سے بھی بڑی مسلمانوں کی ایک قوت وجود میں آسکتی ہے تو اس نے فوراً پینترا بدلا اور افغانستان سے نا صرف اپنا ہاتھ کھینچ لیا بلکہ افغانستان میں قائم ہونے والی طالبان کی حکومت کے درپے ہو گیا اور اس پر ہاتھ ڈالنے کے لیئے جواز کے طور پر خود اپنے شہر نیو یارک میں بلند ترین عمارت کو فضائی حملے کرا کر ختم کیا اور الزام القاعدہ پر لگا کر افغانستان پر ٹوٹ پڑا۔حالانکہ خود ان کے تحقیقاتی اداروں نے یہ رپورٹ دے دی تھی کہ اس میں اسرائیلی ملوث ہیں مسلمان نہیں لیکن امریکہ نے دنیا کو دکھانا تھا کہ مسلمان کتنے سنگ دل اور بے رحم ہیں کہ انہوں نے معصوم امریکی شہریوں کو کس طرح لمحوں میں نیست و نابود کر دیا۔اگر واقعی ایسا کچھ کسی بھی طرح مسلمانوں نے کیا ہی ہوتا تو کیا وہ پورے امریکہ میں صرف ایک ہی شہر کو نشانہ بناتے۔مسلمان ایسے کمزور بھی نہیں کہ وہ امریکہ میں رہ کر امریکہ کو پریشان نہ کر سکتے لیکن چونکہ یہ ساری کاروائی خود امریکہ کی پلان کی ہوئی تھی مسلمانوں کو تو دور دور اس کی ہوا تک نہیں لگی تھی ان پر تو الزام لگا کر افغانستان سے مسلم حکومت ختم کر کے مسلمانوں کو مزید طاقت حاصل کرنے سے روکنا تھا۔کیونکہ امریکہ کو تو یہ خطرہ پیدا ہو گیا تھا کہ کہیں نو آزاد روسی ریاستیں افغانستان اور نو آزاد چیک ریاستوں اور ایران پاکستان اور دیگر ملحقہ مسلم ریاستوں کے ساتھ مل کر کوئی بڑی قوت نہ بن جائیں کیونکہ روس سے آزاد ہونے والی تمام ریاستوں کے پاس پہلے ہی ایٹمی ہتھیاروں کی موجودگی ثابت تھی ادھر پاکستان ایٹمی دھماکہ کر کے اپنی قوت کا اظہار کر چکا ایران اپنے ایٹمی پروگرام کی تیاریوں میں مصروف تھا۔ایسے ہی عراق پر بھی یہ الزام تھا کہ وہ ایٹمی ہتھیار تیار کر رہا ہے۔یہ ایسے خطرات تھے جنہوں نے امریکہ کی راتوں کی نیند حرام کر رکھی تھی اس لیئے اس نے ایک ایک کر کے مسلم ریاستوں پر اپنا قبضہ قائم کرنے کا عمل شروع کر دیا۔ساتھ میں یہ سازش بھی کرتا رہا کہ کہیں مسلمان اسلام کے نام پر ایک نہ ہو جائیں ان کے درمیان باہمی اختلافات کو ہوا دے کر انہیں آپس میں ٹکرانے میں اُلجھا کر ان کو کمزور سے کمزور تر کرنے کی منصوبہ سازی بھی کرتا رہا اب بھی مسلمان جو دنیا بھر میں ڈھائی ارب سے کہیں زیادہ ہیں کو اس طرح منتشر اور کمزور کر رکھا ہے کہ کوئی ایک دوسرے کی کسی مصیبت کی گھڑی میں مدد کو نہ آنے کی کوشش کرتا ہے بس زبانی کلامی ہمدردیوں سے کام نکالنے کی کوشش کرتا ہے اور اگر کہیں امریکی سرزنش ہو گئی تو ہمدردی کی بجائے مخالفت میں بیان دے کر اپنی ذمہ داری پوری کر لیتا ہے۔اب بظاہر تو امریکہ کے

نشانے پر ایران ہے لیکن در حقیقت امریکہ کی سعودی عرب پر رال ٹپک رہی ہے۔ سعودی عرب میں آمدن کے کئی ذرائع ہیں اور مسلمانوں کی یک جہتی کا خطرہ بھی سب سے زیادہ یہیں سے ہے کیونکہ ہر سال حج کے موقع پر جمع ہونے والے مسلمانوں کی تعداد بڑھتی چلی جا رہی ہے جو ایک امام کے حکم پر سر سجدے میں ڈال دیتے ہیں اس کے حکم پر سجدے سے اٹھ جاتے ہیں اور اگر کہیں امام نے کسی وقت انہیں جہاد کا حکم دے دیا تو کیا ہوگا یہ خوف بھی اس کے دامن گیر ہے اور اس کے علاوہ سعودی عرب کی معدنیات تیل، سونا، یورینیم، گرینائیٹ وغیرہ کیونکہ عراق سے جنگ کے وقت امریکہ نے جتنا قرضہ دیا تھا وہ سعودی حکمرانوں نے چند سالوں میں ہی واپس کر دیا جس سے یہ ثابت ہو گیا کہ سعودی آمدن کے ذرائع بے پناہ ہیں اس لئے انہیں قابو کرنا بھی امریکہ کے لئے بہت ضروری ہے۔ اس لئے آج کل امریکہ کی ''نظر عنایت'' سعودی عرب حکمرانوں اور ان کے شہزادوں کے درمیان اختلافات پیدا کرنے پر زیادہ ہے۔ اس طرح امریکہ اپنا عمل دخل سعودی سیاست میں چاہتا ہے۔ دراصل امریکہ اور اس کے تمام حلیف مسلمانوں کے خلاف مشترکہ صلیبی جنگ میں مصروف ہیں اور اپنی تمام تر توانائیوں کے ساتھ امریکہ کے ہم قدم ہیں تاکہ مسلمانوں کی بڑھتی ہوئی قوت کے سامنے بند باندھ سکیں۔ امریکہ اور اس کے حواری مسلمان ممالک میں کئی طرح کی جنگ لڑ رہے ہیں۔ سرد جنگ کے طور پر ضبط تولید کے ذریعے مسلمانوں کی نسل کشی کا حربہ آزما رہے ہیں انہیں زیادہ سے زیادہ مقروض کر کے اپنا غلام بنا رہے ہیں اور جہاں بس نہیں چلتا وہاں حربی جنگ کے ذریعہ اس مسلمان ریاست کا دماغ درست کرنے پہنچ جاتے ہیں۔ مسلمانوں کی قوت سے کلیسا بھی لرزاں ہے۔ مسلمانوں کا خوف انہیں چین سے نہیں بیٹھنے دے رہا۔ انہیں بے چین کئے ہوئے ہے ان کا بس نہیں چل رہا کہ وہ کسی بھی طرح سے مسلمانوں کا نام ونشان صفحۂ ہستی سے مٹا دیں۔ لیکن اللہ کی قدرت اور نظام قدرت کے آگے کس کا زور چلا ہے جو امریکیوں کا صلیبی جنگوں کے ذریعہ چل سکے گا۔ اللہ مسلمانوں کی حفاظت کرنے والا اور انہیں نصرت وفتح دینے والا ہے۔

بشکریہ (عمران احمد قریشی)



امریکی عراق پالیسی میں تبدیلی کے آثار

امریکی کانگریس کی نو منتخب خاتون سپیکر نینسی پلوسی نے صدر بش پر زور دیا ہے کہ عراق پالیسی تبدیل کی جائے۔ کانگریس سے اپنے پہلے خطاب میں انہوں نے کہا امریکی عوام نے 7 نومبر کے انتخابات میں واضح طور پر عراق میں ایک نہ ختم ہونے والی جنگ کو مسترد کر دیا ہے، وہ عراق کے بارے میں ایک نئی حکمت عملی چاہتے ہیں۔ سینیٹ میں اکثریتی جماعت ڈیموکریٹک پارٹی کے لیڈر رہیری ریڈ نے بھی عراق میں جنگ جاری رکھنے کی شدید مخالفت کی ہے۔ دونوں قانون ساز ایوانوں کے سربراہوں نینسی پلوسی اور ہیری ریڈ نے صدر بش کے نام مشترکہ مکتوب میں خبردار کیا ہے کہ عراق میں مزید فوجی دستے بھجوانے سے مزید امریکیوں کی زندگی خطرے میں پڑ جائے گی اور کسی سٹریٹیجک فائدے کے بغیر ہماری فوج نقطہ شکستگی (Breaking Poin) تک پہنچ جائے گی۔ انہوں نے لکھا ہے کہ عراق میں مزید افواج کی تعیناتی کے بجائے آئندہ چار سے چھ ماہ کے دوران وہاں پر موجود امریکی افواج کو دوسرے محاذوں پر منتقل کر دیا جائے، یعنی انہیں لڑائی کے بجائے ٹریننگ لاجسٹک اور انسداد دہشت گردی وغیرہ کے کاموں پر لگا دیا جائے۔

ڈیموکریٹک پارٹی کے دباؤ کا مقابلہ کرنے کے لئے بش مزید 20 ہزار امریکی افواج عراق بھجوانے پر غور کر رہے ہیں تاکہ بغداد میں بدامنی پر قابو پایا جا سکے، لیکن تاحال پالیسی واضح نہیں۔ واشنگٹن پوسٹ کی رپورٹ کے مطابق صدر بش کے چوٹی کے مشیر مزید افواج بھجوانے کے مسئلے پر آپس میں بٹے ہوئے ہیں۔ بعض مشیروں نے اس خدشے کا اظہار کیا ہے کہ نور المالکی کی حکومت عسکری تعاون کی سکت نہیں رکھتی اور وہ ایسی سیاسی اصلاحات نافذ کرنے کے قابل بھی نہیں ہو سکے گی، جن کی مدد سے امریکی افواج عراق سے نکل سکیں۔ اخباری رپورٹ کے مطابق جائنٹ چیف آف سٹاف، چوٹی کے جرنیل اور ایڈمرلز نے بھی اس خدشے کا اظہار کیا ہے کہ عراق میں مزید فوج بھیجنے کے نقصانات ان کے ممکنہ فوائد سے زیادہ ہوں گے۔ امریکی حکمرانوں کو عراق میں اپنی زیرنگرانی قائم شدہ حکومت سے بھی کوئی امید نہیں۔ انہیں خدشہ ہے کہ وہ شیعہ ملیشیا کے خلاف مسلح کارروائی کر سکتی ہے نہ پارلیمنٹ کو معتدل سیاسی مرکز میں تبدیل کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ عراقی فوج کی تشکیل کا معاملہ اس سے بھی بدتر ہے۔ عراقی فوجی دستوں کے سپاہیوں کے غائب ہو جانے کے واقعات میں کوئی کمی نہیں آئی۔ جیسا کہ نشاندہی کی گئی صدر بش کی عراق پالیسی واضح ہو کر سامنے نہیں آئی۔ ایک طرف وہ مزید 20 ہزار افواج عراق بھجوانا چاہتے ہیں، دوسری طرف اہم مناصب پر فائز عہدیداروں کا تبادلہ کیا جا رہا ہے۔ گزشتہ روز انہوں نے نیشنل انٹیلی جنس کے سربراہ جان نیگرو پونٹے کو ان کے عہدہ سے برطرف کر کے انہیں وزیر خارجہ کونڈولیزا رائس کا نائب مقرر کر

دیا ہے۔ عراق میں امریکی سفیر زلمے خلیل زادکی جگہ ریان کروکر کو سفیر مقرر کر دیا گیا ہے۔ امریکی سینٹرل کمانڈ کے سربراہ اور عراق میں امریکی فوج کے کمانڈر جان ابی زید کو بھی ان کے عہدے سے فارغ کر دیا گیا ہے۔

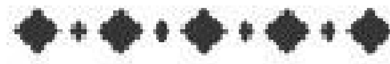
اس منظرنامے سے صاف ظاہر ہے کہ صیاد اپنے ہی پھیلائے ہوئے جال میں پھنس گیا ہے۔ کھلی جارحیت اور 6 لاکھ بے گناہ عراقیوں کے قتل کے باوجود جنگی مقاصد کا حصول تو کجا، راہِ فرار بھی نظر نہیں آرہی۔ عراقی قوم کے دلیرانہ مزاحمت نے ایک بار پھر اس حقیقت کو نمایاں کر دیا ہے کہ نقطۂ کمال تک پہنچی ہوئی جنگی مشینری اور بے مثال وسائل سے بھی جذبۂ آزادی کو کچلا نہیں جاسکتا۔ اگر کوئی قوم آزادی کے لئے موت کو گلے لگانے پر تل جائے تو اسے غلام بنا کر نہیں رکھا جاسکتا۔

عراق پر حملے نے دنیا کی سب سے بڑی جمہوری اور ترقی یافتہ ریاست کی جمہوریت کا پول بھی کھول کر رکھ دیا ہے۔ امریکی حکومت کے فیصلہ ساز مٹھی بھر نوقدامت پرستوں اور تیل کے تاجروں نے جھوٹی انٹیلی جنس رپورٹوں کی بنیاد پر میڈیا کے ذریعے پراپیگنڈے کا جو طوفان اٹھایا، وہ یہ ثابت کرنے کے لئے کافی ہے کہ آزادئ اظہار، معلومات تک عوام کی مکمل رسائی اور ووٹ کی طاقت سے جھوٹ اور پراپیگنڈے کو شکست نہیں دی جاسکتی۔ صدام حکومت پر ایٹمی و کیمیائی ہتھیاروں کی تیاری کا الزام سراسر جھوٹا الزام تھا، لیکن جھوٹ گھڑنے والے میڈیا کے پراپیگنڈے کے سیلاب میں رائے عامہ کو بہا کر لے گئے۔ ایک انتہائی ترقی یافتہ اور باخبر معاشرے نے بہکاوے میں آکر یہ ثابت کر دیا کہ مغربی ممالک کی باشعور رائے عامہ عالمی امن کی ضمانت نہیں بن سکتی۔ یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ عراقیوں کے قتل اور عراق کی تباہی و بربادی سے امریکیوں کا دل نہ پسیجا۔ جب تک امریکیوں کا جانی نقصان تشویشناک حد تک نہ پہنچا، سفاکانہ رویے میں کوئی تبدیلی نہ آئی اور صدر بش کو دوسری بار صدر منتخب کر لیا گیا۔ اس تناظر میں کہا جاسکتا ہے کہ مغربی تہذیب کا روشن خیال سیکولر معاشرہ جارحانہ قوم پرستی سے اوپر نہیں اٹھ سکا۔ اپنے قومی دائرے میں مغرب کی جمہوری اقدار دوسری قوموں سے سلوک میں یکسر غائب ہو جاتی ہیں۔ دو عالمی جنگوں کے المناک تجربے کے باوجود مغربی دنیا کا یہ رویہ اور یہ طرز فکر افسوسناک عالمی صورت حال کی عکاسی کرتا ہے۔ امریکیوں کے طرز عمل کی روشنی میں یہ کہنا مبالغہ آمیز نہ ہوگا کہ امن عالم کو جبر کے نتیجے میں پیدا ہونے والے دہشت گردوں سے نہیں، بڑی قوموں سے خطرہ ہے۔ امریکی کانگریس اور سینیٹ کے سربراہوں نے اپنے صدر کے نام خط میں امریکی سپاہیوں کی ہلاکت کے خدشہ پر سخت تشویش کا اظہار کیا ہے۔ کاش انہوں نے بے گناہ عراقیوں کی خوں ریزی اور ان کے انسانی حقوق کی پامالی کا ذکر بھی کیا ہوتا، لیکن مغرب کا انسان بلند بانگ دعوؤں کے باوجود شاید انسانی معراج کی اس سطح تک نہیں پہنچ سکا۔

امریکی حکمرانوں نے اپنے نفع و نقصان کے بارے میں بھی کسی پختہ شعور کا ثبوت نہیں دیا۔ عراق پر حملے اور قبضے کے لئے اب تک اندازاً 2 ٹریلین ڈالر خرچ کئے جاچکے ہیں۔ حملے سے قبل عراق 42 بلین ڈالر کا مقروض تھا، جس میں سے پیرس کلب نے 30 ارب ڈالر کا قرضہ معاف بھی کر دیا۔ امریکہ نے عراق پر جنگ مسلط کرنے کے لئے جو بھاری رقم خرچ کی، اس کا عشر عشیر خرچ کر کے پسماندہ ممالک سے بھوک کو ختم کیا جاسکتا تھا، لیکن روشن خیال تہذیب کو اس کی توفیق نہ ہوئی۔ امریکہ کو جو جمہوری ممالک کے لئے مرکز ثقل کی حیثیت رکھتا ہے، اپنا داخلی جائزہ لینا چاہیے اور یہ معلوم کرنے کی کوشش کرنی چاہیے کہ کس طرح مٹھی بھر افراد اسے ظالمانہ جارحیت اور بربادی کی راہ پر ڈالنے میں کامیاب ہو گئے۔

امریکی حملے کے نتیجے میں صدام حسین کا قائم کردہ بُرا بھلا نظام بھی انجام کو پہنچا۔اس کے بعد قوم کی شیرازہ بندی کے لئے کوئی متبادل انتظام نہیں کیا جاسکا۔بظاہر حالات نہایت سنگین ہیں اور معلوم ہوتا ہے کہ امریکی افواج کے انخلاء کے بعد ملک خوفناک خانہ جنگی کا شکار ہوجائے گا۔اس افسوس ناک صورت حال سے بچنے کی اصل ذمہ داری اہل عراق اور عراق کے ہمسایہ ممالک پر عائد ہوتی ہے۔عراق کے ہمسایہ ممالک ایران،سعودی عرب اور دوسرے عرب ملکوں کو چاہیے کہ وہ شیعہ اور سنی رہنماؤں کو قریب لانے اور ان کے درمیان مفاہمت و تعاون کے حالات پیدا کرنے کے لئے فعال کردار ادا کریں۔عراق پر امریکی جارحیت نے مشرق وسطیٰ کو جس خوفناک بحران کی طرف دھکیل دیا ہے،اس بارے میں فرانسیسی صدر ژاک شیراک کے الفاظ قابل توجہ ہیں۔انہوں نے سال نو کے خطاب میں کہا عراق پر امریکی حملے نے سارے مشرق وسطیٰ کو عدم استحکام سے دوچار کردیا ہے۔اس کے نتیجے میں ''دہشت گردی'' تیزی سے پھیلنے لگے گی اور اس سے ایک ایسی محاذ آرائی جنم لے گی جس کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔انہوں نے مشورہ دیا ہے کہ علاقائی استحکام کی بحالی کے لئے بین الاقوامی کانفرنس بلائی جائے۔بظاہر یہ مشورہ بہت صائب ہے۔امریکہ اور برطانیہ پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ انہوں نے عراق پر حملے سے جو آگ بھڑکائی ہے،اسے بجھانے کی تدبیر بھی کریں۔

بشکریہ (ذوالقرنین)



رونا تو اب ان کا مقدر ہے

ایک عراقی ماں کو اپنے جواں سال بیٹے کی لاش پر روتے ہوئے دیکھ کر مجھے دنیا بھر کی مائیں یاد آ گئیں، جو ایک ہی طرح کا جذبہ اور ممتا رکھتی ہیں، جو اپنے بیٹوں کو گھروں سے رخصت کرتے وقت ان کی بلائیں لیتی اور دعائیں دیتی ہیں۔ انہی میں یقیناً وہ امریکی مائیں بھی شامل ہیں، جن کے بیٹے اچھے مستقبل کی خواہش لئے فوج میں بھرتی ہوئے تھے اور آج انہیں عراق کے بے آب و گیاہ صحرا میں مقصد سے عاری اور بیکار جنگ میں جھونک دیا گیا ہے۔ خبر ملی ہے کہ امریکہ نے مزید امریکی فوجیوں کو عراق میں بھیج دیا ہے اور میں سوچ رہا ہوں کہ مزید امریکی ماؤں کے کلیجے پر چھری چلا دی گئی ہے۔ مجھے عراقی ماؤں سے بھی ہمدردی ہے اور امریکی ماؤں سے بھی ہے کہ مائیں سب ایک جیسی ہوتی ہیں۔ بش اور ٹونی بلیئر کی مائیں بھی انہی ماؤں جیسی ہوں گی، مگر وہ خود عام بیٹوں جیسے نہیں ہیں۔ اگر وہ بھی وائٹ ہاؤس اور ڈاؤننگ سٹریٹ میں بیٹھنے کی بجائے عراق کے صحراؤں میں جنگجو عراقیوں سے لڑنے کے لئے زبردستی جنگ میں جھونک دیئے جاتے تو انہیں اندازہ ہوتا کہ ان کی ماؤں کے دلوں پر کیا گزر رہی ہے اور اپنی جنونی خواہشات کو پوری کرنے کے لئے وہ جن ماؤں سے ان کے جگر گوشے چھین رہے ہیں، وہ کس طرح زندہ لاشیں بن کر زندگی گزار رہی ہیں۔

ایک خبر کے مطابق صرف دسمبر 2006ء میں ریکارڈ امریکی فوجی عراق میں مارے گئے ہیں۔ ایسے ہی ایک امریکی فوجی کی لاش کو ٹی وی پر دیکھ کر اس کی ماں نے پہچان لیا اور پھر اس کی دہاڑیں آسمان کو ہلانے لگیں۔ تب امریکی میڈیا، پینٹا گون کے تھنک ٹینک، صدر بش اور ان کی جنگی ٹرائیکا کو احساس ہوا کہ عراق کی لڑائی میں صرف عراقی مائیں ہی نہیں، امریکی مائیں بھی روئیں گی۔ عراقی مائیں تو اپنے بیٹوں کو شہادت کا رتبہ پانے اور اسوۂ شبیریؓ پر قربان ہونے کی سعادت حاصل کرنے پر بالآخر صبر شکر کر لیں گی، مگر امریکی ماؤں کو دلاسہ کون دے گا۔ ان کے بیٹے تو ایک ایسی جنگ میں مارے جا رہے ہیں، جس میں امریکہ ایک ظالم اور مجرم کی حیثیت سے شریک ہے۔ عراقیوں کی موت پر دنیا اظہار افسوس کرتی ہے، مگر امریکی اور برطانوی سپاہیوں کے مرنے پر افسوس کی بجائے اسے مکافات عمل سمجھا جاتا ہے۔

امریکی ماؤں کی اس سے بڑھ کر بدقسمتی اور کیا ہو گی کہ انہیں اپنے بیٹوں کی لاشیں تک دیکھنا نصیب نہیں ہوتیں۔ امریکہ کے جنگی منصوبہ ساز تو قوم کا مورال بلند رکھنے کے لئے ان کی ٹی وی پر تصویر تک دکھانا گوارا نہیں کرتے، بھلا ان کی لاشوں کو لواحقین تک کیوں پہنچائیں گے۔ شاید اسی وجہ سے ایسی خبریں بھی آتی ہیں کہ جرمنی اور ترکی کے امریکی اڈوں پر عراق اور افغانستان میں مرنے والے سینکڑوں امریکیوں کی لاشیں موجود ہیں۔

امریکی حکام ان لاشوں کو امریکہ نہیں لے جا رہے، کیونکہ کمزور دل امریکی اس صدمے کو برداشت نہیں کر سکتے عراق اور افغانستان میں امریکی فوجیوں کی لاشیں جس بڑی تعداد میں گر رہی ہیں کہ امریکی حکام امریکہ لانے کی بجائے، صحرا میں دفن کرنے کو ترجیح دیں گے، تاکہ ان کے جنونی ساتھیوں نے جو غیر قانونی جنگ چھیڑ رکھی ہے۔ امریکی قوم اس پر پینٹا گون ٹرائیکا کا گریبان پکڑنے کے لئے سڑکوں پر نہ نکل آئے۔

صدر بش کے حکم سے عراق میں جو خون کی ہولی کھیلی جا رہی ہے، اس میں امریکہ حریت پسندوں پر ایک ایسا بم استعمال کرنے کا ارادہ بھی رکھتا ہے، جسے اس نے بموں کی ماں کا نام دیا ہے۔ جن لوگوں کے دل میں رحم نام کی کوئی چیز نہ ہو، اور جنہیں انسانی جان کی قدر و قیمت سے زیادہ اپنے اقتدار اور ذاتی مفادات کی فکر ہو، وہ رشتوں اور لفظوں کی حرمت کو اسی طرح برباد کیا کرتے ہیں۔ صدر بش یا پینٹا گون والوں کو کیا معلوم کہ کوئی ماں بم نہیں ہوتی، بلکہ ماں تو پھول ہوتی ہے یا شجر سایہ دار بن کر خود دھوپ میں جلتی اور اپنے بچوں کو سایہ فراہم کرتی ہے، جبکہ بم چلانے والے درندے ہوتے ہیں، ان کا ماں جیسے نرم و لطیف رشتے سے کیا تعلق؟ عراقی شہریوں پر اندھا دھند میزائل برسانے اور بم گرانے کا حکم دینے والے ماؤں کی کوکھ اجاڑ رہے ہیں اور سنگدل نے ان کی آنکھوں پر ایک ایسی عینک چڑھا دی ہے، جس نے انہیں اس کے سوا اور کچھ دیکھنے کے قابل ہی نہیں چھوڑا کہ وہ نہتے عراقیوں کی شہروں میں گرتی لاشیں دیکھ کر یہ حساب کرتے رہیں کہ ان کے کتنے ہزار فوجیوں اور بموں نے کتنے ہزار عراقیوں کو نشانہ بنایا ہے اور پھر شاید یہ سوچ کر اپنے ضمیر کو تھپکیاں بھی دیتے ہوں کہ جنگ میں سب کچھ جائز ہوتا اور شہروں پر بم تو گرانے ہی پڑتے ہیں۔

ماں کو بموں اور میزائلوں سے تشبیہ دینے والے بش اور ٹونی بلیئر آج پریشان ہیں کہ عراقی عوام صدام کی پھانسی پر سراپا احتجاج کیوں ہیں۔ ان کی ساری امیدوں اور آرزوؤں پر عراق کے عوام نے صدام کی حمایت میں اتحادی فوجوں کے سامنے سینہ سپر ہو کر پانی پھیر دیا ہے۔ اس غیر متوقع صورت حال نے انہیں جنگی حکمت عملی تبدیل کرنے پر مجبور کر دیا اور مزید فوج بھیجنے کی ضرورت بھی پیش آ گئی ہے۔ بش اور بلیئر بھول گئے تھے کہ ایک ماں تو وہ ہے، جو اپنے پیٹ سے جنم دیتی ہے اور ایک ماں اسے کہتے ہیں، جو انسان کو پہچان عطا کرتی ہے۔ یہ ماں مادر وطن کہلاتی ہے۔ اسے دھرتی ماں کہا جاتا ہے۔ عراق کے عوام اپنی اسی ماں کی حفاظت کر رہے ہیں۔ مادر وطن کے دفاع نے انہیں تمام تر اختلافات بھلا کر متحد و یکجا کر دیا ہے۔ نہ کوئی شیعہ رہا ہے، نہ سنی، کوئی اپوزیشن کا حامی ہے اور نہ کوئی حکومتی کارندہ، سب عراقی ہیں، جن پر جارحیت مسلط کر دی گئی ہے اور ایک اژدہا ان کی سرزمین وطن کو نگلنا چاہتا ہے۔ مگر عراقی عوام اپنے عزم و حوصلے، اتحاد اتفاق اور جرات مندی و بہادری سے اس کے گلے میں پھانس بن کر اٹک گئے ہیں۔

عراقی مائیں اپنے بیٹوں کی شہادت پر غمزدہ ضرور ہیں، مگر وہ انہیں روکیں گی نہیں، کیونکہ وہ جانتی ہیں کہ جن بیٹوں نے ان کو کوکھ سے جنم لیا ہے، انہیں مادر وطن کی عزت و ناموس کے لئے کٹ مرنے کا جذبہ بھی انہیں کے دودھ نے بخشا ہے۔ وہ یہ بھی جانتی ہیں کہ ان کے بیٹے کربلا کے وارث ہیں اور ان کے لہو میں یزیدیت کے خلاف ڈٹ جانے کا جذبہ 14 صدیوں سے مسلسل دوڑ رہا ہے، عراقی ماؤں کے پاس تو قافلہ حسینیؑ کی ان ماؤں، بہنوں اور بیبیوں کی وراثت موجود ہے، جنہوں نے جلے ہوئے خیموں اور نیزوں پر چڑھی ہوئی اپنے پیاروں کی لاشوں میں گھرے ہونے کے باوجود حوصلہ نہیں ہارا تھا۔ عراقی ماؤں کے لئے تو منظر تھوڑا سا ہی بدلا ہے۔ جلے ہوئے خیموں کی جگہ جلی ہوئی عمارتوں نے لے لی ہے، نیزوں پر

چڑھی لاشوں کی بجائے انہیں بارود میں جھلسی ہوئی لاشیں دیکھنے کو مل رہی ہیں۔ انہیں پھر ایک کربلا کا سامنا ہے، مگر یہ کربلا ان کے لئے نئی نہیں۔

مگر امریکی ماؤں کے پاس تو کچھ بھی نہیں۔ ان کے بیٹے تو ایک ایسی جنگ میں شریک ہیں، جسے دنیا قزاقی کہہ رہی ہے۔ وہ اپنے وطن کی حفاظت کے لئے جانیں نہیں گنوا رہے، بلکہ انہیں بش اینڈ کمپنی نے تیل کی دولت کے لئے جنگ میں جھونک دیا ہے۔ ظالم کے خلاف لڑتے ہوئے مرنا عظمت ہے اور ظالم کی فوج میں شامل ہو کر جان گنوانا ذلت۔ امریکی ماؤں کے بیٹے اسی راستے کے مسافر ہیں۔ وہ عراق کے صحرا میں مر رہے ہیں تو مائیں ان کی لاشوں پر بین تک نہیں کر سکتیں۔ واشنگٹن، نیویارک یا شکاگو میں صلیب گاڑ کر ان کی قبر تک نہیں بنا سکتیں، پھر ان کے پاس کربلا جیسا کوئی روحانی ورثہ بھی نہیں اس بے چارگی میں دھاڑیں مار مار کر نہ روئیں تو کیا کریں۔ رونا تو اب ان کا مقدر بن چکا ہے۔

بشکریہ (نسیم شاہد)

صدام حسین کے بغیر عراق ---کیسا ہوگا؟

صدام حسین اب اس دنیا میں نہیں رہے ۔30 دسمبر 2006ء کو انہیں پھانسی دیدی گئی، عراق کی تاریخی سرزمین کا ایک اہم عہد تمام ہوا اور اپنے پیچھے کتنی ہی سبق آموز اور عبرت آمیز داستانیں، کچھ گفتنی اور کچھ ناگفتنی چھوڑ گیا۔ صدام حسین کی زندگی انسانی عروج وزوال کی ایک ایسی کہانی ہے کہ جس میں دنیوی زندگی کا ہر رنگ جھلکتا ہے۔ اس میں عروج ہے تو ایسا کہ اس کی نظیر ڈھونڈنا مشکل ہے اور پھر زوال دکھائی دیتا ہے تو وہ بھی ایسا کہ ایسی کوئی دوسری مثال پانا دشوار ہے۔ صدام حسین کے لئے بے دھڑک یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ انہیں محبت بھی بہت ملی اور انہوں نے نفرت بھی خوب سمیٹی۔ صدام ان لوگوں میں سے تھے، جن سے آپ محبت کرتے ہیں یا پھر نفرت.......... لیکن انہیں نظرانداز نہیں کرسکتے۔ یہ لوگ اپنا وجود خود منواتے ہیں ایسے لوگ دنیا بھر میں پائے جاتے ہیں جو صدام حسین سے بہت زیادہ محبت کرتے ہیں یا پھر انتہائی نفرت.......... یہاں تک کہ ان کی موت پر جہاں کچھ لوگوں نے شادیانے بجائے تو وہاں ان کے لئے آنسو بہانے والوں کی بھی کوئی کمی نہ تھی۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ صدام حسین بہت ظالم وجابر قسم کے حکمران تھے اور ظلم وستم کا کوئی حربہ ایسا نہ تھا، جسے انہوں نے اپنے اقتدار کو قائم ودائم رکھنے کے لئے اپنے مخالفین پر نہ آزمایا ہو۔ اگر یہ سچ ہے اور گمان غالب یہی ہے کہ یہ سچ ہے تو پھر حیرت اس بات پر ہوتی ہے کہ ایسے ظالم انسان کے لئے بھی آنسو بہانے والے لوگ اس آسمان کے نیچے موجود ہیں......!

کچھ سیانے کہتے ہیں کہ لوگوں نے اصل میں صدام حسین کے لئے آنسو نہیں بہائے بلکہ یہ اشک ان طاقتوں کی مذمت میں بہائے گئے، جنہوں نے ایک غلط شخص کو ہٹانے کے لئے اس سے بھی زیادہ غلط طریقہ کار اختیار کیا اور ظلم وستم کے معاملے میں اسے بھی پیچھے چھوڑ دیا، شاید یہ بات کچھ ایسی غلط بھی نہیں ہے کیونکہ صدام حسین دنیا بھر میں امریکا کی من مانی پالیسیوں اور سامراجی ہتھکنڈوں کے خلاف مزاحمت کی علامت بن گئے تھے۔ ان کی جھولی میں کچھ دوسرے مثبت کام ہوں یا نہ ہوں...... کچھ لوگوں کے پاس صدام حسین سے محبت کرنے کے لئے یہی بہانہ کافی تھا کہ وہ امریکا سے نفرت کرتا تھا اور اس کے خلاف میدان عمل میں آنکلا تھا۔ فیڈرل کاسترو سے لے کر ہیوگوشاویز تک اور محمود احمد نژاد سے لے کر اسامہ بن لادن تک ......سبھی سامراجی طاقتوں کے خلاف مزاحمت کی علامت ہیں، یہ الگ بات کہ ان سب نے مزاحمت کے لئے مختلف پالیسیاں اپنائی ہیں اور ہر ایک کی مزاحمت کا انداز جداگانہ ہے لیکن سامراج کی مخالفت قدر مشترکہ ہے۔ صدام حسین بھی اسی زنجیر کی ایک کڑی تھے۔

""امریکا بہادر"" نے عراق کے معزول صدر کو تختہ دار پر لٹکا کر گویا اپنے تمام مخالفین کو یہ پیغام دیا ہے کہ وہ اس کی من مانیوں کی مخالفت سے باز آجائیں یا پھر صدام حسین کے جیسے انجام کے لئے تیار رہیں لیکن اصل سوال تو یہ ہے کہ کیا یہ کوئی برا انجام تھا......؟ اس بارے میں بہت سی متضاد آراء ہوسکتی ہیں اور تمام لوگوں کا کسی ایک نکتے پر اتفاق کرنا ضروری بھی نہیں...... لیکن جو چیز ساری دنیا نے ٹی وی اسکرین پر دیکھی، اسے جھٹلانا بھی ممکن نہیں۔ دنیا نے یہ عجیب وغریب منظر دیکھا کہ جس شخص کو پھانسی دی جارہی ہے، اس نے تو چہرے پر نقاب چڑھانے سے انکار کردیا لیکن

انصاف کے جو علمبردار اسے تختہ دار تک لے کر آئے اور پھانسی کا پھندا اس کے گلے میں ڈالنے آئے، وہ اتنے خوفزدہ تھے کہ انہوں نے خود اپنے چہرے نقاب سے چھپائے ہوئے تھے۔ شاید وہ نہیں چاہتے تھے کہ انہیں شناخت کیا جائے اور تاریخ انہیں منفی انداز میں یاد رکھے۔ دنیا نے یہ بھی دیکھا کہ تختہ دار پر بھی صدام حسین کے چہرے پر سنجیدگی تو موجود تھی لیکن اس کے ساتھ ساتھ ایک وقار اور اعتماد بھی موجود تھا۔ صدام حسین نے ثابت کیا کہ وہ ایک سچا سپاہی تھا، جو جان لے سکتا ہے تو جان دے بھی سکتا ہے۔ صدام حسین نے سزائے موت پانے کے بعد رحم کی درخواست نہیں کی ......شاید ان کی خودداری اور انا آڑے آئی ہو یا پھر انہیں یقین ہو کہ جن طاقتوں نے انہیں کال کوٹھڑی تک پہنچایا ہے، وہ انہیں ہر حالت میں تختہ دار تک پہنچا کر ہی دم لیں گی۔ بہر حال وجہ کچھ بھی ہو، صدام حسین نے رحم کی اپیل نہیں کی۔

صدام حسین تقریباً ربع صدی تک عراق کے مطلق العنان حکمراں رہے۔ جس طرح ہر سکے کے دو رخ ہوتے ہیں، اسی طرح ہر چیز کے مثبت اور منفی پہلو ہو سکتے ہیں۔ مطلق العنان کے جہاں بہت سے نقصانات ہوتے ہیں، وہاں کچھ فائدے بھی ہوا کرتے ہیں۔ سب سے بڑھ کر تو یہ کہ ملک میں "ایڈ ہاک ازم" نہیں ہوتا، نہ ہی ایسا ہوتا ہے کہ آنے والی ہر حکومت سابقہ حکومت کی اچھی پالیسیوں کو بھی حرف غلط کی طرح مٹانے کی کوشش کرے اور یوں بار بار راستہ بدلنے کی وجہ سے قومی ترقی کی گاڑی پٹڑی سے ہی اتر جائے۔ بہر حال صدام حسین نے جہاں سیاسی حریفوں کا ناطقہ بند کئے رکھا، وہاں عراق کی اقتصادی ترقی کے لئے بہت سے گرانقدر کام بھی کئے۔ انہوں نے عراق کو مشرق وسطیٰ کی برتر علاقائی طاقت بنانے اور مصر کی جگہ اپنے ملک کو عرب دنیا کا لیڈر بنانے کی بھرپور کوشش کی۔ انہوں نے تمام تر بغاوتوں اور مخالفتوں کے باوجود عراق کی یکجہتی کو قائم رکھا اور بعض عالمی طاقتوں کی یہ خواہش پوری نہ ہونے دی کہ اس ملک کے ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ آج بھی عراق میں جہاں صدام حسین کو برا بھلا کہنے والوں کی کوئی کمی نہیں، وہاں انہیں اپنا ہیرو سمجھنے والے بھی موجود ہیں۔

دنیا عراق کو صدام حسین کی قیادت میں دیکھنے کی عادی ہو چکی تھی۔ صدام نے 24 سال تک بلاشرکت غیرے عراق پر حکومت کی۔ بہت سے لوگوں نے تو یہ سمجھا کہ شاید عراق اور صدام حسین لازم و ملزوم ہیں لیکن وقت کی کسوٹی نے اسے غلط ثابت کر دیا۔ پہلے جب صدام حسین برسر اقتدار نہیں آئے تھے، تب بھی عراق موجود تھا اور ربع صدی کی حکمرانی کے بعد آج جب وہ نہیں رہے، تب بھی عراق موجود ہے۔ انسان آتے جاتے رہیں گے اور دنیا قیامت تک یونہی چلتی رہے گی، سوال تو یہ ہے کہ اب صدام حسین کے اس دنیا سے رخصت ہو جانے کے بعد عراق کے حالات کیا رُخ اختیار کریں گے، ان میں بہتری آنے کی کوئی امید ہے یا پھر صورت حال مزید خراب ہو جائے گی۔ اگر دیکھا جائے تو آج عراق میں جو حالات ہیں، شاید اتنی بری صورت حال تو صدام حسین کے دور حکومت میں بھی نہ تھی۔ اس بات کا اعتراف تو صدام حسین کے مخالفین بھی کرتے ہیں کہ اتحادی افواج کے قبضے کے بعد عراق میں صورت حال صدام دور سے بھی بدتر ہو گئی ہے۔ کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ اگر سابقہ دور میں صدام حسین اپنے مخالفین پر ظلم و ستم کرتے تھے تو اتحادی افواج یہی کام زیادہ شدت کے ساتھ کر رہی ہیں۔ اقوام متحدہ کے سبکدوش ہونے والے سیکرٹری جنرل کوفی عنان نے بھی "بعد از خرابی بسیار" بالآخر یہ بات تسلیم کر لی تھی کہ اتحادی افواج کی مداخلت کے بعد عراق میں صورت حال صدام دور سے زیادہ خراب ہو گئی۔ اپنے عہدے سے سبکدوشی سے قبل دیئے گئے ایک انٹرویو میں کوفی عنان نے کہا کہ آج عراقی باشندوں کو صدام حسین کے دور سے کہیں زیادہ خراب

حالات کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ انہوں نے اس بات پر بھی افسوس کا اظہار کیا کہ وہ عراق کو جنگ اور پھر خانہ جنگی سے نہ بچا سکے۔ کوفی عنان نے یہ بھی تسلیم کیا کہ 2003ء میں عراق پر امریکی حملے کو نہ روک پانا، ان کی بہت بڑی ناکامی تھی۔ ان خیالات کو اعتراف حقیقت ہی قرار دیا جائے گا لیکن نجانے کیوں بڑے بڑے مناصب پر فائز لوگوں میں حقائق کا اعتراف کرنے کی جرأت اسی وقت پیدا ہوتی ہے، جب وہ اپنے عہدے سے فارغ ہونے والے ہوتے ہیں اور ان کے دوبارہ اس عہدے پر منتخب ہونے کا کوئی امکان باقی نہیں رہتا۔

اس وقت عراق کے محب وطن حلقوں اور ہمسایہ ممالک کو سب سے بڑی فکر یہ دامن گیر ہے کہ صدام حسین کے بعد عراق اپنی قومی وحدت، سا یت اور یکجہتی برقرار رکھ پائے گا یا نہیں۔ عراق وسیع رقبے کا حامل ہے، جہاں تیل اور دیگر قیمتی معدنیات کے وسیع ذخائر موجود ہیں۔ یہ ملک جتنا قدرتی وسائل سے مالا مال ہے، اسی قدر متنوع یہاں کی تہذیب وتمدن بھی ہے، عراق میں مختلف نسلوں کے لوگ بستے ہیں، کئی زبانیں بولی جاتی ہیں اور مذہبی حوالے سے بھی بڑی رنگا رنگی پائی جاتی ہے، ایسے ملک کو، جہاں بھانت بھانت کی بولی بولنے والے موجود ہوں، متحد اور یکجا رکھنا بڑے دل گردے کا کام ہے، یہ کام صدام حسین نے ربع صدی تک بخوبی انجام دیا لیکن ان کے بعد عراق یکجہتی کے بجائے افتراق وانتشار کی جانب بڑھتا ہوا دکھائی دے رہا ہے۔

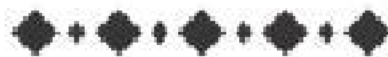
شروع سے ہی سامراجی طاقتوں کا یہ طریقہ کار رہا ہے کہ وہ خود تو متحد رہ کر اپنی طاقت میں مقدور بھر اضافہ کرنے کی کوششیں کرتی ہیں لیکن دوسری قوموں کو آپس میں لڑا کر اور انہیں تقسیم در تقسیم کے ذریعے کمزور کرنے کی خواہاں رہتی ہیں تاکہ پھر ان کی کمزوری کا فائدہ اٹھا کر اپنا محکوم بنا لیں اور ہر طرح ان کا استحصال کریں۔ ماضی کی سامراجی طاقتوں کی طرح امریکا کی بھی یہی پالیسی رہی ہے۔ دیگر مثالوں کو تو چھوڑیئے، خود عراق میں امریکا نے صدام حسین کے حامی عناصر کو کمزور کرنے کے لئے یہ حکمت عملی اپنائی ہے کہ اس ملک کے شمالی حصوں میں کرد باغیوں کی حمایت کی جائے جو کہ عرصہ دراز سے آزادی کے حصول کے لئے مسلح جدوجہد کرتے آرہے ہیں جبکہ عراق کے جنوبی حصوں میں، جو کہ ایران سے قریب ہیں، شیعہ آبادی کو صدام کے حامیوں سے لڑوا دیا جائے۔ یہ خیال کیا جاتا ہے کہ عراق میں صدام حسین کے حامیوں میں اکثریت سنی مسلمانوں کی ہے جبکہ شیعہ آبادی میں ان کی مخالفت پائی جاتی تھی۔ اس کا فائدہ اٹھانے کے لئے امریکا ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت عراق میں سنی......شیعہ اختلافات کو نہ صرف ہوا دے رہا ہے بلکہ کردوں اور شیعہ مسلمانوں کو سنی آبادی کے مقابلے میں کھڑا کر کے عراق کی مستقل طور پر نسلی اور مذہبی بنیادوں پر تقسیم کی راہ ہموار کرنے کی کوشش کر رہا ہے، حالانکہ سبھی جانتے ہیں کہ اسے نہ تو کردوں سے کوئی دلچسپی ہے اور نہ ہی سنی یا شیعہ مسلمانوں سے......امریکا کی تمام تر دلچسپی تو صرف اور صرف اپنے مفادات سے ہے۔ حد تو یہ ہے کہ صدام حسین کی پھانسی کو بھی عراق میں شیعہ......سنی اختلافات کو ہوا دینے کے لئے استعمال کیا گیا اور اس موقع پر بھی ایسے حالات پیدا کئے گئے جن کے نتیجے میں عراقیوں میں باہمی منافرت میں اضافہ ہو......کیونکہ عراقی عوام جس قدر باہمی اختلافات میں الجھیں گے، اسی قدر وہ کمزور ہوں گے۔ بہت سے تجزیہ نگار اس رائے سے اتفاق کرتے ہیں کہ امریکا عراق اور کچھ دیگر ملکوں کو تقسیم کر کے انہیں اپنا حاشیہ بردار بنانا چاہتا ہے۔

جہاں تک صدام حسین کی سزائے موت کا تعلق ہے تو امریکی سرپرستی میں ان کے خلاف ہونے والی عدالتی کارروائی سیاسی مصلحتوں میں لپٹی

ہوئی تھی اوراسی وجہ سے عالمی برادری کی نظروں میں مشکوک ٹھہری۔ سامراجی طاقتوں کی ہمیشہ یہی کوشش ہوتی ہے کہ وہ ایسا ہر کام، جس کے نتائج و عواقب خطرناک ثابت ہوسکتے ہوں، خود کرنے کے بجائے اپنے ہرکاروں سے کرائیں تاکہ کبھی تاریخ انصاف کرنے پر تل جائے تو الزام صرف انہی کے سر نہ آئے بلکہ ان کے گماشتے بھی اس میں حصہ دار ٹھہریں۔ بدقسمتی سے ہر مسلم ملک میں سامراجی طاقتوں کو اپنے لئے مقامی آلہ کار بکثرت مل جاتے ہیں۔ اسی فارمولے پر عمل کرتے ہوئے صدام حسین کو امریکی فوجیوں نے عراقی انتظامیہ (جسے بہت سے لوگ کٹھ پتلی حکومت قرار دیتے ہیں) کے حوالے کردیا تاکہ امریکی آشیرباد کے ساتھ عراقی عدالت میں ان پر مقدمہ چلایا جائے۔ صدام حسین کے خلاف پانچ ہزار کردوں کے قتل عام اور دجیل میں 140 سے زائد شیعہ مسلمانوں کی ہلاکت کے مقدمات بنائے گئے۔ دجیل کے مقدمے میں استغاثہ کا موقف تھا کہ 1982ء میں دریائے دجلہ کے کنارے آباد شہر دجیل میں صدام حسین پر قاتلانہ حملے کی ناکام کوشش کے بعد ان کے حکم پر وہاں 148 شیعہ مسلمانوں کو ہلاک کیا گیا، بالآخر اسی مقدمے میں صدام حسین کو سزائے موت سنائی گئی۔ اس مقدمے کا فیصلہ اگرچہ عراقی جج نے سنایا لیکن بیشتر لوگوں کو یقین ہے کہ یہ فیصلہ امریکی سیاہی سے لکھا گیا تھا۔ مقدمے کی سماعت کے دوران کئی بار صدام حسین اور ان کے ساتھی ملزمان نے عدالتی کارروائی کا بائیکاٹ کیا، بھوک ہڑتال کی اور احتجاج کے دوسرے طریقے بھی اختیار کیے، ان کا کہنا تھا کہ اس مقدمے کی سماعت منصفانہ طور پر نہیں کی جارہی ہے۔ صدام حسین اور دیگر ملزمان کی کئی بار جج سے بھی تکرار ہوئی، امریکا کے سابق اٹارنی جنرل رمزے کلارک اور دیگر وکلائے صفائی نے بھی عدالتی کارروائی کے شفاف ہونے کے حوالے سے شکوک وشبہات کا اظہار کیا۔ عدالت کے جج رؤف عبدالرحمان نے صدام حسین سمیت تین ملزمان کو سزائے موت اور چار کو سزائے قید سنائی جبکہ ایک ملزم کو عدم ثبوت کی بنا پر رہا کرنے کا حکم دیا۔ صدام حسین نے عدالت سے یہ استدعا کی تھی کہ چونکہ وہ ایک سپاہی ہیں، اس لئے اگر انہیں سزائے موت دی جائے تو پھانسی کے بجائے فائرنگ اسکواڈ کا طریقہ اپنایا جائے لیکن ان کی اس خواہش کا بھی احترام نہیں کیا گیا۔ انسانی حقوق کے بین الاقوامی اداروں نے صدام حسین کے خلاف عدالتی کارروائی کو مشکوک قرار دیتے ہوئے کہا کہ اسکا مقصد ہر قیمت پر جرم ثابت کرنا معلوم ہوتا تھا۔ عدالتی ٹربیونل کی قانونی حیثیت کے بارے میں بھی سوالات اٹھائے گئے جبکہ مقدمے کی سماعت کے دوران تین وکلاء کے قتل اور جیل مقدمے کے اصل جج کو تبدیل کیے جانے سے بھی شکوک وشبہات کو تقویت ملی۔ بہرحال یہ فیصلہ "طاقت کی عدالت" کی جانب سے صادر کیا گیا، جس کے انصاف کے اپنے الگ ہی معیارات ہوتے ہیں۔ صدام حسین کو پھانسی دیئے جانے پر بہترین تبصرہ انٹرنیٹ پر رائے عامہ کے ایک جائزے میں سامنے آیا۔ ایک شخص نے اس سوال کے جواب میں کہ "کیا صدام حسین پھانسی کے مستحق تھے؟" اپنی رائے کا اظہار یوں کیا "صدام حسین پھانسی کے حقدار ہوں یا نہ ہوں، انہیں تختہ دار تک پہنچانے والے اس کا استحقاق ہرگز نہیں رکھتے تھے۔"

بشکریہ

عارف عزیز پنہور



نئی امریکی کہانی

کیا وزیر اعظم نوری المالکی واقعی اتنے طاقتور اور اتنے منہ زور ہو گئے ہیں کہ امریکیوں کی مخالفت کے باوجود صدام حسین کو عیدالاضحٰی کی صبح حوالہ دار کر دیں؟...... یا امریکیوں نے دنیا کو اتنا بے وقوف سمجھ لیا ہے کہ وہ اس سلسلے میں کئی روز بعد تخلیق کردہ ان کی کہانی پر یقین کر لے گی؟

عیدالاضحٰی کی صبح صدام حسین کو پھانسی اور اس کے لئے اسے ان مخالفین کے سپرد کر دینا جو اس وقت بھی اپنی نفرت اور جذبۂ انتقام کو نہ چھپا سکے، جب صدام اور تختہ دار کے درمیان چند قدم کا فاصلہ رہ گیا تھا۔ یہ ایک ایسی کارروائی تھی، جس پر وہ لوگ بھی اظہار ناپسندیدگی کئے بغیر نہ رہ سکے جو عراق کے سابق آمر سے کوئی ہمدردی نہیں رکھتے تھے۔

پھانسی کے اس عمل کی فلم بنانے اور سرکاری ٹی وی سے اسے بلا تاخیر نشر کرنے کا فیصلہ شاید اس "خوش فہمی" پر مبنی تھا کہ تقریباً 3 دہائیوں تک عراق پر اپنی مکمل آہنی گرفت کے ساتھ مسلط رہنے والا بے رحم شخص موت کو سامنے پا کر ٹوٹ پھوٹ جائے گا، تختہ دار کی طرف کانپتے ہونٹوں، اشک بار آنکھوں اور لغزیدہ قدموں کا سفر اس کی بزدلی، کم ہمتی اور اعصاب باختگی کا مظہر ہوگا، تب یہ کسی کا ہیرو نہیں رہے گا اور تاریخ میں اس کا ذکر ایک ایسے شخص کے طور پر ہوگا جس نے اپنے دور اقتدار میں ہر طرح کا ظلم اور جبر روا رکھا اور موت کو سامنے پا کر تھر تھر کانپنے لگا...... لیکن صدام حسین نے اپنے دشمنوں کی یہ خواہش بھی پوری نہ ہونے دی۔ بے بسی اور بے کسی کے آخری لمحات بھی اس نے جس حوصلے کے ساتھ بسر کئے، وہ اس کے مخالفین کو بھی ششدر کر دینے والے تھے۔ یوں اس کے دشمنوں نے اسے ایسا ہیرو بنا دیا جو شاید اس کا "پبلسٹی اینڈ پبلک ریلیشن ڈیپارٹمنٹ" کروڑوں ڈالر خرچ کر کے بھی نہ بنا سکتا...... اور اب امریکی دنیا کو ایک اور کہانی سنا رہے ہیں۔ یہ کہانی نیویارک ٹائمز کے لئے امریکی ٹاسک فورس 134 کے طویل ای میل پر مبنی ہے۔ تمام اہم عراقی گرفتار شدگان اس ٹاسک فورس کے تحویل میں ہیں۔ (صدام حسین بھی اسی کی تحویل میں تھا)

30 دسمبر کی صبح 3 بجکر 55 منٹ پر امریکی سپاہیوں نے صدام حسین کو بغداد ایئرپورٹ کے قریب "کیمپ کراپر" میں اس کے سیل میں

جگایا اور اسے بغداد روانگی کے لئے تیار ہونے کو کہا۔ گزشتہ 14 ماہ میں، امریکیوں کے زیر تحویل عدالتی کارروائی کا سامنا کرتے ہوئے وہ متعدد بار اس عمل سے گزرا تھا۔ اسے عدالت میں پیش کرنے کے لئے تقریباً اسی وقت جگایا جاتا اور ہیلی کاپٹر کے ذریعے منہ اندھیرے عدالت میں پہنچادیا جاتا۔ کیمپ کراپر کے اس سیل میں آخری رات جب روشنیاں مدھم ہوئی تو شاید اسے یہ خیال ہو کہ ابھی اس کی زندگی کے کچھ دن باقی ہیں۔

صدام حسین نے صحرا کی کاٹ کھانے والی سردی میں باہر جانے کے لئے تیاری کی، تب اسے بتایا گیا کہ اسے عراقیوں کی تحویل میں دینے کے لئے لے جایا جارہا ہے۔ اب اسے یقین ہو گیا تھا کہ اس کی زندگی کے آخری لمحات زیادہ دور نہیں۔

یہاں سے روانہ ہوتے ہوئے اس نے گارڈ کا اور اس طبی عملے کا شکریہ ادا کیا جس نے اسے وقتاً فوقتاً طبی سہولتیں فراہم کی تھیں۔ پھر اسے بلیک ہاک ہیلی کاپٹر کی طرف لے جایا گیا جو اسے شمالی بغداد میں ''استخبارات'' (صدام دور کی انٹیلی جنس) کی جیل میں پہنچانے کے لئے تیار کھڑا تھا۔ یہ صرف 10 منٹ کی پرواز تھی۔ اس مختصر وقفے میں صدام زیادہ سنجیدہ تھا۔ ہیلی کاپٹر نے 5 بجکر 5 منٹ پر ٹیک آف کیا، اب اس کی زندگی کے 65 منٹ باقی تھے۔ امریکہ سے آمدہ اس نئی کہانی کے مطابق، اس وقت بھی امریکیوں اور عراقیوں کے درمیان (اور خود امریکیوں میں بھی) اس پر بحث ہو رہی تھی کہ کیا عیدالاضحیٰ کے اس مقدس اور حساس موقع پر پھانسی کی سزا پر عملدرآمد ضروری ہے؟

یہاں اس کہانی میں ایک دلچسپ نکتہ بھی بیان کیا گیا ہے۔ بغداد میں اس روز طلوع آفتاب کا وقت 7 بجکر 6 منٹ تھا اور عراقی حکام نے امریکیوں سے وعدہ کیا تھا کہ پھانسی کا یہ عمل طلوع آفتاب سے پہلے مکمل کرلیا جائے گا (یوں عیدالاضحیٰ کا تقدس پامال نہیں ہوگا؟)...... اس تازہ امریکی سٹوری کے مطابق، صدام کی پھانسی سے 6 گھنٹے پہلے تک امریکی کمانڈر اور سفارت کار اسے رکوانے کے لئے کوشاں رہے...... تب عراق میں امریکی سفیر زلمے خلیل زاد اور یہاں امریکی فوج کا سب سے بڑا کمانڈر، جنرل جارج ڈبلیو کیسی جونیئر تعطیلات پر (امریکہ میں) تھے۔ ایسے میں وزیراعظم نوری المالکی عراق میں امریکی کمانڈرروں اور سفارت کاروں سے مطالبہ کرنے لگے کہ صدام حسین کو عراقی حکومت کی تحویل میں دیا جائے۔ المالکی نے جمعرات کو اور پھر جمعہ کو بھی یہ اصرار جاری رکھا۔ اس پر خود امریکیوں میں بھی اتفاق رائے نہیں تھا۔ رات ساڑھے دس بجے زلمے خلیل زاد کا نوری المالکی سے فون پر آخری بار رابطہ ہوا اور وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ عراقی قیادت پھانسی میں تاخیر پر آمادہ نہیں۔ انہوں نے واشنگٹن کو بھی اس سے آگاہ کردیا لیکن امریکی فوج کو اس سے اتفاق نہیں تھا۔

صدام حسین کو جس طرح عراقی حکومت کے سپرد کیا جارہا تھا، امریکی کمانڈر اس پر پریشان تھے۔ اس کے خیال میں یہ سب کچھ انصاف کے تقاضوں کی بجائے جذبۂ انتقام کی تسکین کے لئے تھا۔ بعض امریکی افسروں کے خیال میں جمعہ کی نصف شب، نوری المالکی اور سخت گیر شیعہ عناصر کی ضد کے سامنے امریکی مفادات نظرانداز کردیئے گئے۔ ذرائع کے مطابق، گرین زون میں واقع المالکی کے ہیڈکوارٹرز میں (جسے یہاں کے حکام ''وائٹ ہاؤس'' بھی کہتے ہیں) خوشیوں بھرے خصوصی ڈنر کا آغاز جمعہ کی رات ہوگیا تھا، جبکہ امریکیوں نے صدام کو سپرد نہ کرنے کی دھمکی ابھی واپس نہیں لی تھی۔ 26 دسمبر کو جب اپیل بنچ نے سزائے موت کا فیصلہ برقرار رکھا تھا، بی بی سی سے انٹرویو میں مالکی نے اس توقع کا اظہار کیا تھا کہ صدام کو اس سال کے اختتام سے پہلے پھانسی دیدی جائے گی۔

بش ایڈمنسٹریشن کے اعلیٰ حکام کے مطابق زلمے خلیل زاد کا واشنگٹن میں سب سے بڑا رابطہ وزیر خارجہ کنڈولیزا رائس کے ساتھ تھا، اور انہوں نے بھی بغداد میں موجود امریکی کمانڈروں کے خدشات کے باوجود صدام حسین کو عوامی حکومت کے سپرد کرنے کی منظوری دیدی تھی۔ رائس کو صدر بش کے نیشنل سیکیورٹی ایڈوائزر اسٹیفن جے ہیڈلی کی حمایت بھی حاصل تھی۔ عراق کے صدر جلال طالبانی نے پھانسی کے پروانے پر دستخط سے انکار کر دیا تھا، تاہم وزیر اعظم المالکی کے نام ایک خط میں انہوں نے لکھا کہ اگر عراقی حکومت پھانسی دے دیتی ہے تو انہیں کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔

جمعہ کی نصف شب، وزیر اعظم مالکی سے ناکام بات چیت کے بعد جنرل گارڈنر نے کیمپ کراپر کے امریکی کمانڈروں سے رابطہ کیا اور انہیں صدام حسین کو عراقیوں کی تحویل میں دینے کی اجازت دیدی۔ زلمے خلیل زد نے عراق کی سپریم جوڈیشل کونسل کے چیف جج مدحت المحمود سے پھانسی کی تحریری منظوری لینے کی تجویز بھی پیش کی تھی اور المحمود نے انکار کر دیا تھا۔ اب عراقیوں نے اپنا ٹرمپ کارڈ کھیلا۔ انہوں نے نجف میں شیعہ علماء سے رابطہ کیا اور "مراجع" (اہل تشیع کے سپریم لیڈر) سے پھانسی کی منظوری حاصل کرنے کی درخواست کی۔ وہاں سے منظوری کے بعد وزیر اعظم مالکی نے پھانسی کے حکم پر دستخط کر دیئے، تب رات پونے بارہ بجے تھے۔

نیوز ویک کی سٹوری کے مطابق امریکیوں نے پھانسی کے موقع پر غیر ملکی اخباری نمائندوں اور اقوام متحدہ کے مبصرین کی موجودگی میں تجویز بھی پیش کی، جسے عراقیوں نے مسترد کر دیا...... تب صدام حسین کو عراقیوں کے سپرد کرنے کے لئے کیمپ کراپر میں امریکی ہیلی کاپٹر تیار کھڑے تھے۔ اس موقع پر سیکیورٹی کے غیر معمولی انتظامات بھی تھے۔ امریکیوں نے صدام کے ساتھ "سونگھنے والے کتے" (Sniffer dogs) روانہ کرنے کا بھی اہتمام کیا تھا۔

کیمپ کراپر سے روانگی سے پہلے صدام نے امریکی فوجیوں کو الوداع کہا، جو قید تنہائی کے گیارہ سو دس (1110) دنوں میں اس کی نگرانی پر مامور رہے تھے۔ 5 بجکر 15 منٹ پر ہیلی کاپٹر "کیمپ جسٹس" میں اترا تو صدام نے دوبارہ ایک ایک امریکی کا شکریہ ادا کیا۔ 5 بجکر 21 منٹ پر اسے جیل کے اندر لے جایا گیا۔ امریکی اسے ایک کمرے میں لے گئے، جہاں اسے عراقیوں کے تحویل میں دیتے ہوئے ضروری کاغذات کا تبادلہ ہوا۔

میجر جنرل ولیم کے بقول: "اس لمحے بھی وہ باوقار تھا۔ اس نے اپنے ترجمان کو خدا حافظ کہا اور ملٹری پولیس کے پورے سکواڈ، سکواڈ کے لیڈر لیفٹیننٹ، ڈاکٹر اور امریکی کرنل کا شکریہ ادا کیا۔

5:30 پر عراقیوں نے اسے اپنی تحویل میں لے لیا۔ امریکی افسر کے بقول "عراقیوں کی تحویل میں جانے کے بعد بھی وہ باوقار تھا لیکن اب اس کا رویہ حقارت آمیز بھی ہو گیا تھا"۔

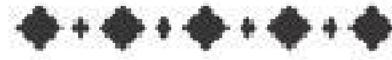
عراق کے سیکیورٹی ایڈوائزر مسٹر ربیعہ نے بتایا: "پھانسی گھاٹ کی طرف جاتے ہوئے اس نے بعض مزاحیہ ریمارکس بھی دیئے۔ مثلاً مجھے کہا: "ڈرو نہیں جیسے اسے نہیں، بلکہ مجھے پھانسی کے لئے لے جایا جا رہا ہو"۔

ایک امریکی اخبار نویس کے بقول صدام نے ایک بار ایک سوانح نگار سے کہا تھا اسے اس کی کوئی پرواہ نہیں کہ اس کے متعلق آج کیا کہا جاتا ہے، اسے زیادہ دلچسپی اس بات سے ہے کہ 500 سال بعد لوگ اس کے متعلق کیا کہیں گے۔ اسے تاریخ میں اپنے مقام کے حوالے سے زیادہ فکر

تھی۔

صدام اپنے انجام کو پہنچ گیا۔ اسے جس طرح اور جس وقت پھانسی دی گئی، اس نے اس کے متعلق ہمدردی کی لہر پیدا کرنے کے علاوہ، اسے پھانسی دینے والوں کے خلاف بھی نفرت کی لہر اٹھادی اور امریکی ایک اور مشکل سے دوچار ہو گئے۔ وہ دنیا بھر کی تنقید کا نشانہ ہیں اور اس کے جواب میں سارا المیہ وزیر اعظم المالکی پر ڈال رہے ہیں...... تو کیا وہ المالکی کو قربانی کا بکرا بنا دیں گے؟ جیسا کہ تیسری دنیا کے اکثر ملکوں میں اپنے ''کارندوں'' کو بناتے رہے ہیں۔

بشکریہ (رؤف طاہر)



جلتے ہوئے عراق کا مستقبل؟

عید قرباں کے روز امریکی جنونی صدر بش کے انتقام کی بھینٹ چڑھ کر خودداری اور آبرومندی کے ساتھ پھانسی کے پھندے کو چومتے ہوئے اپنی جان جانِ آفریں کے سپرد کرنے والے صدام حسین کو ہزاروں اشکبار آنکھوں کے سامنے ان کے آبائی گاؤں عوجہ میں سپرد خاک کر دیا گیا۔ ان کی تدفین کی رسومات کے مناظر رقت آمیز ہی نہیں، دل ہلا دینے والے تھے، ہزاروں سوگوار عراقی باشندے دھاڑیں مار مار کر رو رہے تھے اور امریکی کروسیڈی عزائم کے خلاف سراپا احتجاج بنے ہوئے تھے۔

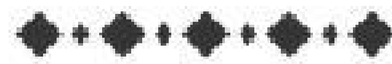
انسانی حقوق کے عالمی اداروں نے صدام حسین کی پھانسی کی مذمت کرتے ہوئے کہا ہے کہ یہ اقدام قانون کی حکمرانی کی نفی کے طور پر یاد رکھا جائے گا جس سے عراق میں خونریزی روکنے میں کوئی مدد نہیں ملے گی۔ ایمنسٹی انٹرنیشنل کے ڈائریکٹر برائے مشرق وسطیٰ میلکم سمارٹ نے باور کرایا کہ صدام کے خلاف مقدمے کی کارروائی خامیوں سے بھرپور تھی مگر اپیلیٹ کورٹ نے ان خامیوں کی طرف توجہ دینے کی زحمت تک نہ کی، اس لئے اس فیصلہ کو ''فاتح کے انصاف'' سے زیادہ کچھ نہیں کہا جاسکتا اور اس عمل سے سیاسی ہلاکتوں کی روایت کے خاتمہ میں مدد نہیں مل سکتی۔ اسی طرح امریکہ میں قائم ہیومن رائٹس واچ نے کہا ہے کہ تاریخ صدام حسین کی پھانسی کا کڑا احتساب کرے گی۔ عراق کی کالعدم بعث پارٹی نے صدام حسین کی پھانسی کا انتقام لینے کا اعلان کرتے ہوئے عراقی عوام پر زور دیا ہے کہ وہ اپنے تنظیمی ڈھانچے کو بھول جائیں اور اس اقدام کا تباہ کن جواب دیں۔ بعث پارٹی کی قیادت نے صدر بش کے نام ایک پیغام میں کہا ہے کہ وہ اس معمولی سی فتح پر خوش نہ ہوں بلکہ انہیں ہماری انتقامی کارروائیوں کیلئے اب تیار ہو جانا چاہیے۔

صدام حسین کی پھانسی کے ردِعمل میں عراقی عوام کے بھپرے ہوئے جذبات اس امر کی نشاندہی کر رہے ہیں کہ اب صرف عراق میں ہی امن و سکون کی منزل کوسوں دور نہیں چلی گئی بلکہ عالمی امن کو بھی بہت بڑا خطرہ لاحق ہو گیا ہے۔ جس کی بنیاد عالم اسلام کے خلاف اپنے بدنیتی پر مبنی عزائم کی تکمیل کرتے ہوئے صدر بش نے خود رکھی ہے اس لئے اقوام عالم میں بجا طور پر یہ تاثر ابھر رہا ہے کہ عالمی امن کے لئے صدر بش اور ان کے حواری ہی سب سے بڑا خطرہ ہیں چنانچہ اب بش کے خلاف اقوام عالم اور عالم اسلام کے احتجاج کو مزید تقویت حاصل ہوگی۔ اب جہاں بش اور انکے حواریوں کی راتوں کی نیندیں حرام ہوں گی وہاں دنیا بھر میں موجود امریکی باشندوں کی زندگیاں بھی خطرات میں گھری رہیں گی اس لئے بش کے

اقتدار کا باقیماندہ عرصہ خلفشار اور افراتفری میں ڈوبا ہوا نظر آ رہا ہے جبکہ عراق کے عوام اب شائد ہی اپنے لئے خوشی اور خوشحالی کا کوئی دن دیکھ پائیں گے۔ 9/11 کے بعد 2003ء میں امریکہ اور اس کے اتحادیوں کی افواج کی جانب سے عراق میں شروع کی گئی جارحیت کے بعد سے اب تک عراق کے عوام کو کڑی آزمائشوں اور مصیبتوں سے گزرنا پڑ رہا ہے۔ پہلے امریکی حملوں نے عراق کو تہس نہس کیا۔ اس کے تیل کے کنوؤں اور معیشت کو برباد کیا جبکہ صدام حکومت کی معزولی کے بعد عراقی عوام مزاحمت کاروں کی زد میں آ کر گاجر مولی کی طرح کٹتے رہے۔

امن وامان کی اس بدترین صورت حال نے عراقی قوم کو غربت وافلاس کی انتہا تک پہنچا دیا ہے اور عراق کی کٹھ پتلی حکومت اپنے عوام کو روزگار کا تحفظ تو کیا جان و مال کا تحفظ بھی نہیں دے سکی البتہ عراقی عوام کو امریکی جنگی جنونی عزائم کی بھینٹ چڑھانے کا موقع ضرور فراہم کیا گیا ہے۔ اب صدام حسین کی پھانسی کے بعد عراق میں تشدد اور تخریب کاری کی جو نئی لہر پیدا ہو رہی ہے وہ بچے کھچے عراق کا مزید حلیہ بگاڑ دے گی اور انتقام کی آگ نہ جانے کس کس کو بھسم کر دے گی۔

عراقی عوام کے نام لکھے گئے اپنے خط میں صدام حسین نے انہیں جہاں صبر کی تلقین کی ہے، وہاں انہوں نے عراقی عوام کو متحد رہنے کی تلقین کرتے ہوئے یہ بھی باور کرایا ہے کہ عراقیوں کا اتحاد ہی حملہ آور دشمنوں کے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے اس لئے وہ غیر منصفانہ اور جابر ممالک کے ساتھ مقابلہ میں خدا تعالیٰ پر انحصار کریں۔ صدام حسین کے اس پیغام کو اپنے دل میں بسانے والے عراقی عوام خاموش تو نہیں بیٹھے رہیں گے۔ تشدد کی کارروائیاں بڑھیں گی تو عراق کی امن وسکون اور ترقی وخوشحالی کی منزل اور بھی دور چلی جائے گی۔ جب عراق کی معیشت ہی نہیں سنبھل پائے گی تو اس کے عوام بھی زندہ درگور ہونے سے نہیں بچ سکیں گے۔ عراق میں انسانیت کے خلاف ان جرائم کی ذمہ داری صرف امریکی صدر بش پر عائد ہوتی ہے جنہوں نے عالم اسلام کی آماجگاہ عراق کو دانستہ طور پر جہنم زار کی طرف دھکیل دیا ہے۔ یہ صورت حال پورے عالم اسلام کے لئے لمحہ فکریہ ہے۔ امریکہ عالم اسلام کے خلاف اپنی مکروہ سازشوں کی تکمیل کے منصوبے بنا رہا ہے اور ہم ہیں کہ پھر بھی اس کی مکروہ خواہشات کے اسیر بنے ہوئے ہیں اس کی تابعداری کر رہے ہیں اور اس کے اشارے سے پہلے ہی اس کے احکام کی تعمیل کے لئے حاضر وتیار نظر آتے ہیں۔ کیا اب بھی عالم اسلام کے اتحاد کی کوئی ضرورت محسوس نہیں کی جا رہی؟



صدام حسین کا انجام اور مسلم حکمرانوں کے سبق

عراق کے سابق صدر صدام حسین پھانسی کے تختے پر چڑھ کر دنیا کو یہ سبق دے گئے کہ

ے دنیا میں ٹھکانے دو ہی تو ہیں آزاد منش انسانوں کے
یا تخت مقام آزادی کا یا تختہ جگہ آزادی کی

صدام حسین عراق کی تاریخ کا ایسا ناقابل فراموش کردار ہے جن کے بارے میں جہاں یہ کہا جاتا رہا ہے کہ وہ امریکا کے ایجنٹ ہیں وہاں مغربی استعمار سے جاں بلب مسلمانوں کے ایک حلقے کے نزدیک وہ امت کے ہیرو شمار ہوتے ہیں۔ انہیں جہاں بے دین ملحد، ظالم وجابر اور سفاک انسان کہا جاتا رہا ہے وہاں ایک بہت بڑا طبقہ انہیں "مجاہد" مانتا آیا ہے۔ 1990ء کی جنگ خلیج میں جب امریکا نے عرب ممالک کو ساتھ لے کر عراق پر حملہ کیا تو ان دنوں پاکستان کا کوئی گلی کوچہ ایسا نہ تھا جہاں صدام کے بڑے بڑے پوسٹر آویزاں نہ ہوں...... زبان خلق اسے عالم اسلام کا وہ نجات دہندہ کہہ رہی تھی جس نے پہلی بار امریکا کے خلاف خم ٹھونک کر کھڑے ہونے کی جرات کی تھی۔ اگرچہ جنگ کے نتائج سامنے آنے کے بعد صدام کی وہ مقبولیت باقی نہ رہی پھر اس سازش میں خود صدام کے امریکا کے آلہ کار کی حیثیت سے استعمال ہونے کے تجزیے بھی سامنے آنے لگے تاہم ان تمام باتوں کے باوجود ان کا جو امیج بن گیا تھا وہ بہت سے دلوں پر عرصہ دراز تک چھایا رہا، پھر ان کی...... اگر صدام حسین کی زندگی کے نشیب وفراز کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ وہ ایک سیماب صفت انسان تھے، حد درجہ متحرک، نڈر اور مضبوط ارادے کے مالک تھے بچپن میں تعلیم و تربیت کا صحیح ماحول نہ ملنے کی وجہ سے تشدد پسندی بنیادی طور پر ان میں رچ بس گئی تھی۔ 12 سال کی عمر میں گھر سے بھاگنے والا یہ لڑکا کن کن مراحل سے گزر کر اقتدار تک پہنچا...... یہ ایک ڈرامائی طرز کی داستان ہے کاش کہ صدام حسین کو اپنی سوانح خود لکھنے کا موقع مل جاتا تو وہ صدر پرویز مشرف کی بہ نسبت حقیقی معنوں میں "ان دی لائن آف فائر" لکھ سکتے تھے۔

انہوں نے جیل کی سلاخیں بھی توڑیں، آگ اور خون کی ندیاں بھی پار کیں، خوں ریز جنگیں بھی لڑیں وہ جیتے بھی اور ہارے بھی انہوں نے شکست کو ہمیشہ کھلے دل سے قبول کیا اور نئے سرے سے تیاری میں مصروف ہو جانے کو اپنا وطیرہ بنالیا...... اگرچہ ایک عرصے تک انہوں نے امریکا کے لئے کام کیا اور بعد میں امریکا کی حمایت سے وہ اقتدار میں آئے مگر جب ان کی پالیسیاں امریکی گرفت سے آزاد ہو کر اسلامی اور ملی تقاضوں سے ہم آہنگ ہونے لگیں تو امریکا نے انہیں "دہشت گرد" بنادیا اور یوں عراق کا یہ مضبوط حکمران امریکا ہی کے ہاتھوں تختہ دار پر کٹ گیا۔ ان کی پھانسی میں عراق کے ایران نواز گروپوں نے جو کردار ادا کیا وہ انتہائی افسوسناک ہے، یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ مقتدی الصدر کو عراق سے زیادہ اپنے مخصوص نظریات سے دلچسپی ہے۔ جس کے لئے وہ امریکا کی چاکری بھی کر سکتے ہیں اور عراق کو تقسیم کرنے کی سازش میں بنیادی کردار بھی بن سکتے ہیں۔

چند دن پہلے میں صدام حسین کے انجام کے بارے میں اپنے ایک بزرگ سے تبادلہ خیال کر رہا تھا وہ فرمانے لگے "میں تو اس واقعے کو اس نگاہ سے دیکھتا ہوں کہ ایک مطلق العنان حکمران جس نے 24 برس تک کسی کو سر نہ اٹھانے دیا، آخر کتنے حسرت ناک انجام سے دوچار ہوا، اللہ تعالیٰ کے کام بھی عجیب ہیں، کسی کو ایک وقت تخت پر بٹھاتے ہیں اور دوسرے وقت اسے تختے پر لے آتے ہیں، جب ہر طرف صدام حسین کا طوطی بولتا تھا تو کیا اس نے کبھی تصور کیا ہوگا کہ اس کا یہ انجام ہوگا......"

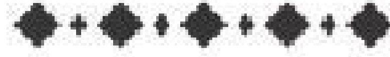
ان بزرگ کی باتیں سو فیصد سچائی پر مبنی تھیں، میں ان پر غور کرتے ہوئے سوچنے لگا...... صدام حسین نے اپنے دور عروج میں شاید کبھی اس انجام کا تصور نہ کیا ہو...... مگر کیا آج دنیا کے درجنوں ممالک پر مسلط ان حکمرانوں کو یہ انجام اپنی آنکھوں سے نظر نہیں آیا، جو امریکا کی انگلی پکڑ کر مسند اقتدار پر آئے ہیں اور اس کا کلمہ پڑھ کر عوام پر دھاک جمائے بیٹھے ہیں کیا اتنا بڑا واقعہ بھی ان کی آنکھیں نہیں کھول سکا؟

میں دیکھ رہا ہوں کہ اس وقت صدام حسین کے قتل سے عالم اسلام کے اکثر لوگ غمزدہ ہیں، ماتم کناں ہیں، ادھر صدام کی پھانسی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینے والے مخصوص طبقے کے لوگ خوشیاں منا رہے ہیں۔ غیر مسلم، صدام کی آخری وقت کی بے مثال جرات و استقامت پر حیرت زدہ ہیں مگر ان طبقوں کے درمیان ایک طبقہ وہ بھی ہے جو تھر تھر کانپ رہا ہے، اس کی راتوں کی نیند اڑ چکی ہے جی ہاں یہ طبقہ مسلم حکمرانوں کا ہے جو صدام کے انجام سے نہایت خوفزدہ ہیں...... ان کی کیفیت بالکل وہی ہے جو اسکول میں ایک نالائق بچے کو مار کھاتا دیکھ کر دوسرے بچوں کی ہوتی ہے۔ انہیں یقین ہوتا ہے کہ اگر ہم نے کوئی ایسی ویسی حرکت کی تو ماسٹر جی کا ڈنڈا ہماری کمر پر بھی اسی طرح برسے گا۔

صدام حسین کو پھانسی کے تختے پر چڑھا کر امریکا نے اپنی کلاس کے تمام بچوں کو ایک عبرتناک منظر دکھادیا ہے اور نہیں بزبان حال تحکم آمیز پیغام دیا ہے کہ سیدھے سیدھے رہنا ورنہ تمہارا بھی یہی حشر ہوگا...... عملی طور پر دیا جانے والا یہ پیغام فون پر دی جانے والی دھمکیوں سے کہیں زیادہ سخت ہے...... یہی وجہ ہے کہ مسلم حکمرانوں کے دبے دبے احتجاج کی مجموعی صدائیں ڈرپوک بچوں کی خوفزدہ سسکاریوں سے زیادہ کوئی تاثر پیدا نہیں کر پائیں...... کاش یہ حکمران بچپن کی نادان طبیعت کے دائرے سے باہر نکل کر مرد میدان بنیں...... صدام حسین کے انجام سے خوف کا سبق حاصل کرنے کی بجائے اس کے آخری دنوں کے اور آخری لمحات کے کردار سے درس شجاعت لیں...... وہ اس حقیقت کو سمجھ لیں کہ امریکا کسی کا

دوست نہیں ...... اس کی فطرت اس قابل نہیں کہ وہ کسی کا دوست بن سکے ...... وہ صرف اور صرف دشمنی کرنا جانتا ہے ...... اور وہ بھی بے اصولی کے ساتھ ...... اور بدقسمتی سے اسے گماشتے بھی ہر جگہ میسر آ جاتے ہیں جو امت کے اجتماعی مفادات سے کوئی سروکار نہیں رکھتے۔ عراق میں اگر اسے لوگ میسر نہ آتے تو صدام حسین کو پھانسی دینا اتنا آسان نہ ہوتا ...... مسلم حکمران اس وقت سے ڈریں جب امریکا ایسے ہی گماشتوں کو ان کے خلاف استعمال کر کے انہیں نمونہ عبرت بنا دے۔ وہ خوش فہمی میں نہ رہیں کہ جب تک وہ امریکا کے کام آتے رہیں گے، محفوظ ہوتے رہیں گے، اس لیے کہ ''ٹشو پیپر'' کتنا ہی عمدہ کیوں نہ ہو بہت جلد استعمال کر کے کوڑے میں پھینک دیا جاتا ہے۔

بشکریہ (محمد اسماعیل ایمان)



صدام حسین سے متعلق ان کہی باتیں

چنگیز خان کا یہ جملہ تاریخ میں ایک ایسی دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے جس کو جھٹلایا نہیں جاسکتا ہے۔اس نے بغداد میں داخل ہونے سے پہلے کہا کہ ”مجھے بغداد پر حملہ کرنے کا عندیہ تو خود بغداد کے مسلمانوں نے دیا ہے، ان کے درمیان پائے جانے والے گہرے اختلافات کی وجہ سے میں یہاں آیا، وہ..........“ اس کے بعد چنگیز خان کی فوج نے جس کی تعداد ایک لاکھ کے قریب تھی بغداد کی اینٹ سے اینٹ بجادی اور اب عراق کی جدید تاریخ کے پس منظر میں صدام حسین نے امریکہ کے ساتھ مل کر کچھ ایسے اقدامات اٹھائے جس کی وجہ سے عراق کے مسلمانوں کو یہ ہولناک اور انتہائی تکلیف دہ دن دیکھنے پڑ رہے ہیں۔صدام حسین نے 24 سال عراق پر حکومت کی، وہ بعث پارٹی کے سربراہ ہونے کے ساتھ ساتھ Pan Arabism کے بھی بہت بڑے پرچارک تھے۔24 سال کسی بھی ملک کے سربراہ کے لئے بہت طویل عرصہ ہوتا ہے۔اس دوران اگر کوئی حکمران اپنے ہم وطنوں کے ساتھ مخلص ہوتا ہے تو وہ تاریخ میں امر ہو جاتا ہے اور آنے والی نسلیں اس سے رہنمائی لیتی ہیں۔صدام حسین نے ایسا نہیں کیا حالانکہ وہ ایک سیکولر حکمران تھے ابتداء میں انہوں نے عراق میں تعلیم اور صحت کے شعبے میں نمایاں کام کئے لیکن وہ عوام کی بہتری، بھلائی اور بہبود کے سلسلے میں رفاہی اور اصلاحی کام جاری نہیں رکھ سکے بلکہ انہوں نے اپنے قریبی پڑوسیوں سے بھی اچھے تعلقات استوار نہیں رکھے حالانکہ مشرق وسطیٰ میں عراق وہ واحد ملک ہے جس کے پاس تیل، پانی اور زراعت کا شعبہ اچھی حالت میں موجود ہے لیکن انہوں نے ان قدرتی وسائل سے فائدہ نہیں اٹھایا۔

لیکن انہی دنوں جب صدام حسین عربوں کے ایک نمایاں لیڈر بن کر ابھر رہے تھے ان کی دوستی امریکہ سے ہوگئی اور اس دوستی کو آگے بڑھانے میں امریکہ کے سابق سیکرٹری دفاع رمزفیلڈ کا بہت اہم کردار تھا۔انہوں نے بعض پڑوسی عرب ممالک کے تعاون سے صدام حسین کو ایران پر حملہ کرنے کے لئے راضی کرلیا۔چنانچہ شط العرب کے مسئلے پر عراق اور ایران جنگ آٹھ سال تک جاری رہی جسمیں دونوں طرف کے 14 لاکھ مسلمان مارے گئے جس میں بچے اور بوڑھے بھی شامل تھے۔

عراق اور ایران جنگ میں جہاں مسلمانوں کا خون بہا وہیں اسرائیل اور امریکہ بہت مسرور و شادمان تھے، وہ مسلمانوں کے درمیان گہرا نفاق اور نفرت پیدا کرنے میں کامیاب ہو چکے تھے۔نیز دونوں طرف سے قدرتی وسائل یعنی مسلمانوں کے وسائل جس طرح اس جنگ کی صورت میں برباد ہوئے اس پر جتنا افسوس کیا جائے کم ہے۔عراق ایران جنگ ختم ہونے کے بعد امریکہ بہادر نے عراق میں تعینات اپنی سفیر کو یہ ہدایت کی کہ وہ کسی طرح صدام حسین کو کویت پر حملہ کرنے کے لئے راضی کرے تاکہ امریکہ کویت کی مدد کے بہانے مشرق وسطیٰ میں اپنے قدم جما سکے چنانچہ

صدام حسین نے ایسا ہی کیا حالانکہ انہیں سوویت سفیر نے منع کیا تھا کہ وہ ایسا نہ کریں کیونکہ امریکہ انہیں Trap کرنا چاہتا ہے۔ کرنل قذافی نے بھی انہیں مشورہ دیا کہ وہ کویت پر حملہ کرنے کا سوچیں بھی نہیں لیکن وہ کویت پر حملہ کرنے کا پختہ ارادہ کر چکے تھے چنانچہ انہوں نے ایسا ہی کیا.......... پھر بعد میں کیا ہوا یہ سب جانتے ہیں لیکن تاریخ میں چنگیز خان کے الفاظ آج بھی مسلمانوں کی سوچ پر تازیانے برسا رہی ہے۔ مسلمانوں کے درمیان پائی جانے والی مسلکی اور قومیت پرمبنی عصبیتوں نے آج انہیں اتنا کمزور کر دیا ہے کہ وہ عالمی سطح پر سر اٹھا کر چلنے کے قابل نہیں ہیں۔ مسلمانوں کے اس داخلی نفاق جو ہر اسلامی ملک میں نظر آرہا ہے سامراج کی ایسی چال ہے۔ جس میں مسلمان ممالک بری طرح پھنس چکے ہیں نیز جو افراد ان کی مخالفت کررہے ہیں ان کے پاس جدید افکار کا فقدان ہے ورنہ حالات کے تقاضوں کا مکمل ادراک نہیں رکھتے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی جدوجہد عصبیت پرمبنی ہے۔ جس میں شور شرابا تو بہت ہے لیکن طاقت اور باہمی اتحاد نہ ہونے کی وجہ سے ان کی جدوجہد ناکام ہوتی نظر آرہی ہے۔ صدام حسین نے امریکہ کو یہ موقع فراہم کیا کہ وہ اپنی افواج مشرق وسطیٰ میں لے آئے جس کی وجہ سے آج اسرائیل ہر مسلمان ملک کے لیے ایک Political Threat بنا ہوا ہے۔

صدام حسین کے حوالے سے اب عراق کی تاریخ کا ایک بہت طویل باب ختم ہو چکا ہے۔ ظلم کی داستان صدام حسین کی پھانسی کے ساتھ اب تاریخ کا حصہ بن چکی ہے لیکن عراق کے عوام کے مصائب اور تکالیف ختم نہیں ہوئی ہیں۔ وہ ایک بار پھر سامراج کی پالیسی "لڑاؤ اور حکومت کرو" کے حصار میں ہیں۔ شیعہ سنی اختلافات کو ہوا دی جارہی ہے حالانکہ سامراج کا مسلمانوں کے مسلک سے کیا واسطہ لیکن اس کے باوجود عراقی مسلمان سامراج کی پالیسیوں پر عمل پیرا ہو کر مسلک کی بنیاد پر ایک دوسرے کا خون بہا رہے ہیں جبکہ مہذب دنیا کے بعض غیر جانبدار مفکر اس بات پر حیرت زدہ ہیں کہ کیا مسلمانوں میں اتنا شعور نہیں ہے کہ وہ اپنے دشمن کو پہچان سکیں......؟ شاید ہے بھی اور نہیں بھی، لیکن اس ضمن میں ایک اور حیرت زدہ کرنے والی بات یہ بھی ہے کہ صدام حسین کو تین سال امریکہ نے گرین زون میں قید کر کے ان سے وہ ساری معلومات حاصل کر لی ہیں جو آئندہ کے لئے امریکہ اور اسرائیل کے توسیع پسندانہ عزائم میں معاون و مددگار ثابت ہوسکتی ہیں۔ ایک عراقی نے جو پاکستان آیا ہوا تھا اس نے بتایا کہ صدام حسین کو امریکہ نے عمر قید کا اشارہ دے کر ان سے عرب ممالک کی تمام کمزوریوں اور دفاعی صلاحیتوں کا حال معلوم کر لیا تھا نیز ان سے بعث پارٹی کے عروج وزوال کی تمام حکایات بھی معلوم کر لی تھیں جس میں فلسطینیوں کے لئے ان کی فوجی، مالی اور اخلاقی امداد کی مکمل داستان بھی شامل تھی۔ اس وقت امریکہ اور اسرائیل کے پاس صدام حسین کی زبانی عرب اور مسلمان ممالک سے متعلق وہ تمام معلومات موجود ہیں جن کی مدد سے وہ مشرق وسطیٰ میں اپنی آئندہ حکمت عملی اختیار کر کے ان کے وسائل پر مکمل قبضہ کر سکتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ صدام حسین نے قید کے آخری ایام میں یہ مشورہ بھی دیا تھا کہ ایران پر حملہ کر دینا چاہیے ورنہ چند سالوں میں ایران مشرق وسطیٰ کا بے تاج بادشاہ ہوگا اور اسرائیل سمیت تمام عرب ممالک اس کے دست نگر ہوں گے لیکن امریکہ کو تمام معلومات دینے کے باوجود صدام حسین پھانسی سے نہیں بچ سکے اور اب ایسی جگہ چلے گئے ہیں جہاں مکافات عمل کا دوسرا انصاف شروع ہوگا جہاں ان کی سامنے ان کا اعمال نامہ ہوگا اور زبان بند ہوگی۔

بشکریہ (آغا مسعود حسین)

امریکہ نے چھ ہزار سالہ عراقی تہذیب جلادی

ہر شخص جانتا ہے کہ صدام کی مہلک ہتھیار بندیوں کے بارے میں امریکہ کے سارے دعوے سفید جھوٹ ثابت ہوئے۔ اس کے باوجود اقوام متحدہ کی ممانعت کے علی الرغم امریکہ نے عراق میں کشتوں کے پشتے لگادیے۔ اب امریکی فوج نے عراقیوں کی تازہ 'خدمت' یہ انجام دی ہے کہ ان کے چھ ہزار سالہ علمی تاریخی اور تہذیبی اثاثے بھسم کرڈالے ہیں۔ یہ سانحہ اس وقت پیش آیا جب بغداد کے عجائب گھر اور قرآن کریم کے نایاب نسخوں کی لائبریری کو آگ لگادی گئی۔ یہ خبر آئی تو اس پر نہ صرف مسلمان اہل علم کا دل خون ہوگیا، بلکہ رابرٹ فسک جیسا بدیسی صحافی بھی کف افسوس ملے بغیر نہ رہ سکا۔

رابرٹ فسک اس وحشیانہ واردات کا عینی شاہد ہے۔ وہ موقع واردات کی تفصیلات بتاتے ہوئے لکھتا ہے:

امریکی فوج نے بغداد کے عجائب گھر کا محاصرہ کرلیا۔ لٹیروں کے غول ایک سرے سے دوسرے سرے تک پھیل گئے۔ انہوں نے دیکھتے ہی دیکھتے عجائب گھر کو آگ لگادی۔ دھواں اٹھنے لگا۔ شعلے بلند ہونے لگے۔ اور کتابوں کے سالخوردہ نسخے تیزی سے جلنے لگے۔ میں نے ایک کتاب اچک لی۔ دیکھا تو پتا چلا کہ یہ اسلامی قوانین کے بارے میں ایک قیمتی دستاویز ہے۔ میں نے اسے محفوظ کرنے کی کوشش کی تو مجھ پر آوازے کسے گئے۔ عجائب گھر کا صحن کشادہ کوڑے دان کا منظر پیش کررہا تھا۔ یہاں راکھ کے ایک ڈھیر میں چند کاغذات دکھائی دیے۔ میں نے غور سے دیکھا۔ یہ مکہ (مکرمہ) کے شریف حسین کے ہاتھ کے لکھے ہوئے خطوط تھے۔ شریف حسین وہ شخص تھا جو لارنس آف عربیا کے ساتھ مل گیا تھا اور ترکوں کے خلاف بغاوت کی آگ پر تیل ڈال رہا تھا۔

خاکستر کا ایک اور ڈھیر نظر آیا۔ اس میں مختلف عرب حکمرانوں کے نام بھیجے ہوئے خطوط ملے۔ کچھ جلے تھے۔ کچھ بچ گئے تھے۔ ان میں فوجیوں کے لیے ہتھیاروں کی ترسیل کی درخواست کی گئی تھی۔ ایک مکتوب میں حاجیوں پر حملوں کی تفصیلات عربی رسم الخط میں درج تھی۔ اسی دوران قرآن کریم کے قدیم نسخوں کی لائبریری پر نظر پڑی۔ کھڑکیوں سے تقریباً سو سوفٹ بلند شعلے اچھل رہے تھے۔ یہ ہولناک صورت حال تھی۔ میں گوارا نہ کرسکا۔ امریکی میرین کے شہری امور کے بیورو کی طرف بھاگا۔ ایک امریکی افسر کو آتش زنی کی بات بتائی۔ اس نے مجھے کوئی جواب نہیں دیا۔ البتہ اپنے ساتھی کو چلا کر پکارا۔ پھر میری طرف انگشت نمائی کی اور کہا کہ یہ شخص کہہ رہا ہے کہ کوئی مذہبی لائبریری جل رہی ہے۔

میں نے انہیں بتایا کہ آگ کے شعلے تین میل دور ہی سے نظر آرہے ہیں۔ یہاں سے وہاں تک پہنچنے میں چند منٹ لگیں گے لیکن یہ لوگ غائب ہوگئے۔

ایک زمانہ تھا جب کہا جاتا تھا کہ عربوں کی کتابیں قاہرہ میں لکھی جاتی ہیں۔ بیروت میں چھپتی ہیں اور بغداد میں پڑھی جاتی ہیں۔ اب وہی کتابیں راکھ کا انبار بنادی گئی تھیں۔ عراق کے قومی آثار قدیمہ میں محض خلافت عثمانیہ ہی کا ریکارڈ نہیں تھا بلکہ عراق کے سیاہ تاریخ کے نئے دور کا

ریکارڈ بھی موجود تھا۔۱۹۸۰ء سے ۱۹۸۸ء تک جاری رہنے والی ایران عراق جنگ سے متعلقہ اہم قلمی رپورٹیں بھی یہیں تھیں۔عراقی حکمرانوں اور جرنیلوں کی تصویریں بھی یہاں آویزاں تھیں۔۱۹۹۰ء تک کے عربی اخبارات کی مائیکرو فلمیں بھی یہیں رکھی ہوئی تھیں۔ یہ سب کچھ آناً فاناً بھسم ہو گیا۔

فرش پر پڑے ہوئے کاغذات اس قدر حدت دے رہے تھے کہ انھیں چھونا مشکل تھا۔میں نے یہ کاغذات اٹھائے تو وہ راکھ بن کر جھڑنے لگے۔اسی آتش زدہ ڈھیر میں سے ایک بچے کھچے کاغذ کے ٹکڑے ملے۔ یہ ایک پرانا خط تھا۔اس پر کسی فرد حسنی عطیہ اعجازی' کے دستخط تھے۔اس نے شریف مکہ کو لکھا تھا کہ ''میں آپ کا بہت وفادار غلام ہوں۔ میرے اونٹوں کا قافلہ آرہا ہے۔ان پر چاول' شکر اور چائے کی بڑی مقدار لدی ہوئی ہے۔اس قافلے کی حفاظت کی جائے۔''

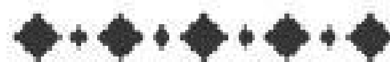
رابرٹ فسک نے لکھا ہے ''مجھے ایک اور درخواست بھی ملی۔ جو شریف مکہ کے ایک درباری جابر العیاشی نے بغداد بھیجی تھی۔اس میں اس نے کوئی خوشبو بھیجنے کی اطلاع دی ہے اور درخواست کی ہے کہ میرا سامان ڈاکوؤں کی لوٹ کھسوٹ سے بچایا جائے۔اس کے صلے میں انعام دیا جائے گا۔اس درخواست پر ۱۹۱۲ء کی تاریخ درج ہے۔''

بعض کاغذات میں خلافت عثمانیہ کے لیے اسلحہ' گولیوں اور فوجی مقاصد کے گھوڑوں کی قیمتیں لکھی ہوئی تھیں۔ایک دستاویز حجاز میں پہلے ٹیلی فون ایکسچینج کی تنصیب کے بارے میں تھی۔ ایک درخواست اردن کے ایک گاؤں ازرک کے باشندوں کی طرف سے تھی جس میں لکھا تھا کہ ایک شخص علی بن قاسم نے ان کے اونٹوں کے قافلے سے کپڑا چرالیا تھا۔ یہ شخص دھر لیا گیا لیکن اس نے تفتیشی افسروں پر چھری سے حملہ کر دیا۔اسے گرفتار کرلیا گیا ہے......اسی ڈھیر میں ایک تاجر یحیٰی سعودی کے لیے ایک سفارشی خط بھی دکھائی دیا۔اسے نہایت شریف طبع شخص بتلایا گیا تھا۔ یہ شخص حکومت عثمانیہ کے لیے کام کرتا تھا۔''......رابرٹ فسک نے اس رپورٹ کا اختتام ان جملوں پر کیا ہے:

''بغداد تقریباً ایک ہزار سال سے عرب دنیا کا علمی وثقافتی مرکز رہا۔چنگیز خان کے پوتے ہلاکو خاں نے اس شہر کو تیرہویں صدی میں تاراج کر دیا تھا۔کہا جاتا ہے کہ اس موقع پر دریائے دجلہ کا پانی قلمی کتابوں کی سیاہی سے کالا ہو گیا تھا......اور آج اسی بغداد کی فضا کتابوں کے شعلوں سے سرخ ہو گئی تھی۔''

راقم نے برطانوی صحافی کی یہ رپورٹ پڑھی تو خیالوں کا رخ ماضی کی طرف مڑ گیا۔یاد آیا' جب طالبان گوتم بدھ کا مجسمہ ڈھا رہے تھے'اس وقت امریکہ نے کتنا واویلا مچایا تھا اور تاریخی ورثے کی حفاظت کی کیسے دھائی دی تھی......لیکن آج اسی امریکہ نے عراق میں اس توانا تہذیب و تاریخ کے آثار بھسم کر دیے جن کی قدامت ماضی میں چھ ہزار سال سے زیادہ مدت تک پھیلی ہوئی تھی......

اس سانحے پر دل سے گریہ اٹھا' یا خدا! باطل کے ناپاک غرور سے تیری دھرتی کب پاک ہوگی؟



''جنت ارضی'' کو ''جہنم زار'' بنانے کا امریکی منصوبہ

11 ستمبر 2001ء کے بعد امریکیت کے علمبردار دنیا کے نقشے اور انسانی تاریخ کو وسیع پیمانے پر تباہی پھیلانے والے غیر روایتی ہتھیاروں کے زور پر تبدیل کرنے کا عزم اور ایجنڈا لے کر میدان رستا خیز میں کود چکے ہیں۔ ان کا بنیادی ہدف عالم اسلام کے نقشے کا حلیہ بگاڑنا اور اس پر اپنے مخصوص مفادات کے تحفظ کیلئے نئی لکیریں کھینچنا ہے۔ لبنان پر اسرائیل کی حالیہ جنگی جارحیت کو بھی امریکا کھلم کھلا سپانسر کر رہا ہے۔ اس جارحیت اور درندگی کا ایک مقصد امریکیوں نے ''نئے مشرق وسطیٰ کی تخلیق و تولید'' بھی بتایا ہے۔ یہی امریکا کا نیو ورلڈ آرڈر ہے۔ نیو ورلڈ آرڈر جسے بالغ نظر دانشور ''نیوز ورلڈ آرڈر'' سے تعبیر کرتے ہیں۔ اگر وہ ایسا کرتے ہیں تو یقیناً بے جا نہیں کرتے۔ حقیقت یہ ہے کہ امریکا کی حیثیت اس وقت اس ''داستانوی دیو'' کی سی ہے جس کی جان اسرائیلی نامی طوطے میں ہے۔ اسے ڈر ہے کہ الاخوان، حماس، حزب التحریر، حزب اللہ، یا طالبان نامی کفن بردوش اور سربکف تنظیم کا کوئی نڈر اور جگر دار مجاہد اس طوطے کی گردن مروڑ کر نہ رکھ دے۔ اسرائیل مشرق وسطیٰ کے نقشے کے لیبر روم اور بستر پر جنم لینے والا عالمی طاقتور کا مشترکہ ناجائز بچہ ہے۔ ناجائز بچہ، جسے روشن خیال اور اعتدال پسند امریکی اور مغربی ''لوز چائلڈ'' قرار دیتے ہیں۔

امریکیوں کے ''کوہ قامت'' اور ''جناتی'' جنگی بیڑے مشرق وسطیٰ اور اس کے قرب وجوار میں واقع سمندروں میں عشروں سے اسی لئے دندناتے پھر رہے ہیں کہ امریکی مفادات کے کمبل کے اُلٹے رخ جنم لینے والے ''حرام کاری کے شہکار اس لاڈلے بچے'' کو کوئی ہاتھ گزند نہ پہنچاوے۔ ان کا بس نہیں چلتا وگرنہ صلیبی جنگی جنونی بش کی نازی ڈاکٹرائن تو بین السطور اسی پیغام کو عام کر رہی ہے کہ افغانستان اور عراق پر قبضے کے بعد جس قدر جلد ممکن ہو شام، لیبیا، سوڈان، ایران اور پاکستان کو بھی امریکی نوآبادی بنا دیا جائے۔ یہ الگ بات کہ مصر، اردن، کرغیزستان، تاجکستان اور پاکستان کی رولنگ کلاس نے ان ممالک کو 1991ء ہی سے امریکا کی رضا کارانہ غیر اعلانیہ نوآبادیاں بنا کر رکھ دیا ہے۔ امریکا کے ''کوہ قامت'' اور ''جنگی بیڑے خلیج فارس اور بحیرہ عرب میں سیر سپاٹے کیلئے نہیں گھوم رہے۔ ان کا آخری ہدف راتوں رات وسط ایشیا، مشرقِ وسطیٰ اور پاکستان کے بلوچستان میں موجود معدنیاتی دولت کے دریاؤں اور تیل کے سمندروں کو روندنا ہے۔ بیش قیمت معدنیاتی ذخائر کے ان سبک رو دریاؤں اور تیل کے تلاطم خیز سمندروں کی جانب ان کا سفر ''برق رفتاری'' سے جاری ہے۔

عالم اسلام کے ناقابل تسخیر ایٹمی قلعے کی حیثیت سے منفرد پہچان رکھنے والا یہ ملک امریکی سامراج، مغربی استعمار اور ملٹی نیشنل کمپنیوں کے

مخصوص مفادات کی چراگاہ بن چکا ہے۔ بیرونی دنیا اسے امریکا و مغرب کی چراگاہ سمجھتی ہے جبکہ عام پاکستانی کے نزدیک یہ امریکی و مغربی سفاک ایجنسیوں کے بھیڑیا صفت اور درندہ خصلت کارندوں کی شکارگاہ ہے۔ قومی خودمختاری، داخلی اقتدار اعلیٰ آزاد خارجہ پالیسی، آزادی اور کشمیر سے تو ہم کب کے دستبردار ہو چکے ہیں۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ ایٹمی صلاحیت کا بھاری پتھر ہم کب تک چومتے چاٹتے رہیں گے۔ تبدیل شدہ دنیا میں ''تبدیل شدہ پاکستان'' کے یکدم ''تبدیل شدہ حالات'' نے مملکت و معاشرہ کا نقشہ اور حلیہ ہی بدل اور بگاڑ کر رکھ دیا ہے۔ جب کوئی مملکت نظریاتی تشخص کھو دیتی ہے تو اس کا معنوی وجود برقرار نہیں رہتا۔ معنوی وجود کی ریزہ کاری اور نظریاتی سرحدوں کے انہدام کے بعد کسی ریاست کی ظاہری شکل اور جغرافیائی وجود کا برقرار رہنا ناممکن ہو جاتا ہے۔ ''پوسٹ نائن الیون'' ریاست پاکستان کا عالمی تشخص محبِ وطن پاکستانیوں کیلئے انتہائی تکلیف دہ اور اذیت رساں ہے۔ ہم نے امریکیوں کے عشق میں اپنا سب کچھ داؤ پر لگا دیا اور امریکیوں نے ہماری ان قربانیوں کو اتنی اہمیت بھی نہ دی جتنا ایک وڈیرہ اپنے حقے کی چلم میں جل بجھ کر راکھ ہو جانے والے اپلے...... یا...... صبح کے وقت ایک کسبی شبانہ بزم طرب کی بساط پر مرجھائے گجرے کے زرد پھولوں کو دیتی ہے۔ 11 ستمبر کے بعد تبدیل شدہ دنیا میں ''تبدیل شدہ پاکستان'' کے ''تبدیل شدہ تشخص'' اور ''تبدیل شدہ حالات'' نے داخلی فضا اور خارجی ماحول کو یکسر تبدیل کر دیا ہے...... ''دیکھتے ہی دیکھتے ادھر سے اُدھر پھر گیا رخ ہوا کا''...... کیا قیامت ہے کہ گیارہ ستمبر 2001ء کو جب ورلڈ ٹریڈ سنٹر گرا تو اس کے ملبے کے نیچے جہاں دیگر چیزیں دفن ہوئیں وہاں ان گنت پاکستانی سیاست کاروں کے امیج بھی گرد پوش ہو گئے......

ڈھونڈ انہیں چراغ رخ زیبا لے کر......

دنیا جانتی ہے کہ نیو ورلڈ آرڈر کے یہ پرچم بردار اور امریکیت کے یہ علمبردار تنگرانِ قدیم ہیں۔ یہ ازلی، اصلی اور نسلی غارت گر ہیں۔ ان الٹرا ماڈ خونخوار درندوں کے ''خونیں کارنامے'' ان کے نزدیک ان کی خوں رنگ تاریخ کے شہابی ماتھے کا جھومر ہیں...... ستم ظریفی تو یہ ہے کہ ''غارتگرانِ قدیم'' نے اپنی پیشانیوں پر ''معمارانِ تہذیب جدید'' کے لیبل چسپاں کر رکھے ہیں۔

کھلا گر بازی یہ دھوکہ ہیں دیتے ہے

یہ معمارانِ تہذیب جدید معلوم شدہ دنیا کے چپے چپے پر اپنی بالادستی کی مہریں یوں ثبت کر رہے ہیں جیسے بھیڑیا اپنے شکار کے وجود پر اپنے پنجوں کے نشان چھوڑ جاتا ہے۔ کیا کمال فنکاری ہے کہ یہ یورینیم، پلوٹونیم، ایٹم، ہائیڈروجن بائیولوجیکل، کیمیکل، بیکٹیریل بموں کے سنگ و خشت سے جہانِ نو آباد کر رہے ہیں۔ یہ آدم کے بیٹوں اور حوا کی بیٹیوں کو ''بموں کی ماؤں'' اور ''میزائلوں کے باپوں'' کا چارہ بنا رہے ہیں۔ یہ مہلک ترین جراثیم پالنے کا منصوبہ بنا چکے ہیں۔ وہ ایسے مہلک ترین جراثیم پال رہے ہیں جو آن واحد اور چشم زدن میں کرۂ ارض سے انسانی، حیوانی اور نباتاتی جانداروں کو ختم کر سکتے ہیں۔ 2001ء میں انسانیت کے ان محافظوں نے مہلک ترین امراض پھیلانے کے لئے بیکٹیریا، وائرس اور پیتھو جنز رکھنے کے لئے ایک انوکھا بینک قائم کیا۔ ایک رپورٹ کے مطابق ''اس بینک کی عمارت پر گزشتہ پانچ سال سے کام جاری تھا۔ واشنگٹن کے نواح میں قائم ہونے والے اس بینک کو National Bio-Defencearid and Counter Measure (NBACC) کا نام دیا گیا ہے۔ اس بینک میں نئی نئی بیماریوں کے مصنوعی جرثومے (Genetically Altered) بھی رکھے جا رہے ہیں جن پر دنیا میں

موجود مہلک ترین زہر کا بھی اثر نہیں ہوتا۔ ان کے علاوہ یہاں زہر آلود Pathogens بھی محفوظ کئے جارہے ہیں یہ وہ جرثومے ہیں جو قدرتی ماحول میں خود بخود افزائش کرتے ہیں اور انہیں خطرناک زہریلے ہتھیار کے طور پر دشمن کے خلاف استعمال کیا جاسکتا ہے۔ ان جرثوموں کو دشمن کے خلاف استعمال کرنے کے لئے فضا میں تجربات کئے جارہے ہیں بلکہ بعض ممالک کا خیال ہے کہ انتھراکس، برڈ فلو اور ایسی نوعیت کی قدیم بیماریوں کے عہد حاضر میں اچانک پھوٹ پڑنے میں بھی امریکی ہاتھ ہے اور وہ اپنے ان حیاتیاتی ہتھیاروں پر تحقیق کے لئے دیگر ممالک میں تجربات کررہا ہے۔ اس جرثومیائی بینک کا رقبہ ایک لاکھ 60 ہزار مربع فٹ اور اس کی تعمیر پر 12 کروڑ 80 لاکھ ڈالر خرچ کئے جارہے ہیں اس منصوبے کے تحت امریکی ماہرین کو ایک سو 30 شہروں میں تربیت بھی دی جارہی ہے۔ ب امریکا کے خلاف کسی بھی ملک کی طرف سے خطرے سے نمٹنے کے لئے حیاتیاتی ہتھیار (Microbes) تیار کئے جارہے ہیں۔ یہ حیاتیاتی ہتھیار اس قدر مہلک ہیں کہ آناً فاناً انسانوں کی لاکھوں آبادیوں کو صفحہ ہستی سے مٹاسکتے ہیں۔ ان کے وائرس کو جہاز کے ذریعے فضا میں ایک مخصوص طریقے سے پھینکنے کے بعد خود بخود پوری فضا زہر آلود ہوجاتی ہے اور جونہی یہ وائرس انسانی جسم میں داخل ہوتے ہیں پہلے یہ اعصابی نظام اور پھر دوران خون کا نظام تباہ کرکے لمحوں میں انسان کی جان لے لیتے ہیں۔ امریکی جرثومی بینک میں ایک اور نوعیت کا جرثومہ بھی شامل ہے اسے ٹری میٹوڈ (Trematode) یا فلیٹ ورم بھی کہتے ہیں، یہ عموماً پھلوں میں منتقل ہوکر ایک منٹ میں 150 بار افزائش کا عمل مکمل کرتا ہے۔ یہ اتنا خوفناک وائرس ہوتا ہے کہ رائی کھیت کی طرح نایاب پرندوں کا بھی صفایا کردیتا ہے اور انسانی وجود میں داخل ہوجائے تو کینسر کا سبب بنتا ہے۔ سائنس دان اس کا رنگ سبز بتاتے ہیں۔ یہ جرثومہ انسانی آنتوں میں غذا ہضم کرنے والے خلیات کو کھا جاتا ہے۔

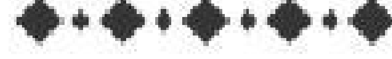
میری لینڈ یونیورسٹی کے استاد ڈاکٹر مارٹن لیٹن برگ نے اس منصوبے کی مخالفت کرتے ہوئے کہا کہ ''جب آپ اتنے بڑے پیمانے پر جراثیم تیار کررہے ہیں تو خود اپنی موت کے پروانے پر گویا دستخط کررہے ہوتے ہیں'' چونکہ اس امریکی منصوبے میں انسانی، حیوانی اور نباتاتی جرثوموں کی افزائش بھی شامل ہے مگر کیا امریکا سمجھتا ہے کہ وہ اس قسم کے ہتھیار تیار کرکے دنیا کو فتح کرے گا؟ قدرت کا یہ اصول بھی سامنے رہے کہ دوسروں کے لئے گڑھا کھودنے والے ہمیشہ اس میں گرتے رہے ہیں، جس جگہ یہ سینٹر بن رہا ہے کیا یہ بعید نہیں کہ زمین بھی اس جگہ سے پھٹ جائے، سینٹر زمیں بوس ہو اور یہ مہلک جراثیم تجربہ گاہوں اور چوہوں کی قید سے آزاد ہوکر امریکی شہروں میں پھیل جائیں۔ اس خوفناک وقت کے بارے میں کم از کم امریکی قیادت کو سوچنا چاہیے۔

اکیسویں صدی کے ان معمارانِ جدید کا عزم صمیم، ہر باحمیت اور خوددار ملک کا ''تورا بورا بنانا'' اور ہر باغیرت اور زندہ قوم کا ''تکریت کرنا'' ہے۔ ان کا خیال ہے کہ جب تک وہ دنیا کے اکثر خوددار، باوقار اور عزت دار اقوام کی بذریعہ کارپٹ بمبنگ ''افغانستان کرنے'' میں کامیاب نہیں ہو جاتے، دنیا کا نقشہ اور انسانی تاریخ انہیں ''دعوت مبارزت'' دیتے رہیں گے۔

سامراجی دیوہر ناتواں ملک کو تر نوالہ سمجھنا اپنا پیدائشی حق اور اسے نگلنا صوابدیدی اختیار گردانتا ہے۔ طلوع تاریخ سے قبل کی دیومالائی سمندری بلائیں ''نرم مخلوقات'' کو اس بیدردی سے کہاں بھنبھوڑتی ہوں گی، جس بے دردی سے یہ ''اکلوتی استعماری بلا'' خشک و تر کو ہڑپ کرتی چلی جارہی

ہے۔ سامراجی ڈریکولے کی ''غارت گریوں کی بیاض'' اور ''چیرہ دستیوں کا دیوان'' شہر شہر شہرہ پا رہا ہے۔ سرائیوو، گروزنی، ہلمند، بغداد، غزہ، سرینگر، وزیرستان اور بیروت ہر کہیں امریکیت کا بول بالا ہے۔ امریکیت ...... نازیت، سفاکیت، بہیمیت، فسطائیت، تاتاریت اور چنگیزیت کا جدید ترین ایڈیشن ہے۔

بشکریہ (حافظ شفیق الرحمٰن)



امریکی صدور سچ نہیں بولتے...

1846ء کی بات ہے امریکی صدر پولک نے کانگریس سے خطاب کرتے ہوئے ایوان سے میکسیکو پر حملے کی اجازت طلب کی تھی۔ وجہ یہ بیان کی گئی کہ میکسیکو نے نہتے امریکیوں کا خون بہایا ہے جس کے لئے اس ملک کو ''سبق'' سکھانا ضروری ہے۔ بعد میں پتہ چلا کہ صدر پولک کو امریکیوں کے خون سے نہیں بلکہ میکسیکو کی زمین سے دلچسپی تھی چنانچہ میکسیکو کو سبق سکھانے کی آڑ میں امریکہ نے میکسیکو پر قبضہ کرلیا۔

پولک کی روایت کو نبھاتے ہوئے 1898ء میں امریکی صدر میک کینلی نے کیوبا پر فوج کشی کی اور بہانہ بنایا کہ امریکی افواج کیوبا کو ہسپانوی تسلط سے آزادی دلانا چاہتی تھی۔ صورت حال کی حقیقت کا اندازہ اس وقت ہوا جب امریکی افواج کیوبا میں اتریں اور کیوبا کی اقتصادیات پر پنجے گاڑ لئے۔ دراصل امریکہ چاہتا تھا کہ ہسپانوی (Spanish) حکومت کی بجائے کیوبا پر امریکی دباؤ قائم ہو۔ کیوبا کی معاشی خودمختاری ختم کرنے کیلئے امریکی کمپنیوں نے زبردست حملہ کیا۔ انہوں نے کیوبا کی اقتصادیات کو اپنے قبضے میں لے لیا اور اس ملک کو معاشی غلامی میں جکڑ لیا۔

اسی دور میں امریکہ نے فلپائن پر بھی چڑھائی کی۔ مقصد فلپائینیوں کو ''مہذب'' بنانا تھا لیکن حقیقت یہ تھی کہ امریکہ چاہتا تھا کہ وہ فلپائن میں اپنے پسندیدہ علاقوں پر کنٹرول حاصل کرے۔ اس مقصد کے لئے وہ ہزار رہا فلپائینیوں کے قتل عام سے بھی ہچکچاہٹ محسوس نہ کرتا تھا۔

امریکی تاریخ میں ایسی ایک دو نہیں کئی مثالیں موجود ہیں۔ حالیہ برسوں میں امریکی صدر جارج ڈبلیو بش نے افغانستان اور بعد ازاں عراق کے حوالے سے جس قدر ڈھٹائی سے جھوٹ بولے ہیں پوری دنیا اس کی گواہ ہے۔ افغانستان میں وسیع تباہی پھیلانے والے ہتھیار کی تلاش اور نائن الیون کے مبینہ ذمہ داروں کو سزا دینے کے بہانے امریکی اور اس کے اتحادی افواج نے افغانستان پر لشکر کشی کی۔ اس دوران انہیں ''وسیع تباہی پھیلانے والے'' ہتھیار تو درکنار ان ہتھیاروں کی کوئی تصویر تک نہ ملی۔ اگر ان کے پاس اس قسم کا مہلک اسلحہ ہوتا تو افغان یوں نہتے لقمہ اجل اور امریکی ظلم وستم کا نشانہ نہ بنتے۔ رہا مسئلہ نائن الیون کے ''ذمہ داروں'' کی تلاش کا تو امریکہ ابھی تک یہ ثابت ہی نہیں کرسکا کہ اس کارروائی کا تعلق کس طرح مسلمانوں، افغان باشندوں یا ان کے غیر ملکی مہمانوں سے ہے۔ بش انتظامیہ نے اس معاملے میں صاف صاف جھوٹ بولا جس کا اظہار پوری مہذب دنیا کررہی ہے۔

بش انتظامیہ نے عراق کے معاملے پر بھی اسی قسم کے جھوٹ کا سہارا لیا۔ عراق میں امریکی افواج بھیجنے کا مقصد عراقی عوام کو جمہوریت، انصاف

اور امن وامان کی فراہمی تھا۔ لیکن دنیا جانتی ہے کہ اصل مقصد صرف عراق کی معدنی دولت پر قبضہ کرنا تھا۔ اب جبکہ افغانستان اور عراق کے معاملات پر امریکی پالیسیاں کھل کر سامنے آگئی ہیں بش انتظامیہ ابھی تک اپنے پرانے موقف پر قائم ہے اور دنیا سے بار بار یہی کہا جا رہا ہے کہ وہ ان ملکوں میں کسی امریکی مفاد کے تحت نہیں بلکہ ان ممالک کے عوام کی ''ہمدردی'' میں مداخلت کر رہا ہے یہ الگ بات ہے کہ لوگ صدر بش کی بات پر یقین کرنے کو تیار نہیں۔ سی این این' یو ایس ٹوڈے اور گیلپ پول وغیرہ کے سروے سے یہ بات سامنے آئی ہے کہ عراق میں مداخلت کے بعد صدر بش کی مقبولیت دنیا بھر میں مزید کم ہوئی ہے۔ پہلے 60 فیصد امریکیوں کا خیال تھا کہ صدر بش جو کہہ رہے ہیں وہ درست ہے تاہم اب ان کی بات پر یقین کرنے والوں کی تعداد گھٹ کر 38 فیصد رہ گئی ہے۔

امریکی عوام ہر بار اپنے صدر کے جھوٹ کے دام میں کیوں پھنس جاتی ہے؟ ہر بار ان کے صدور انہیں بے وقوف بنانے میں کیونکر کامیاب ہو جاتے ہیں؟ ان سوالوں کا جواب ایک امریکی صحافی ہاورڈ زن (Haward zinn) نے تلاش کیا ہے۔ ایک انگریزی جریدے میں انہوں نے لکھا ہے کہ عراق پر حملے کے تیسرے سال بھی کوئی شخص یہ بات سمجھنے سے قاصر ہے کہ امریکی انتظامیہ نے اپنے عوام کو اتنی آسانی سے بے وقوف کیسے بنالیا کہ عوام کو جنگ کے حق میں تیار کرنے میں کامیاب رہی۔ ہاورڈ کا کہنا ہے کہ اس کی دو وجوہات سامنے آئی ہیں۔ اول امریکی قوم کی تاریخ سے ناواقفیت دوئم امریکی سرحدوں سے باہر نکل کر کچھ سوچتے ہی نہیں۔

امریکی قوم کی تاریخ سے لاتعلقی کا ہی نتیجہ ہے کہ امریکی صدور ہر بار اپنی قوم کو بے وقوف بنا کر ان سے اپنی مرضی کے نتائج حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ ہاورڈ نے ایسی چند مثالیں بھی دی ہیں جن سے موصوف کے خیال کی صداقت ہو جاتی ہے۔ صدر ولسن کے حوالے سے ہاورڈ بتاتا ہے کہ سابق امریکی صدر ولسن نے پہلی عالمگیر جنگ میں یہ کہہ کر شمولیت اختیار کی تھی کہ امریکہ کا اس جنگ میں شامل ہونے کا مقصد ''دنیا کو جمہوریت کے لئے محفوظ بنانا ہے۔'' بقول مصنف صدر ولسن شاید جمہوریت کو دنیا میں مضبوط بنانے کے لئے نہیں بلکہ امریکہ کی ابھرتی ہوئی طاقت کے لئے دنیا میں جگہ بنانے کیلئے جنگ میں کود پڑے تھے۔ صدر ٹرومین نے اس وقت جھوٹ بولا جب امریکہ نے جاپان کے شہر ہیروشیما پر ایٹم بم گرائے۔ اس وقت صدر ٹرومین نے امریکی عوام سے کہا تھا کہ بم ''ملٹری ٹارگٹ'' پر گرایا گیا ہے۔ حالانکہ ہیروشیما اور ناگاساکی میں آبادیوں پر ایٹم بم گرائے گئے تھے اس بات کا اندازہ امریکیوں کو بہت بعد میں ہوا۔ اس وقت تک پوری دنیا میں امریکی ساکھ تباہ ہو چکی تھی۔ ویت نام کے معاملے پر کیا ہوا تھا؟ صدر کینیڈی' صدر جانسن اور صدر نکسن نے اپنے اپنے ادوار میں غلط اور متضاد بیانوں سے کام لیا تھا۔ امریکی عوام سے کہا یہ جا رہا تھا کہ امریکی اقدامات دراصل جنوبی ویت نام کو کمیونزم سے بچانے کیلئے کئے جا رہے ہیں حالانکہ حقیقت یہ تھی کہ امریکہ کا مقصد اس علاقے پر اپنا تسلط جمانا تھا۔

سابق صدر رونالڈ ریگن نے گریناڈا کے مسئلے پر اپنی قوم سے غلط بیانی کی۔ انہوں نے گریناڈا کو امریکی سلامتی کے لئے ''خطرہ'' قرار دے کر اس کے خلاف کارروائی کی راہ ہموار کی تھی حالانکہ پس پردہ اس میں امریکی مفادات پوشیدہ تھے۔

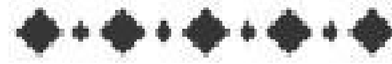
سابق صدر بش (سینئر) نے عراق کے مسئلہ پر جھوٹ کا سہارا لیا۔ پانامہ میں امریکی کارروائیوں کے نتیجے میں ہزاروں بے گناہ شہریوں کی

جانیں ضائع ہوگئیں۔1991ء میں انہوں نے کویت کی حفاظت کا بہانہ بنا کر تیل کی دولت سے مالا مال ملک عراق پر حملہ کیا اور اقتصادی مفادات حاصل کیے۔اس حملے کے نتیجے میں امریکہ کو مشرق وسطیٰ میں اپنے پنجے گاڑنے کا موقع ملا تھا۔

ہمیں امریکہ کی وہ تاریخ بھی نہیں بھولنی چاہئے جو ابھی بہت پرانی نہیں ہوئی۔یہ وہی تاریخ ہے جس میں غلامی، نسل پرستی اور نسلی امتیاز کا دور دورہ تھا۔ہیروشیما، ناگاساکی کے واقعات بھی ہمارے سامنے ہیں جن کے تصور سے ہی ہمیں شرم آتی ہے۔ہم ان واقعات پر فخر محسوس نہیں کرسکتے۔

مصنف کہتا ہے کہ ہمارے حکمران ان باتوں کو شاید قابل فخر گردانتے ہوئے عوام میں جذبہ تفاخر کو ابھار رہے ہیں۔امریکی عوام کو یہ سکھایا جاتا ہے کہ ان کی ''اخلاقی برتری'' انہیں دنیا پر حکومت کرنے کی اجازت دیتی ہے۔وہ ری پبلکن ہوں یا ڈیموکریٹس دونوں جماعتیں قوم میں اس نظریئے کو فروغ دیتی ہیں۔تاہم خود کو کن بنیادوں پر ''برتر'' تصور کرتے ہیں؟

آخر میں مصنف کہتا ہے کہ دنیا میں امن وانصاف کے مشترکہ نصب العین کے حصول کے لئے ضروری ہے کہ امریکی قوم اپنا جائزہ حقیقت پسندی سے لے۔اپنے بارے میں کسی خوش فہم فلسفے کو ذہنوں میں جاگزین کرنے کی بجائے اور اپنے متعلق ایک الگ اور پسندیدہ تاریخ مرتب کرنے کی جگہ اپنا جائزہ اور تجزیہ حقیقت کی آنکھ سے کیا جائے۔اگر ایسا نہ ہوا تو آنے والے امریکی صدور بھی ماضی کی طرح دروغ گوئی سے کام لیتے ہوئے امریکی عوام کو کسی نئی چال میں پھنسا کر کسی نئی جنگ میں ملوث کرلیں گے۔



فرعون اور بش میں مماثلت

رسول اکرم ﷺ نے ایک حدیث مبارکہ میں مہدی کے بارے میں بتایا کہ وہ آخری زمانہ میں آئے گا اس کا نام رسول اکرم ﷺ کے نام پر ہوگا اور اخلاق میں بھی وہ رسول اللہ ﷺ سے مشابہت رکھتا ہوگا، ہمیں یہ معلوم ہوا کہ پیغمبروں اور صالحین کے افعال ان کے ناموں میں پوشیدہ ہوتے ہیں یا ان کے نام ان کے افعال وصفات کو منعکس کرتے ہیں۔

مثال کے طور پر ابراہیمؑ کا نام جو ان کے افعال وصفات اور اللہ کے ہاں ان کا جو درجہ ہے اسے نقش کرتا ہے۔اس علم کے ماہرین یہ جانتے ہیں کہ ابراہیمؑ کے الفاظ کے تین ٹکڑوں سے مرتب ہے۔اب، راب، ہام، اب سے مراد باپ، راب، سے مراد امام، ہام سے مراد عوام یا بہت زیادہ لوگ ہیں۔ان سب معانی کو جمع کر کے نام کا مطلب یہ بنتا ہے: ''اب امام للناس'' لوگوں کے امام کا باپ اور بالکل یہی معنی سورہ بقرۃ میں موجود ہے۔ ''(رب نے ابراہیم سے کہا) میں تجھے لوگوں کا امام (پیشوا) بنانے والا ہوں۔'' (البقرہ:124) اس طرح بہت سی مثالیں موجود ہیں لیکن یہاں پر ان کا ذکر کرنا بہت مشکل ہے۔

سو جب رسول اکرم ﷺ نے مہدی کا نام اور اس کی صفت بیان کر دی جو سب سے آخری زمانہ میں آئے گا۔پھر ہمارے پاس دوبارہ فرعون آ جائے تو کیا یہ اللہ کے عدل اور دستور میں سے نہیں کہ اس فرعون کیلئے ایک ایسا شخص نکلے جو بغیر کسی تعظیم وتقدیس یا نبوت کے درجہ حاصل کرنے کے، موسیٰ کی طرح کا ہوتا کہ وہ فرعون کے ساتھ وہی کچھ کرے جو موسیٰ نے اس کے ساتھ کیا تھا۔اس میں کوئی مانع بات نہیں جیسا کہ احادیث نبوی میں مروی ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے علیؓ سے فرمایا: ''کیا تو اس چیز سے خوش نہیں کہ تیرا مقام میرے پاس ویسا ہی ہو جیسا ہارون کا موسیٰ کے پاس تھا۔''

سو امریکی فرعون کے لئے کون کھڑا ہوگا جیسا کہ فرعون مصر کے موسیٰ کھڑا ہوا تھا۔

احادیث نے موسیٰ علیہ السلام کی جو صفات بیان کی وہ یہ ہے: لمبا قد، سیاہی مائل چپٹی ناک، گویا کہ وہ قبیلہ شنوءۃ میں سے ہے (جزیرہ عرب کے جنوب میں موجود ایک قبیلہ کا نام ہے) اور لاٹھی کے سہارے وہ چلتے تھے۔

ہمارے سامنے ایک شخص ہے جو امریکہ سے لڑ رہا ہے۔اس کا بھی قد لمبا ہے۔196 سنٹی میٹر۔لاٹھی کے سہارے وہ چلتا ہے۔سیاہی مائل چپٹی ناک والا اور وہ بھی قبیلہ شنوءۃ میں سے ہے،اس کے نام میں سے تین حروف موسیٰ کے نام میں سے ہیں،قرآن کریم کے رسم الخط کے مطابق دونوں

(موسیٰ بن عمران، اسامہ بن لادن کے ناموں کے حروف گیارہ ہیں)۔

موسیٰ کا معنی کیا ہے؟ جب ہم یہ جان لیں جیسا کہ سورۂ قصص نے صفت بیان کی کہ طاقتور، تیزی سے حرکت اور کام کرنے والا اور تیزی سے حملہ آور ہوتا ہے، تو اس جملہ کا معنی کیا ہوگا؟ جب ہم یہ جان لیں کہ "اسامہ" کا معنی "شیر" ہے۔

ہارون کا کردار کون ادا کرے گا؟

ہم یہ پہلے ذکر کر چکے ہیں کہ ہم مثال کے بارے میں بات کر رہے ہیں جو ایک بار واقع ہو کر گزر چکی ہے اور دوسری مرتبہ واقع ہو رہی ہے۔ اسی طرح ایسے دستور کے حوالہ سے بات کر رہے ہیں جس میں نہ کبھی تبدیلی آسکتی ہے اور نہ وہ پھر اجاگر ہو سکتا ہے۔

سو اگر ہم سورۂ طٰہٰ کی آیات کا مطالعہ کریں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ موسیٰ نے اللہ تعالیٰ سے سوال کیا تھا ان کیلئے ایک وزیر بنایا جائے جیسا کہ ہامان فرعون کا وزیر تھا تاکہ اس سے ان کی قوت مضبوط ہو اور وہ موسیٰ کے ساتھ شریک ہو۔

سو لندن سے چھپنے والا روزنامہ شرق الاوسط کے مطابق گیارہ ستمبر سے پہلے افغانستان میں ایک محفل منعقد ہوئی جس میں ایمن الظواہری کو اسامہ بن لادن کا وزیر بننے کا اعلان کیا گیا۔ ایمن الظواہری کے بارے میں مصری ذرائع ابلاغ نے بتایا کہ یہ شخص مصر کی جیل میں مجاہدین قیدیوں کا رسمی ترجمان تھا اور یہ بالکل اسی صفت کی طرح ہے جو موسیٰ نے ہارون کی بیان کی تھی "اور ہارون جو میرا بھائی ہے اس کی زبان مجھ سے زیادہ فصیح ہے۔" (القصص:34)

کوئی شخص اس چیز پر تعجب میں نہ رہے کہ ہم نے عوام میں سے ایک شخص کو نبی سے مشابہت دی کیونکہ جب اللہ رب العزت اپنے نور کو طاق اور چراغ سے مشابہت دے سکتا ہے تو پھر یہ کیوں نہیں ہو سکتا؟

آخری لمحات جس دن اللہ تعالیٰ امریکہ کو بڑی سخت پکڑ میں لیں گے۔

سورۂ بقرہ کی آیت مستقبل میں پیش آنے والی تمام احادیث کو مختصر کر کے اللہ تعالیٰ کے کلمات میں یوں بیان کر رہی ہے "ہم نے تمہیں نجات دی اور فرعون کی قوم کو غرق کر دیا اور تم دیکھ ہی تو رہے ہو۔" (البقرۃ:50)

اس آیت کریمہ سے ہمیں معلوم ہوا کہ اسامہ اور مومنین کی جماعت اللہ کے فضل سے نجات پا لیں گے، تمام امریکی لشکر بمع فوج اور قائدین غرق ہو جائیں گے اور امریکہ کو کوٹ کوٹ کر پست کر دیا جائے گا، اللہ اعلم و احکم، سو تم ہرگز اللہ تعالیٰ کے دستور کو بدلتا ہوا نہ پاؤ گے اور نہ ہی اللہ تعالیٰ کے دستور کو پھرتا ہوا پاؤ گے۔

"اور تم دیکھ ہی تو رہے تھے۔" (البقرۃ:50) سکرینوں پر لوگوں کے چہروں پر، کہ خبر بہت عظیم خوشخبری ہے۔ اس دن مومنین اللہ کی مدد پر خوشی منائیں گے۔" (روم:5)

"تو تم نے (فرعونیوں کو) باغوں اور چشموں سے نکال دیا اور خزانوں اور نفیس مکانات سے بھی۔" (الشعراء:57-58)

ایک اور مقام پر فرمایا "اور آرام کی چیزوں سے جن میں عیش کیا کرتے تھے اور ایسا ہی ہوا اور ہم نے ان چیزوں کا وارث ایک دوسری قوم کو کر

دیا پھران پر نہ آسمان اور زمین روئے اور نہ وہ مہلت پانے والے تھے۔" (الدخان 27 - 29)

کیا یہ علم غیب ہے؟

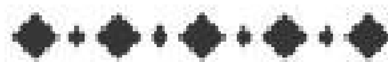
بعض لوگ جلدی میں آ کر یہ کہہ دیں گے کہ یہ علم غیب میں سے ہے تو ہم یہ کہیں گے کہ ہر مسلمان قیامت کی نشانیوں پر ایمان رکھتا ہے اور ان کے متعلق تفصیل سے بیان کرتا ہے جو آنے والے کل کے بارے میں علم ہے، قرآن کریم جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں کہ پہلے لوگوں کیلئے بھی کتاب ہے اور اگلوں کیلئے بھی اس وقت تک جب تک یہ دنیا قائم ہے جیسا کہ مسلمانوں کے آئمہ سے مروی ہے کہ اس قرآن حکیم میں تم سے پہلوں کی خبر ہے۔ تمہارے درمیان معاملات وغیرہ کے بارے میں بھی اس میں حکم ہے اور تمہارے بعد آنے والوں کے بارے میں بھی خبر موجود ہے، بالکل یہی بات ہم کہتے ہیں کہ یہ علم غیب نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی آیات کریمہ میں غور وفکر کرنے کے بعد جو نتیجہ نکلا وہ اجتہاد پر مبنی ہے، اس محنت اور غور وفکر پر ہم اللہ کی حمد بیان کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ سے اجر وثواب حاصل کرنے کی امید رکھتے ہیں جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ قرآن مقدس پر غور وفکر کرنے والے کو اجر ملے گا" اور ہم نے قرآن کو سمجھنے کیلئے آسان کر دیا تو کوئی ہے کہ سوچے سمجھے؟" (القمر 17)

یہ کتاب اللہ تعالیٰ کے دستور کو پڑھنے کیلئے بھی لکھی گئی ہے جو اس نے اپنی کائنات اور بندوں کیلئے بنایا جن میں نہ کبھی تبدیلی آسکتی ہے اور نہ وہ کبھی پھر سکتے ہیں۔ اسی طرح موسیٰ کا قول جو انہوں نے فرعون سے کہا تھا" اے فرعون! ہم تو سمجھتے ہیں کہ تو ہلاک ہو کے رہے گا۔" (بنی اسرائیل 102) ہم بھی موسیٰ کے قول کی طرح کہتے ہیں جو انہوں نے ہم سے پہلے کہہ دیا، سو ہم سمجھتے ہیں کہ اللہ رب العزت امریکہ فرعون کو ہلاک کرنے والا ہے اس کے علاوہ امریکہ کا کوئی انجام نہیں ہے۔ ہم اس طرح بھی کہتے ہیں کہ جس طرح ابو بکر صدیقؓ نے کہا تھا" یہ میری رائے ہے اگر یہ صحیح ثابت ہوگئی تو اللہ کی طرف سے ہے اور اگر یہ غلط ثابت ہوئی تو یہ میرے نفس اور شیطان کی طرف سے ہے، اللہ اور اس کے رسول دونوں اس سے بری ہیں۔ لیکن ہم امید رکھتے ہیں کہ جو یہ پڑھے وہ ضرور حکم اور صفت میں غور کرے، شاید ہم نے حق کو پا لیا ہو اور شاید اللہ ہمارا گمان سچا کر دے، پس پھر جس نے اس کو جھٹلایا تو وہ اسی شخص کی طرح ہے جس نے حق کو جھٹلایا۔"

چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: "کہو کہ بھلا دیکھو اگر یہ اللہ کی طرف سے ہو اور تم نے اس سے انکار کیا تو اس سے بڑھ کر گمراہ کون ہوگا جو (حق کی) پرلے درجے کی مخالفت میں ہو۔" (حم السجدۃ 52)

پس جو ہم نے کہا اگر وہ حق ہے تو اللہ تعالیٰ اس کا زیادہ مستحق ہے اور اگر باطل ہے تو ہم اس کے زیادہ مستحق ہیں۔

بشکریہ (شیخ صلاح الدین ابو عرفہ)



امریکا کے جہادی پادری

امریکا کے معروف ایونجلسٹ پادری پیٹ رابرٹسن نے ایک بیان میں کہا ہے کہ وینزویلا کے صدر ہوگوشاویز کو قتل کروادینا چاہیے تاکہ امریکا کو بیس ارب کی ایک اور جنگ نہ لڑنی پڑے۔ اب تو بہت سے امریکی تسلیم کرنے لگے ہیں کہ ان کے ملک میں بھی اسامہ بن لادن کی کمی نہیں ہے۔

پیٹ رابرٹسن اور پادری جیری فال ویل صلیبی جہادیوں کے سرغنہ ہیں در پردہ ان کا بش انتظامیہ پر ویسا ہی اثر ورسوخ ہے جیسا کہ اسامہ بن لادن کا طالبان پر تھا، ظاہر بات ہے کہ امریکا کی پر پیچ سیاست میں یہ تعلق افغانستان کی قبائلی سادگی کی طرح عیاں نہیں ہے لیکن بش جیتے ان کی ہی مدد سے ہیں اور اسی لئے ان کے صلیبی جہادی بیانات کی تردید نہیں کرتے۔

پیٹ رابرٹسن کے اس بیان سے یہ بھی واضح ہوجاتا ہے کہ امریکا کے جہادی اپنے معاشی اور نظریاتی مفادات کیلئے عیسائی پڑوسیوں پر بھی عراق کی طرح حملہ آور ہوسکتے ہیں بلکہ حقیقت یہ ہے کہ امریکی مداخلت کی بدترین مثالیں کیتھولک مذہب کے ماننے والے لاطینی امریکا میں ہی ملتے ہیں۔

اب بھی بش انتظامیہ شوروغوغا تو اسلامی دہشت گردی کے بارے میں مچارہی ہے لیکن اصل انقلابی ابال اس کے پچھواڑے لاطینی امریکہ میں اٹھ رہا ہے۔

وینزنہ صرف وینزویلا جیسے تیل سے مالا مال ملک کے صدر ہیوگوشاویز کیوبا کے فیڈرل کاسترو کے ساتھ دوستی بڑھارہے ہیں بلکہ اس براعظم کے سب سے بڑے ممالک برازیل اور ارجنٹینا میں بھی بائیں بازو کی طرف جھکاؤ والی حکومتیں قائم ہوچکی ہیں۔

امریکا کے پڑوسی ملک میکسیکو کے اگلے انتخابات میں بھی بائیں بازو کے صدر کے جیتنے کے امکانات واضح ہیں بولیویا، اکویڈور، پیرو اور کولمبیا جیسے چھوٹے ملکوں میں بھی عوامی ابھار عوام دوست حکومتوں کے قیام کا پیش خیمہ بن رہا ہے۔ امریکا کی پریشانی کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ نہ صرف اس کے مذہبی رہنما لاطینی امریکا کے رہنماؤں کو قتل کرنے کا پرچار کررہے ہیں بلکہ امریکی وزیر دفاع ڈونلڈ رمزفیلڈ بھی تھوڑے عرصے میں اس علاقے کے کئی چکر لگا چکے ہیں۔

لاطینی امریکا میں سیاسی تبدیلی کے روح رواں وینزویلا کے صدر ہیوگوشاویز ہیں جن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ عظیم ناول نگار گارشیا

مارکیز کے افسانوی کرداروں کی طرح عوامی ہیں آجکل وہ ٹی وی پر ہیلو پریذیڈنٹ، کے عنوان سے ایک لیٹ نائٹ ٹی وی شو کرتے ہیں اس شو کے عوامی رنگ کا اس بات سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ پچھلے دنوں انہوں نے اپنی بحریہ کے سربراہ کو اس شو پر بلایا اور ان سے والی بال کے کھیل پر گپ شپ کرتے ہوئے اپنے دوست کیوبا کے صدر کاسترو پر چوٹ کرتے ہوئے کہا کہ ان کی ٹیم وینزویلا سے بری طرح ہار جائے گی۔

پھر انہوں نے ان کسانوں کو ٹی وی پر بات چیت کیلئے بلالیا جن کو انہوں نے زرعی اصلاحات کے ذریعے امیروں سے زمینیں چھین کر دی ہیں۔

صدر ہیوگو شاویز اپنے عوامی انداز اور عوام دوست پروگراموں کی وجہ سے اتنے مقبول ہیں کہ وینزویلا کے حکمران طبقے اور امریکا مل کر بھی ان کو اکھاڑ نہیں سکا ان کے خلاف مظاہرے بھی ناکام ہوئے اور ان کو نکالنے کی آئینی سازشیں بھی کسی کام نہ آئیں۔

پیٹ رابرٹسن کے بیان سے یہ بات بھی واضح ہوجاتی ہے کہ امریکی حکمران لاطینی امریکا کے عوامی ابھار سے خائف ہیں، امریکی وزیر دفاع دو سالوں میں چار مرتبہ اس علاقے میں جاچکے ہیں وہ وینزویلا اور کیوبا پر بولیویا کے انقلابیوں کی مدد کا الزام لگا چکے ہیں۔

یہ وہی بولیویا ہے جہاں ستر کی دہائی کے مشہور انقلابی چے گویرا کو قتل کیا گیا تھا بولیویا کے علاوہ اکویڈور پیرو اور کولمبیا میں بھی ویسے انقلاب جنم لے رہے ہیں جن کو دبانے کیلئے امریکا کو ستر کی دہائی میں بہت پاپڑ بیلنے پڑے تھے۔

اس وقت امریکا کیلئے سب سے بڑا درد سر وینزویلا ہے جہاں کے صدر ہیوگو شاویز اپنی طرز کا سوشلسٹ ماڈل اپنانے کی کوشش کررہے ہیں انہوں نے بہت سی زمینیں جاگیرداروں سے لے کر غریب کسانوں میں تقسیم کردی ہیں۔ وہ وینزویلا کی پٹرول کی کثیر آمدنی کو غریبوں کو سہولتیں فراہم کرنے کیلئے استعمال کررہے ہیں۔

انہوں نے کیوبا کے فیڈل کاسترو کے ساتھ قریبی اتحاد قائم کیا ہوا ہے وہ کیوبا سے عوام کی صحت کا نظام بہتر بنانے کیلئے ڈاکٹر منگوا رہے ہیں اور اس کے بدلے میں کیوبا کو سستے داموں پٹرول فراہم کررہے ہیں ظاہر بات ہے کہ امریکا کو یہ تو ہیوگو شاویز کا سوشلسٹ ماڈل پسند ہے اور نہ ہی کاسترو کے ساتھ دوستی۔

وینزویلا کی طرح برازیل اور ارجنٹینا جیسے بڑے ممالک میں بھی بائیں بازو کا معاشی پروگرام اپنانے والی پارٹیاں آچکی ہیں ان دونوں ملکوں کی حکومتیں ورلڈ بینک اور آئی ایم ایف کے پروگرام رد کرتے ہوئے قومی پالیسیاں بنارہی ہیں۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ ان ملکوں کی حالت پہلے سے بہتر ہورہی ہے یہ ممالک اپنے فوجی ڈکٹیٹروں کو بھی کنٹرول کرچکے ہیں اور وینزویلا اور کیوبا کے ساتھ تجارتی اور دوسرے تعلقات قائم کرنے سے گریزاں نہیں ہیں۔

لاطینی امریکا کے مختلف ممالک میں اپنی اپنی طرز کا انقلابی ابھار ہے اور ہر ملک میں اپنی طرز کی نظریاتی سمت ہے صدر ہیوگو شاویز یسوع مسیح کے اس پیغام کے داعی ہیں جس کے مطابق ایک سوئی کی نوک سے اونٹ تو گزر سکتا ہے لیکن امیر آدمی جنت میں داخل نہیں ہوسکتا۔

وہ عیسائیت کے اس دین آزادی کو پھیلا رہے ہیں جس کی لاطینی امریکا میں بنیاد پادری گوٹیرز نے رکھی تھی اس کے بانیوں کا دعویٰ تھا کہ

کیتھولک چرچ کسانوں پر جبر کیلئے استعمال ہوتا ہے اس لئے پوپ جان پال سے لے کر آج تک کیتھولک چرچ کے رہنما دین آزادی کی تنقید کا نشانہ بناتے آئے ہیں لیکن یہ پھر بھی کسی نہ کسی رنگ میں ظاہر ہوتا رہتا ہے۔

امریکا کی پریشانی یہ ہے کہ اس وقت جب وہ عراق اور افغانستان کی جنگوں میں الجھا ہوا ہے ایران اور شمالی کوریا کے جوہری پروگراموں کے مسئلے کا حل نکال نہیں پا رہا۔ اس کے گھر پر پچھواڑے میں انقلابی ابھار پنپ رہا ہے وہ نظریات جو ستر کی دہائی میں لاطینی امریکا میں انقلابیوں کی بنیاد بن رہے تھے واپس آ رہے ہیں۔

امریکا کو خوف ہے کہ ستر کی دہائی کے یہ نظریات دوسرے براعظموں تک پھیل سکتے اور ہیوگو شاویز نئے چے گویرا ثابت ہو سکتے ہیں اسی لئے جہادی پادری ان کو ختم کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔

رابرٹسن کی طرف سے اس بیان کے بعد وینزویلا اور امریکا کے درمیان سفارتی تنازع کھڑا ہو گیا ہے اور دونوں ممالک کے درمیان پہلے سے موجود کشیدگی کو مزید ہوا ملی ہے۔ پیٹ رابرٹسن نے اپنے پروگرام میں کہا تھا کہ امریکی خفیہ اداروں کے ایجنٹوں کو چاہیے کہ وہ وینزویلا کے صدر ہیوگو شاویز کو قتل کر دیں۔

اس بیان کے بعد واشنگٹن میں وینزویلا کے سفیر نے بش انتظامیہ سے اپنے صدر ہیوگو شاویز کے لئے اقوام متحدہ کے اجلاس میں شرکت کے دوران سخت حفاظتی انتظامات کا مطالبہ کیا ہے۔ پیٹ رابرٹسن امریکی صدارت کے لئے امیدوار بھی رہ چکے ہیں اور کسی تنازع کا موضوع بننا ان کے لئے نئی بات نہیں ہے۔

وینزویلا کے نائب صدر نے اپنے ردعمل میں کہا ہے کہ ایک طرف تو امریکا ''دہشت گردی کے خلاف جنگ'' کر رہا ہے اور دوسری طرف اس طرح کے ''دہشت گرد بیانات'' کی اجازت دیتا ہے۔ امریکا کے صدر جارج بش نے فوری طور پر اس موضوع پر اپنا ردعمل ظاہر نہیں کیا، لیکن وزارت خارجہ کے ایک ترجمان نے پیٹ رابرٹسن کے بیان کو ''نامناسب'' قرار دیا اور کہا کہ امریکا وینزویلا کے خلاف کارروائی کا ارادہ نہیں رکھتا۔

امریکا کے وزیر دفاع ڈونلڈ رمزفیلڈ کا کہنا ہے کہ اس طرح کسی کو قتل کرنا قانوناً غلط ہے۔

امریکا لاطینی امریکا کے ملک وینزویلا کے صدر کی طرف سے اپنے اثر و رسوخ میں اضافے کی کوششوں سے پریشان ہے۔ امریکا کو تشویش ہے کہ وینزویلا کے صدر ہیوگو شاویز سفارتی اعتبار سے تیزی سے اپنی ساکھ بڑھا رہے ہیں۔

شاویز نے متحدہ اینڈیز کا خواب دیکھا ہے جس میں تیل سے حاصل ہونے والی دولت غربت کے خاتمے کے لئے استعمال کی جائے گی۔ وینزویلا دنیا میں تیل پیدا کرنے والا پانچواں بڑا ملک ہے۔

گزشتہ برس وینزویلا میں ریفرنڈم میں داخلی مخالفین سے نمٹنے کے بعد شاویز اب اینڈیز کے علاقے میں اپنا پیغام پھیلا رہے ہیں۔ شاویز خطے میں اپنی ہم خیال تنظیموں کے ذریعے ایسا بالواسطہ طور پر کر رہے ہیں اور اینڈیز کے سماج پر براہ راست اثر و رسوخ کے لئے وہ بین الاقوامی ادارے استعمال کر رہے ہیں۔

اس ہفتے وینزویلا نے علاقے میں تیل کی ایک علاقائی کمپنی پیٹروانڈینا کے قیام کی تجویز پیش کی۔ شاویز غربت کے خاتمے کے لئے فنڈ بھی قائم کرنا چاہتے ہیں۔ شاویز چاہتے ہیں کہ وینزویلا میں رائج سکیم جس کے تحت کیوبا کے ڈاکٹر وہاں مفت علاج کرتے ہیں علاقے کے دوسرے ممالک میں بھی متعارف کروائی جانی چاہیے۔

امریکا آزاد تجارت کے نظریئے کے تحت معاہدوں کے ذریعے علاقے میں ترقی اور جمہوریت کا فروغ چاہتا ہے لیکن سب سے زیادہ امریکا اینڈیز کے پہاڑی سلسلے کے ممالک میں منشیات کا خاتمہ چاہتا ہے اور اسی لئے وہ ترقیاتی امداد کی بجائے فوجی امداد پر زور دیتا ہے۔

علاقے میں اثر ورسوخ کی اس جنگ میں کولمبیا کی حکومت امریکا کے سامنے جبکہ اکوڈور، بولیویا اور پیرو پر دونوں طرف سے دباؤ ہے۔

ایک اہم انٹرویو

ڈیوڈ ڈائیفسی طویل عرصے تک امریکہ کی ملٹری انٹیلی جنس میں اعلیٰ عہدیدار رہے ہیں۔ ریٹائرمنٹ کے بعد انہوں نے بین الاقوامی امدادی کاموں میں بزنس ایگزیکٹو کے طور پر کام کیا۔ انہیں امریکہ میں ایک کٹر اور قدامت پسند ری پبلیکن سمجھا جاتا رہا ہے لیکن اپنی شہرہ آفاق کتاب ''امریکی ہیروشیما'' میں انہوں نے جس طرح صدر بش اور ان کے پیش رو سابق امریکی حکمرانوں کی جارحیت اور ناانصافی پر مبنی پالیسیوں کو کڑی تنقید کا نشانہ بنایا اس کے بعد ان کی شناخت تبدیل ہوگئی ہے۔ ڈیوڈ ڈائیفسی نے اپنی کتاب میں ظلم، انتقام، جارحیت اور ناانصافی پر مبنی امریکی خارجہ پالیسی کو تباہ کن قرار دیا ہے۔ اور ساتھ ہی نشان دہی کی ہے کہ عشروں سے جاری اس امریکہ پالیسی نے دنیا کو ایٹمی جنگ کے دہانے پر لا کھڑا کیا ہے۔ انہوں نے اپنی کتاب میں تاریخ کے مختلف واقعات کے حوالے سے پوری تحقیق کے باوجود امریکہ کو عالمی امن کے لیے سب سے بڑا خطرہ قرار دیا ہے۔ ان دنوں ڈیوڈ ڈائیفسی کی کتاب دنیا بھر میں زیر بحث ہے حال ہی میں الجزیرہ نیٹ ورک نے اس کتاب کے حوالے سے ڈیوڈ ڈائیفسی کا تفصیلی انٹرویو کیا ہے جس کا ترجمہ دلچسپی کے لیے پیش خدمت ہے۔ یہ انٹرویو ایک امریکہ دانشور کی زبانی امریکہ کے اصل چہرے کو بے نقاب کرتا ہے اور اس بات کا شبہ بھی ہے کہ دنیا بھر میں جنگ وجدل کی تاریخ مرتب کرنے میں امریکہ کا کوئی ثانی نہیں۔

الجزیرہ......ایک وقت تھا جب آپ کٹر قدامت پسند ری پبلکن تھے وہ کون سی چیز تھی جس نے آپ کے خیالات اور نظریات کو بدل ڈالا؟

ڈائیفسی......یہ تبدیلی دراصل میرے جاننے کے عمل میں بہت زیادہ دلچسپی کی وجہ سے پیدا ہوئی۔ جب میں نے آرمی (فوج) میں شمولیت اختیار کی اس وقت مجھے اس بات کا بہت کم علم اور ادراک تھا کہ امریکہ دنیا بھر میں کیا کچھ کر رہا ہے۔ ملٹری انٹیلی جنس کے افسر اور بعد میں بین الاقوامی سطح پر رضاکارانہ طور پر کام کرنے والی بزنس ایگزیکٹو کے طور پر مجھے اپنے تجربات سے اس بات کا علم ہوا کہ ہماری (امریکہ کی) خارجہ پالیسی نہ صرف لوگوں کو اذیت اور تکلیف میں مبتلا کر رہی ہے بلکہ اس نے دنیا کو خطرناک حالات سے بھی دوچار کر دیا ہے۔ جب مجھے وسطی امریکہ میں امریکہ خارجہ پالیسی کو نافذ کرنے کی ذمہ داری سونپی گئی اور میں اس آپریشن کے ایک یونٹ کا حصہ بنا تو میرے خیالات میں مزید تبدیلی واقع ہوگئی۔ وسطی امریکہ کے مختلف علاقوں میں ہمارا کام ہی طاقت کے ذریعے اپنی مرضی وہاں کے عوام پر ٹھونسنا تھا۔

الجزیرہ......آپ نے اپنی کتاب میں امریکی عوام کو عالمی حالات کے متعلق اصل حقائق سے بالکل لاعلم قرار دیا ہے۔ آپ نے کس بنا پر یہ بات کہی ہے؟

ڈائیفسی......اس وقت ہمارے ہاں (امریکہ) صورت حال یہ ہے کہ اکثر میڈیا گروپ اور تنظیمیں کارپوریشن کی شکل اختیار کر چکے ہیں جن کا مقصد اشتہارات اور حکومتی مفادات و نظریات کو پروان چڑھانا بن چکا ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ کوئی بھی ایسی بات جو حکومتی اور انتظامی ڈھانچے کے مفادات کے خلاف ہوتی ہے وہ میڈیا کی توجہ حاصل کرنے میں ناکام ہو جاتی ہے میں ''فوکس'' کی نشاندہی کرنا چاہوں گا جو اس وقت ری پبلیکن کی

پروپیگنڈا کی بدترین مثال بن چکا ہے۔ لیکن یہ ضروری ہوتا ہے کہ جب آپ کا ملک حالت جنگ میں ہو تو آپ پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ آپ حقائق کو اچھی طرح سمجھیں اور آپ کو علم ہونا چاہیے کہ اس وقت کیا ہو رہا ہے۔ اگر آپ ایسا نہیں کرتے تو آپ بھی غیر منصفانہ عمل کے ایک ایجنٹ ہی بن جاتے ہیں۔ جب لوگوں کو پاس وقت ہوتا ہے تو وہ اپنی سرگرمیاں محدود نہیں کرتے۔ تاہم دوسری طرف انہیں اپنی تاریخ کو بھی سمجھنا چاہیے۔ یہ 1962ء کی بات ہے کہ جوائنٹ چیفس آف سٹاف نے آپریشن نارتھ وڈ نامی ایک منصوبہ پیش کیا۔ اس کا مقصد امریکی اہداف میں بڑے پیمانے پر قتل وغارت کراکے کیوبا کو مورد الزام ٹھہرانا تھا۔ تاکہ فیڈرل کاسترو کے خلاف جنگ کے لئے عوامی رائے کو ہموار کیا جاسکے۔ صدر جان ایف کینڈی نے اس منصوبے کو رد کر دیا۔ اس ایک واقعہ ہی کی بناء پر ہمیں بھی سمجھنا چاہئے کہ مستقبل میں امریکہ پر ہونے والا کوئی حملہ ضروری نہیں القاعدہ ہی کا کام ہو۔

الجزیرہ......آپ نے اپنی کتاب میں ظالم حکومتوں کے ساتھ امریکی اتحاد کی مذمت کی ہے۔ اگر ایسا اتحاد کسی بڑے عظیم مقصد کے تحت بنایا جائے تو کیا اس بات کو اس کے جواز کے طور پر استعمال نہیں کیا جاسکتا؟

ڈاینیسی......تاریخ سے ہمیں یہ سبق ملتا ہے کہ جب آپ اتحاد بناتے ہیں تو اس سے غیر منصفانہ رویوں کو تقویت ملتی ہے۔ اس طرح کے اتحاد کے نتیجے میں مستقبل میں آپ صرف غیر منصفانہ عمل کی ہی توقع کر سکتے ہیں اور کچھ نہیں۔

امریکی تاریخ بڑی بڑی خفیہ جنگوں کی داستان سے بھری پڑی ہے۔ اسی کی دہائی میں افغانستان میں امریکہ نے 6 ارب ڈالر جنگ کی نذر کئے جس کا نتیجہ القاعدہ کی صورت میں نکلا امریکیوں کو اس حقیقت کو سمجھنا چاہئے۔ اگر آپ کو اس بات کا علم ہو جائے کہ چالیس ممالک سے تعلق رکھنے والے گوانتانامو بے میں 500 قیدیوں میں ایک کا تعلق بھی عراق سے نہیں ہے اور اگر آپ یہ بھی جان لیں گے کہ سی آئی اے نے ان چالیس ممالک میں جن ہزاروں افراد کو پکڑا ہے ان میں سے بھی کوئی بھی عراقی نہیں تو آپ بخوبی یہ بات سمجھ جائیں گے کہ امریکہ نے القاعدہ اور طالبان کی تخلیق میں براہ راست کیا کردار ادا کیا ہے۔

الجزیرہ......صدر بش کے حامیوں کا کہنا ہے کہ صدام حسین کی حکومت سے علیحدگی اور طالبان کے خلاف جنگ فائدہ مند تھی اور ان دونوں کے خلاف فوجی آپریشن ہرگز بلاجواز نہ تھا۔

ڈاینیسی......اس سب کچھ کا آغاز ہی جعل سازی سے ہوا ہے۔ جب بش انتظامیہ کہتی ہے کہ "خواب" صدام حسین کا خاتمہ ایک عظیم کارنامہ ہے تو بالکل اسی لمحے وہ یہ بات تسلیم کرنے سے انکار کرتے ہیں کہ یہ صدر بش کے والد اور امریکن صدر ریگن ہی وہ قوت تھے جنہوں نے صدام حسین کو اس قدر مضبوط بنایا تھا۔ اگر آپ 1979ء میں امریکہ کی عراق پالیسی دیکھیں تو دودھ کا دودھ پانی کا پانی ہو جائے گا۔ صدر ریگن کے اقتدار سنبھالتے ہیں ایران میں پچھلے 444 دنوں میں امریکی سفارتخانے میں یرغمال بنائے گئے امریکیوں کو رہا کر دیا گیا۔ امریکیوں کو اس بات کا علم نہیں کہ ریگن کے اقتدار سنبھالتے ہی امریکیوں کی رہائی ایک اتفاق نہ تھا۔ امریکہ نے ایران کے ساتھ ایک تحریری معاہدہ کیا تھا جس میں اس بات پر متفق ہوا تھا کہ امریکہ ایران پر حملہ نہیں کرے گا اور ساتھ ایران کو 8 ارب ڈالر بھی ادا کرے گا۔ اسی معاہدے کی بناء پر صدر ریگن کی حلف برداری کی

تقریب کے موقع پر یہ واقعہ رونما ہوا جسے میڈیا پر بھرپور کوریج بھی دی گئی لیکن امریکی یرغمالیوں کو ایران کس طرح رہا کرنے پر راضی ہوا اس کے متعلق آگاہ نہیں کیا گیا تھا۔

الجزیرہ......تو آپ کو اس بات کا علم کیسے ہوا؟

ڈائینسی ...... یہ حقائق نہیں جو بعد میں مختلف اوقات کے دوران شائع ہوتے رہے۔ ایران کے ساتھ اس معاہدے کو نظر ثانی کے لیے موجودہ بش انتظامیہ کے سامنے بھی پیش کیا گیا تھا تاکہ دیکھا جائے کہ کیا امریکہ اب بھی اس کا پابند ہے یا نہیں۔ بش انتظامیہ اس معاہدہ کا تفصیلی جائزہ لینے کے بعد اس نتیجے پر پہنچی کہ جن سخت حالات میں امریکہ یہ معاہدہ کرنے پر مجبور ہوا اس کے تحت اب امریکہ اس کا پابند نہیں رہا۔ مجھے یہ بات بش انتظامیہ کے ایک سابق اعلیٰ عہدیدار اور سی آئی اے کے آفیسر رائے فلائن نے خود بتائی تھی۔

امریکہ نے ایران کے ساتھ اس معاہدے کو اپنی تذلیل سمجھا اور ریگن انتظامیہ اسی تذلیل کا بدلا لینے کے لئے ایرانیوں کو سبق سکھانا چاہتی تھی لیکن اس کے ہاتھ بندھے ہوئے تھے۔ اس لئے صدام حسین کو ایران کے خلاف اس وقت ایجنٹ کے طور پر استعمال کیا گیا۔ جس نے ایران پر چڑھائی کردی اور پھر نسل انسانی نے 1980 سے 1988ء تک آٹھ سالہ خونی جنگ دیکھی جس نے لاکھوں بے گناہ شہریوں کو اپنا لقمہ بنالیا۔

الجزیرہ......اس جنگ میں امریکہ کا کیا کردار تھا؟

ڈائینسی ...... اس جنگ کے شروع ہونے کے دو سال کے عرصے میں 1982ء تک ایران اپنے ہارے ہوئے علاقے صدام حسین سے واپس لینے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ اس لمحے صدام حسین نے امریکہ کو مدد کیلئے کہا۔ جس کے نتیجے میں صدر ریگن نے نیشنل سیکورٹی ڈویژن ڈائریکٹو این ایس ڈی ڈی 114 نامی معاہدے پر دستخط کیے جس کے تحت امریکہ صدام حسین کو ہر قسم کی حمایت فراہم کرنے پر رضامند ہو گیا۔ اس وقت ڈونلڈ رمزفلیڈ (موجودہ امریکی وزیر دفاع) کو ایک بہت ہی حساس مشن پر بھیجا گیا تاکہ عراق کے سیٹلائٹ کے ذریعے انٹیلی جنس سمیت انٹیلی جنس کے تمام آلات اور وسیع پیمانے پر تباہی پھیلانے والے ہتھیار فراہم کیئے جا سکیں۔ امریکی یہ بات جانتے ہیں کہ امریکہ نے اسی کی دہائی میں عراق کو یہ چیزیں فراہم کی تھیں۔ تاہم 1980 کی دہائی کے وسط میں جب صدام حسین کو اس بات کا علم ہوا کہ ہم امریکی ایران کو ہتھیار فروخت کر رہے ہیں تو وہ امریکہ سے ناراض ہو گیا۔ اسی کے نتیجے میں ہی اس نے کویت پر چڑھائی کردی۔ صدام حسین نے ایسا کیوں کیا؟ ایک تو اسے امریکہ کی طرف سے واضح پیغامات مل گئے تھے کہ وہ با آسانی کویت پر قبضہ کر سکتا تھا اور ساتھ ہی ساتھ ایران جنگ کے دوران امریکی کردار کی وجہ سے صدام حسین امریکہ سے کچھ امیدیں لگائے بیٹھا تھا۔

بہر حال یہ تمام جنگ غیر منصفانہ عمل کی بدترین شکلیں تھیں۔ اس کے بعد آپ 1990ء کی دہائی میں عراق پر اقوام متحدہ کی طرف سے لگائی گئی پابندیوں کو بھی دیکھ لیں کہ وہ کس قدر غیر منصفانہ تھیں۔ ان پابندیوں کو امریکہ اور برطانیہ نے اٹھانے سے انکار کر دیا تھا جس کے نتیجے میں دس لاکھ سے زائد عراقیوں نے خوراک اور ادویات کی کمی کی بدولت سسک سسک کر جان دیدی۔ مرنے والوں میں 5 لاکھ بچے بھی شامل تھے۔ یہ تعداد

ناگاساکی اور ہیروشیما پر ایٹم بم گرائے جانے والی ہلاکتوں سے کہیں زیادہ ہے۔

الجزیرہ......آپ نے ناانصافی پر مبنی اقدامات کی ایک طویل فہرست کا ذکر کیا ہے جس کے نتیجے میں امریکی اہداف پر حملے کئے گئے تو کیا اس دہشت گردی کے لئے جواز قرار نہیں دیا جاسکتا؟

ڈائینسی......میری سی آئی اے کے مائیکل شیوئر جو کہ اسامہ بن لادن کو تلاش کرنے والی ٹیم کے سربراہ سے بات ہوئی اور اس نے زور دے کر یہ بات کہی کہ مسلم دنیا کے لوگ ہمارے خلاف ہماری آزادی اور جمہوریت کی وجہ سے نہیں لڑ رہے بلکہ یہ ہماری خارجہ پالیسی ہے جو انہیں ہتھیار اٹھانے پر مجبور رکھے ہوئے ہے یہی وہ حقیقت ہے جسے بش انتظامیہ مسلسل توڑ مروڑ کر پیش کرتی ہے۔

یہ بنیادی اصول ہے کہ جب آپ کسی کو تکلیف پہنچاتے ہیں تو وہ بھی آپ کو تکلیف پہچانا چاہتا ہے۔ ہمیں یہ سوالات پوچھنے چاہئیں کہ "نائن الیون" کا سانحہ کیوں پیش آیا؟ اسامہ بن لادن امریکہ، برطانیہ اسرائیل اور دوسرے ممالک کے خلاف برسرپیکار کیوں ہے؟ اگر امریکی ان سوالات کا جواب تلاش کریں تو ان پر واضح ہو جائے گا کہ یہ عرب سرزمین پر امریکی فوجوں کی موجودگی کا نتیجہ ہے اور پھر انہیں یہ بھی علم ہو جائے گا اب یہ صرف عرب اور مسلم دنیا کا ایشو نہیں رہا۔ مجھے یہی کچھ جنوبی کوریا میں بھی دکھائی دیا جہاں 1950ء سے امریکی فوجیں موجود ہیں۔ جب آپ کسی بھی جگہ ایک لمبے عرصے تک موجود رہتے ہیں تو اس سے یہ واضح پیغام ملتا ہے کہ آپ کی موجودگی آزادی کے لئے نہیں بلکہ قبضے کی خواہش کے پیش نظر ہے۔

الجزیرہ......آپ نے اپنی کتاب میں امریکہ کو وسیع پیمانے پر تباہی پھیلانے والے ہتھیاروں کا سب سے بڑا ذمہ دار قرار دیا ہے کیوں؟

ڈائینسی......امریکہ نے 1945ء دوسری جنگ عظیم کے بعد سے لے کر اب تک ستر ہزار (70,000) ایٹمی ہتھیاروں کی تیاری پر 5 کھرب ڈالر خرچ کئے۔ یہ رقم پوری دنیا کی طرف سے اس مقصد کے لئے خرچ کی جانے والی مجموعی رقم سے بھی زیادہ ہے۔ 1999ء میں کانگریس میں پیش کی جانے والی رپورٹ میں انکشاف کیا گیا کہ امریکہ کی طرف سے ڈیزائن کئے گئے بہت سارے ایٹمی جوہری ہتھیاروں جن میں کئی ابھی تک بنائے بھی نہیں گئے تھے چرا کر چین پہنچادیئے گئے تھے۔ اسی طرح اسرائیل نے جوہری پروگرام بھی امریکہ سے ہی حاصل کیا۔

اس کے باوجود عام امریکی بش انتظامیہ کے جھوٹ سے بہت سے زیادہ متاثر ہیں اور وہ عراق سمیت دنیا بھر کے مختلف مقامات پر وسیع پیمانے پر تباہی پھیلانے والے ہتھیاروں کی موجودگی کے بارے میں دھوکہ دہی اور فریب کاری کا شکار ہیں۔

الجزیرہ......کیا واقعی ایران امریکہ کے لئے خطرہ ہے؟ جبکہ شیعہ ایران اور سنی القاعدہ کے مابین قریب قریب اتحاد کے کوئی امکانات نظر نہیں آ رہے۔

ڈائینسی......اگر امریکہ ایران پر حملہ نہیں کرتا تو ایران کبھی بھی امریکہ پر حملہ نہیں کرے گا۔ امریکی کانگریس کے رکن کرٹ ویلڈن جنہوں نے تہران انتظامیہ پر الزام لگایا کہ وہ امریکہ پر حملے کی تیاری کر رہی ہے' کا کہنا ہے کہ ایران پر امریکہ کو حملہ کردینا چاہئے لیکن اس طرح کی باتیں دنیا کو مزید خطرناک بنا رہی ہیں۔ ایک لمحے کے لئے اگر ہم ایران کی جگہ ہوتے تو یقیناً ہم بھی اسرائیل کی موجودگی کے باعث ایٹمی ہتھیار ضرور تیار کرتے

ان حالات میں امریکہ کو چاہئے کہ وہ اسرائیل کو ایٹمی ہتھیاروں کے خاتمے پر رضامند کرے۔

جہاں تک ایران اور القاعدہ کے مابین مذہبی اختلاف کا تعلق ہے تو اس حوالے سے آپ کا کہنا بالکل درست ہے لیکن دوسری طرف یہ بھی حقیقت ہے کہ صدر بش کی دہشت گردی کے خلاف جنگ مختلف فرقوں کو ایک دوسرے کے قریب لانے کا باعث بن رہی ہے۔ انٹیلی جنس رپورٹوں کے مطابق اسامہ بن لادن کا بیٹا سعد اس وقت ایران میں موجود ہے لیکن ہم یقینی طور پر نہیں کہہ سکتے کہ وہ ایک دوسرے کی مدد کر رہے ہیں تاہم حقیقت جو کچھ بھی ہو بش انتظامیہ ایران کے ساتھ پرامن تعلقات کی خواہاں نہیں ہے۔

الجزیرہ...... آپ کا کہنا ہے کہ "زخم کا نتیجہ رحم دلی ہی کی صورت میں نکلتا ہے" آپ اسے کس طرح ثابت کریں گے؟

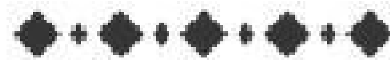
ڈائینسی...... پہلی جنگ عظیم کے نتیجے میں ہونے والے معاہدے سے جرمنی کو سخت سزا دی گئی اور اس پر مصیبتوں کے پہاڑ کھڑے کر دیئے گئے۔ جس پر نازیوں کا مشتعل ہونا قدرتی امر تھا لیکن دوسری عالمی جنگ کے بعد جب مارشل پلان کے تحت جرمنی اور جاپان کو تعمیر نو کا موقع دیا گیا تو اس وقت امریکہ نے جمہوریت کے فروغ کے لئے بہت کچھ کیا۔ جمہوریت کے فروغ کے لئے جتنا کچھ اس دوران ہوا اس کی مثال سرد جنگ کے طویل عرصے کے دوران کہیں نہیں ملتی۔

دنیا کو پرامن اور محفوظ بنانے کیلئے ہمیں مظالم اور دکھوں کا مداوا کرنا چاہئے بلکہ اس کے خلاف باقاعدہ جنگ کرنی چاہئے۔ آپ ذرا تصور کریں کہ اگر صدر بش نائن الیون کے سانحے کے بعد کہتے ہیں کہ "لوگ مشرق وسطیٰ میں ہماری غلطیوں پر ناراض ہیں اس لئے ہمیں مسلم دنیا میں بھوک کے خاتمے، صاف پانی اور تعلیم کی فراہمی کو یقینی بنانا ہوگا" تو اس کے نتیجے میں ہمیں دنیا بھر میں مزید دوست ملتے اور اس عمل پر ہمارے دشمن بھی ہماری حمایت کرتے۔

الجزیرہ...... اگر ہمیں قریب قریب امریکی خارجہ پالیسی میں تبدیلی کا کوئی امکان نظر نہیں آتا تو کیا اس صورت میں امریکی ہیروشیما کے واقعے کو رونما ہونے سے روکنے میں بہت دیر نہیں ہو جائے گی؟

ڈائینسی...... اگرچہ آپ کا اشارہ کافی زیادہ حقیقت پر مبنی ہے لیکن پھر بھی ابھی زیادہ دیر نہیں ہوئی۔ ابھی بھی ہم امریکی ردعمل کو متاثر کر سکتے ہیں اگر امریکہ عقلمندی اور ہوش کا مظاہرہ کرے تو ہم لاکھوں لوگوں کی زندگیاں محفوظ بنا سکتے ہیں۔

2005ء کے لئے امریکہ کا فوجی بجٹ 240 ارب ڈالر ہے۔ ہم ابھی بھی اسے تین حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ اگر ہم اس بجٹ کا ایک تہائی حصہ مشرق وسطیٰ خاص طور پر عراق میں معاشی ترقی پر خرچ کریں اور ایک تہائی ہم ملک کے اندر فلاح و بہبود اور صحت کی سہولیات کی فراہمی پر خرچ کر دیں تو بھی جو دفاعی بجٹ باقی بچے گا وہ دنیا بھر کے کسی بھی ملک کے دفاعی بجٹ سے زیادہ ہوگا۔



صدر بش کے 5 جھوٹ

یہ 15 ستمبر کی صبح ہے۔ 11 ستمبر کو گزرے محض چار دن ہوئے ہیں۔ وہ گیارہ ستمبر جس نے عالمی سیاست کے رخ کو یکسر پلٹ کر رکھ دیا، آج سے چار دن قبل تک نیویارک میں آسمان سے باتیں کرتی دو بلند و بالا عمارتیں موجود تھیں۔ مگر آج وہاں پگھلا ہوا لوہا، ٹوٹے ہوئے شیشے اور ملبے کا ڈھیر ہے۔ صرف چار دن پہلے تک مسلمان امریکہ میں معمول کے مطابق شب و روز بسر کر رہے تھے۔ مگر آج وہ اپنے گھروں میں خوف و ہراس کے عالم میں مقید ہیں۔ کیونکہ مشتبہ دہشت گرد ہونے کے الزام سے بچ بھی گئے تو جنونی امریکیوں سے کون بچائے گا؟ آج سے چار دن پہلے تک برابری کی سطح پر دوسرے ممالک سے تعلقات قائم کرنے والا بش، آج دجال بنا دوسرے ممالک سے تباہی و بربادی یا امریکہ کی حمایت کا فیصلہ مانگ رہا ہے۔ چار روز قبل کے کل اور چار روز بعد کے آج میں بہت فرق ہے۔ کل تک جو معصوم افغان و عراقی روزمرہ معمولات میں مصروف تھے آج ان کی موت کا فیصلہ ہو رہا ہے۔ کیمپ ڈیوڈ میں ہونے والی اس ہنگامی ملاقات میں امریکی صدر بش اور ان کی انتظامیہ کے تمام افراد موجود ہیں اور اس امر پر بحث ہو رہی ہے کہ 9/11 کو کس کے خلاف بطور ہتھیار استعمال کیا جائے۔ عراق یا افغانستان؟ یکایک آرمڈ سروس کمپنی کے سینیٹر عراق پر حملے کے حوالے سے سوال کرتے ہیں "آخر ہم کس وجہ سے اس قدر جلدی میں ہنگامی ایکشن لینے پر مجبور ہیں؟" سیکرٹری دفاع ڈونلڈ رمزفیلڈ سخت برہمی کے انداز میں جواب دیتے ہیں "کس بناء پر؟ اس بناء پر کہ 3 ہزار امریکی مارے گئے ہیں" عراق پر حملے اور قبضے کے سلسلے میں غالباً یہ سب سے بھونڈی دلیل تھی جو امریکی ہٹ دھرمی اور لالچ کا ثبوت تھی۔ اس ملاقات میں ڈونلڈ رمزفیلڈ تمام تر زورِ بیاں، حاضرین کو اس امر پر قائل کرنے پر صرف کر رہے تھے کہ افغانستان میں امریکہ وہ کامیابی حاصل کرنے میں ناکام رہے گا، جس کی توقع عراق میں کی جا سکتی ہے۔ کیمپ ڈیوڈ میں منعقدہ اس میٹنگ میں وائٹ ہاؤس کے چیدہ چیدہ افراد سخت طیش و اشتعال کے عالم میں صدر بش پر زور دے رہے تھے کہ خواہ 9/11 کے حادثے سے عراق کا تعلق ثابت ہو یا نہ ہو۔ ہمیں اس پر حملہ کر دینا چاہیے۔ عراق پر حملے کے لیے عوام کو قائل کرنے کی واحد توجیح یہ تھی کہ اس پر افغانستان کی نسبت حملہ کرنا نیز قبضہ آسان تھا، وزیر دفاع ڈونلڈ رمزفیلڈ صدر بش کو اپنے مؤقف پر قائل کرنے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے تھے۔ اس سے قبل ان کے نائب نے بھی اسی ڈھول کو پیٹتے ہوئے یہ مؤقف اختیار کیا تھا کہ چونکہ افغانستان کے سنگلاخ اور پر پیچ پہاڑوں دغاروں کی نسبت عراق میں یہ جنگ لڑنا آسان ہے لہٰذا ہمیں عراق پر حملہ کرنا چاہیے۔

وڈورڈ جو وائٹ ہاؤس کی سیاست میں ایک نمایاں مقام کا حامل ہے، اپنی کتاب میں اس ملاقات کا حال لکھتے ہوئے کہتا ہے کہ کولن پاول 9/11 کے حادثے کو عراق کے خلاف بطور ہتھیار استعمال کرنے کے حق میں نہ تھے۔ انہوں نے واضح الفاظ میں کہا تھا کہ اس طرح امریکہ کو موقع پرست اور لالچی کہا جائے گا، بہرحال اس گرما گرم بحث و مباحثے کا انجام یہ ہوا کہ عراق کا تذکرہ سن سن کر صدر بش کے کان پک گئے۔ ویسے بھی وہ اس جنگ کے ذریعے افغانستان میں طالبان اور القاعدہ کو اپنا نشانہ بنانا چاہتے تھے۔ اور پھر افغانستان پر امریکہ نے حملہ کر دیا۔ تاہم افغانستان پر امریکی حملہ، صدر بش

اور کولن پاؤل کی وقتی فتح ثابت ہوئی کیونکہ محض ایک سال بعد رمزفیلڈ اور امریکی انتظامیہ کی "خواہش" کو بش نے لفظوں کا جامہ پہناتے ہوئے عراق پر حملے کا اعلان کیا۔ کیونکہ ان کو اس امر سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ صدام حسین یا عراق کا ان حملوں سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ انہیں دو سال بعد صدر بش سے اعتراف ناکامی سے بھی فرق نہیں پڑتا ہے۔ انہیں اس چیز کی بھی کوئی پرواہ نہیں اور اقوام متحدہ کے اسلحہ انسپکٹر باوجود مکمل آزادی کے عراق سے کسی بھی قسم کا قابل اعتراض مواد تلاش کرنے میں ناکام رہے ہیں۔ امریکہ کو اس مخالفت کی بھی کوئی پرواہ نہیں، جو اس کے اتحادی یورپی ممالک کی جانب سے سامنے آئی اور نہ صدر بش کو اس وقت کی کوئی پرواہ ہے جب ایک دن میں پوری دنیا 15 ملین افراد نے عراق پر حملے کی مخالفت کی۔

وار پلان پر امریکی صدر بش کے دستخط کے بعد رمزفیلڈ اور ان کے ہمنواؤں کی خواہش پوری ہونے میں محض ایک دشواری باقی تھی اور وہ رائے عامہ کی ہمواری تھی۔ جس کے لیے بش انتظامیہ نے نہایت پھوہڑ پنے کے ساتھ ایک کمپین لانچ کی۔ جس میں صدام حسین کو نئی صدی کا ہٹلر قرار دیا گیا۔ امریکہ کو اس سے ممکنہ بائیولوجیکل، کیمیائی حملوں کے خطرے کا ڈراوا دیا گیا اور آخر میں اسے ناپسندیدہ اور غیر مقبول لیڈر قرار دیا گیا، جسے تخت و تاج پر سے ہٹانا اشد ضروری تھا اور یوں...... جیسا کہ انہوں نے کہا تھا۔ ایک تاریخ رقم ہوئی۔ بدترین تاریخ!

عراق پر حملے میں امریکی انٹیلی جنس نے بہت اہم کردار ادا کیا۔ انٹیلی جنس ذرائع سے حاصل ہونے والی معلومات کو بش انتظامیہ، اپنے خیالات وافکار میں شامل کر کے حقائق کی مسخ شدہ تصویر منظر عام پر لاتی رہی۔ اس حوالے سے اسٹیٹ ڈیپارٹمنٹ کے بیورو برائے انٹیلی جنس کے سابق ڈائریکٹر گریگوری کا کہنا ہے کہ "امریکی انٹیلی جنس حقائق سے زیادہ اپنے عقائد کی روشنی میں کام کرتی ہے۔ بش انتظامیہ نے امریکی عوام کو عراق سے درپیش ممکنہ خطرے کے بارے میں حقیقت سے آگاہ نہیں کیا تھا بلکہ انتظامیہ نے معلومات کا غلط استعمال کیا۔"

9/11 کے بعد ہنگامی اجلاس میں ڈونلڈ رمزفیلڈ نے عراق پر حملے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگایا مگر بالآخر موت کا پروانہ افغانستان کے نام کا جاری ہوا۔ تاہم ڈونلڈ رمزفیلڈ عراق پر حملے کے لئے مسلسل تیاریوں میں مصروف رہے۔ اس حوالے سے گریگوری کے انکشافات بش انتظامیہ کے لالچ اور ڈونلڈ رمزفیلڈ کے خبث باطن کا مظہر ہیں۔ گریگوری کہتا ہے کہ وہ تمام معلومات میں سے اپنی پسند کی معلومات محض اکٹھا کر رہے تھے"۔ وہ عراق پر ہر حال میں جنگ مسلط کرنا چاہتے تھے۔ اس مقصد کیلئے ڈونلڈ رمزفیلڈ نے اپنی ذاتی انٹیلی جنس بھی ترتیب دے رکھی تھی۔ یہ نیٹ ورک نیم حکومتی انداز میں کام سرانجام دیتی تھی۔ تاہم اس کی طاقت اور اہمیت اس وقت کھل کر سامنے آئی جب اس نے عراق کے ساتھ جنگ کیلئے تمام تر دلائل ترتیب دیئے۔ حالانکہ نہ تو او ایس پی کے ذرائع اتنے معتبر ہیں نہ ہی اس کا طریقہ کار ایجنسی بنیادی طور پر سی آئی اے کو ملنے والی ابتدائی معلومات اور عراق نیشنل کانگریس سے معلومات اکٹھا کرتی ہے۔ حالانکہ عراق نیشنل کانگریس، انٹیلی جنس کی دنیا میں ذرہ برابر بھی قابل بھروسہ نہیں سمجھی جاتی ہے۔ اس کے باوجود عراق پر حملے کیلئے تمام تر تراشے گئے جواز اس ایجنسی کی جانب سے فراہم کیے گئے تھے۔

حقیقت تو یہ ہے کہ عراق پر حملہ کے لیے گھڑے گئے تمام جواز حقیقت سے کوسوں دور تھے۔ مگر 9/11 کے بعد سے مسلسل 18 ماہ تک جاری رہنے والے پروپیگنڈے نے بالآخر کانگریس اور میڈیا کو اس حملے کیلئے تیار کر لیا تھا۔

اس تمام بحث ومباحثے کے بعد بات تو ثابت ہو جاتی ہے کہ بش انتظامیہ ہر صورت عراق پر جنگ مسلط کرنا چاہتی تھی۔ مگر پھر سوال یہ پیدا ہوتا

ہے کہ آخر بش انتظامیہ عراق پر جنگ کیوں مسلط کرنا چاہتی تھی۔ اس حوالے سے سیاسی پنڈتوں کا کہنا ہے کہ صدر بش اپنے باپ کے ادھورے مشن کو مکمل کرنا چاہتے ہیں۔ بش سینئر کا ادھورا مشن "صدام حسین کی تباہی" ہے۔ یہی وجہ ہے کہ صدر بش نے اپنی انتظامیہ میں ایسے لوگوں کا انتخاب کیا جو گزشتہ کئی سالوں سے عراق پر قبضے اور مشرق وسطیٰ کی تعمیر نو کے بارے میں لکھتے، بولتے اور سوچتے آئے ہیں۔ اس قسم کی سوچ کے حامل، جن کو بالعموم جدت پسند کہا جاتا ہے۔ میں ڈونلڈ رمزفیلڈ، اسٹیفن ہیڈلے، ڈک چینی اور بہت سے دیگر شامل ہیں۔ جدت پسندوں کے اس ٹولے کی خواہش ہے کہ کروڑوں کی تباہی کے بعد امریکہ واحد سپر پاور ہے۔ لہٰذا اس دنیا پر اپنے تسلط کو طوالت دینے کیلئے اپنی افواج اور معیشت سے کام لینا چاہیے۔ عراق پر حملے اور قبضے کی امریکی خواہش بہت پرانا خواب کی تعبیر اور منصوبہ ہے۔ اس کا ثبوت وہ خط ہے، جو جدت پسندوں کے اس ٹولے کے ترتیب شدہ تھنک ٹینک پی این اے سی کی جانب سے ری پبلکن لیڈران کو لکھا گیا تھا۔ خط پر کم و بیش ان تمام افراد کے دستخط موجود ہیں۔ جو بعد ازاں صدر بش کی کابینہ میں شامل ہوئے تھے۔ خط میں پی این اے سی نے امریکی پالیسی میں تبدیلی کا مشورہ دیتے ہوئے لکھا گیا ہے اس کے اتحادیوں کو بڑے پیمانے پر تباہی پھیلانے والے ہتھیاروں سے بچانے کا محض طریقہ ہے کہ عراق میں صدام حکومت کو طوالت دینے کی بجائے اس کا خاتمہ کیا جائے۔ خلیج میں امریکی تسلط کو، امریکی طاقت کا اظہار سمجھنے والے پی این اے سی کے جدت پسند نمائندوں نے 9/11 کے ایک ہفتے بعد صدر بش کو ایک خط لکھا جس میں صدر بش پر زور دیا گیا کہ وہ دہشت گردی کے خلاف جنگ کو نہ صرف افغانستان میں لڑیں بلکہ اس کا دائرہ کار وسیع کر کے ایران، سیریا، فلسطین اور عراق تک وسیع کر دیں اور اگر دہشت گردی کے خلاف جنگی حکمت عملی میں اگر عراق کو شامل نہ کیا گیا تو بلاشبہ یہ جنگ سے قبل ہتھیار ڈالنے کے مترادف ہوگا۔

اگر 9/11 سے قبل کی تاریخ پر نگاہ دوڑائی جائے تو اس امر کی وضاحت ہو جاتی ہے کہ ڈونلڈ رمزفیلڈ، اس کے نائب وولف وٹز و دیگر اصحاب جو پی این اے سی میں شامل ہیں۔ درحقیقت بہت عرصے سے عراق پر حملوں کی منصوبہ بندی کر رہے تھے۔ اسٹیو پیری اس تاریخ کو بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "حقیقت تو یہ ہے کہ 9/11 کے بعد کی امریکی خارجہ پالیسی 9/11 کی مرہون منت ہرگز نہ تھی۔ درحقیقت یہ سرد جنگ کے بعد کی اس دنیا کا نقشہ تھا جو بش سینئر نے ترتیب دیا تھا اور اب 9/11 کی بدولت صدر بش کو ان خواہشات کو عملی جامہ پہنانے کا موقع مل گیا جس کے لیے انہوں نے اپنی عوام سے کہا کہ عراق پر حملہ اور قبضہ دہشت گردی کے خلاف جنگ کا اہم حصہ ہے۔ تاہم کروڑوں ڈالر کے اخراجات اور ڈیڑھ لاکھ جوانوں پر مشتمل فوج کو 6 ہزار میل دور بھیجنے کے لئے رائے عامہ کی ہمواری ایک مشکل مرحلہ تھا۔ جسے سر کرنے کیلئے بش انتظامیہ نے پانچ نکات کو منتخب کیا۔ ان کی بدولت نا صرف رائے عامہ آسانی کے ساتھ ہموار کی جا سکتی تھی۔ بلکہ عوام کی ہمدردیاں بھی بش انتظامیہ کے ساتھ ہونے کی توقع تھی۔ وہاں پانچ نکات جو بعد ازاں جھوٹے ثابت ہوئے درج ذیل تھے۔

1۔ عراق نا صرف 9/11 کے حادثے میں ملوث ہے۔ بلکہ اس کے القاعدہ کے ساتھ بھی تعلقات ہیں۔

2۔ عراق کے پاس غیر قانونی کیمیکل اور بائیولوجیکل ہتھیار ہیں۔ جو نا صرف امریکہ بلکہ اس کے اتحادیوں کے لیے بھی خطرناک ہیں۔

3۔ عراق عنقریب ایٹم بم بنانے میں کامیاب ہو جائے گا۔ خدشہ ہے کہ شاید وہ یہ بم بنا چکا ہے۔

4۔ عراق پر قبضہ نا صرف آسان ہوگا۔ بلکہ عراقی عوام ہمارا بھرپور استقبال کریں گے۔ بعدازاں عراق کی تعمیر میں ہمارا مکمل ساتھ دیں گے۔

5۔ امریکی مدد اور ہدایت کی روشنی میں عراق عنقریب ایک قابل تقلید جمہوریت بن جائے گا۔ جو بقیہ دنیا کیلئے نمونہ ہوگا۔

بش انتظامیہ کی جانب سے گھڑے گئے جھوٹ بہت مضبوط نہ تھے۔ مگر ان کو خوف کے اس پیرائے میں پیش کیا گیا کہ جیسے یہ سوویت یونین کے کیوبا میں موجود نیوکلیائی ہتھیار یا پرل ہاربر پر حملے جیسا بڑا خطرہ ہو اور امریکی عوام...... وہ تو جب کسی سے کوئی تعلق نہ ہو اس کے بارے میں سوچنا بھی پسند نہیں کرتی۔ ایسے میں وہ کیونکر اس امر سے واقف ہو سکتی ہے کہ عراق پیٹرولیم کے ذخائر کے حوالے سے پوری دنیا میں دوسرے نمبر پر ہے۔ امریکی عوام کو نہ تو صدام حسین کی تخت و تاج سے معزولی سے کوئی فرق پڑتا تھا نہ ہی انہیں اس امر کی پرواہ تھی کہ عراق میں موجود تیل کے ذخائر کو دریا میں بہا دیا جائے۔ اگر انہیں کوئی فکر یا پریشانی لاحق تھی تو وہ اپنی سلامتی کی تھی۔ امریکی صدر بش امریکہ کی فطرت سے واقف تھے۔ وہ جانتے تھے کہ عوام کو دو لفظوں کی مدد سے بہت آسانی سے قائل کیا جا سکتا ہے۔ دفاع اور اخلاقی ذمہ داری۔ سو عراق سے ممکنہ خطرے سے بچاؤ کیلئے دفاع اور عراقی عوام کو ظالم سے نجات دلانے کا لالی پاپ عوام کو صدر بش کا نسبتاً ہمنوا کر گیا۔ صدر بش نے یہ اور اس جیسے لاتعداد جھوٹ، عراق پر حملے کیلئے بولے۔ تاہم پانچ جھوٹ ایسے تھے کہ جو آنکھوں دیکھی مکھی نگلنے کے مترادف تھے۔ آیئے بش کے ان فریبوں اور بہانوں کا تفصیلی جائزہ لیتے ہیں۔

صدر بش نے عراق پر حملہ کا پہلا جواز اس کے القاعدہ سے تعلقات کا تراشا۔ انہوں نے کہا کہ صدام حسین ریاستی سطح پر دہشت گردی میں ملوث ہے۔ غرض اس کی شخصیت اور دنیا کو اس سے ممکنہ خطرے کو اس انداز میں بش انتظامیہ نے بیان کیا کہ گویا وہ نئی صدی کا ہٹلر ہے۔ تاہم بش انتظامیہ نے کبھی بھی اس امر کی وضاحت کرنے کی کوشش نہیں کی۔ اگر عراق اور صدام حسین دہشت گردی پھیلانے کے ذمہ دار ہیں تو کب؟ کس کے خلاف؟ اس دہشت گردی کا مقصد کیا تھا نیز یہ کتنی تباہ کن تھی؟ یہ وہ سوالات ہیں جن کا جواب بش انتظامیہ نے دینے کی زحمت گوارا نہ کی۔ حقیقت تو یہ ہے کہ القاعدہ اور عراق۔ دونوں میں ذرہ بھر مماثلت کا شائبہ تک نہیں ہے۔ القاعدہ ایک موبائل تنظیم ہے جس کی مخصوص خطے میں نشاندہی ناممکن ہے۔ یہ خودکش حملہ آوروں کا ایسا گروہ ہے، جن کو جان کی بازی لگانے کے یا تو پیسے دیئے جاتے ہیں یا پھر وہ جذبہ شہادت سے سرشار ہوتے ہیں، دوسری جانب عراق ایک مخصوص خطے کا حامل ملک ہے یہی وجہ ہے کہ وہ معاشی اور سیاسی طور پر مضبوط ہے۔ دونوں کے تنظیمی ڈھانچے میں تضاد اس امر کی نفی کرتا ہے کہ عراق سے امریکہ یا اسرائیل کے مفادات کو خطرہ لاحق ہے۔ صدر بش نے عراق کے دہشت گردی میں ملوث ہونے کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ ''دہشت گردوں کے ساتھ تعلقات عراق کو اس قابل بنا سکتے ہیں کہ وہ امریکہ پر بنا کوئی ثبوت چھوڑے، حملہ کر سکے''۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ محض شک کی بنیاد پر کسی پر حملہ کیا جا سکتا ہے؟ اپنے واہمہ کے باعث کسی اقتدار کا تختہ الٹ کر وہاں پر قبضہ کرنا جائز ہوتا ہے؟

میتھو پولاک اپنی کتاب تھریٹننگ اسٹورم میں ایک جگہ لکھتا ہے صدام نے دہشت گردوں کو کبھی بھی وسیع پیمانے پر تباہی پھیلانے والے ہتھیار نہیں دیئے کیونکہ وہ عالمی دہشت گردوں سے کنارہ کشی اختیار کرنا ہی مناسب سمجھتا تھا۔ اس کی وجہ بیان کرتے ہوئے وہ لکھتا ہے کہ ''صدام کے اندر مایوسی بڑھ رہی تھی کیونکہ ایران عراق جنگ کے باعث دہشت گردی کے خلاف اس کی پالیسی میں بہت بڑی تبدیلی رونما ہوئی تھی چونکہ اب وہ جدید عرب دنیا، امریکہ اور یورپ پر زیادہ تر انحصار کرتا تھا۔ لہٰذا اس نے اپنے آپ کو عالمی دہشت گردوں سے فاصلہ پیدا کرنا شروع کر دیا'' میتھو پولاک

کی یہ کتاب اس امر کی تصدیق کرتی ہے کہ صدام حسین کے القاعدہ تو کیا کسی بھی قسم کے دہشت گردوں کے ساتھ تعلقات نہیں تھے اور اس حوالے سے اگر سی آئی اے کی خفیہ انکوائریوں کی رپورٹ دیکھی جائے۔ تب تو گویا اس کے جھوٹ پر مہر ثبت ہو جاتی ہے۔ 7 اکتوبر 2002ء کو سی آئی اے کے جاری کردہ بیان کے مطابق ''القاعدہ اور عراق کے درمیان ایک دہائی قبل اعلیٰ سطحی روابط کے ثبوت ملے ہیں۔ ایک دہائی قبل کے القاعدہ اور عراق کے مابین تعلقات ہرگز ہرگز حیران کن انکشاف نہ تھا۔ کیونکہ 80 کے عشرے میں القاعدہ نے امریکی زیرِ نگرانی افغانستان میں سوویت یونین کے خلاف جنگ کا آغاز کیا تھا۔ اس دور میں القاعدہ خطے میں نہایت فعال تھی، ایسے میں القاعدہ اور عراق کے مابین تعلقات کا انکشاف ناقابل یقین امر ہرگز نہیں تھا۔ تاہم سی آئی اے کے ڈائریکٹر جارج کینٹ کا یہ انکشاف دراصل وائٹ ہاؤس میں موجود جارج کینٹ آقا کی خواہش تھی۔ جسے انٹیلی جنس کے ذریعے قابل قبول بنا دیا گیا تھا۔

درحقیقت عراق پر القاعدہ کے ساتھ تعلقات کا الزام نہایت ہی بھونڈا اور وزن میں نہایت ہلکا تھا۔ کیونکہ سی آئی نے جہاں دس سال قبل کے ان تعلقات کا انکشاف کیا تھا وہیں یہ اعتراض بھی کیا تھا کہ 90 کی دہائی میں القاعدہ اور عراق کے مابین ملاقات کا ثبوت نہیں ملتا۔ کیا ماضی کے خوشگوار تعلقات حال میں جاری روابط کا ثبوت ہوتے ہیں؟ مگر صدر بش نے اس الزام کو امریکی قوم کے سامنے اس انداز میں پیش کیا اور القاعدہ کے تعلقات کا یوں ڈھنڈورا پیٹا کہ آخر کار کانگرس کو جنگ کیلئے ہزاروں بلین ڈالر کے بجٹ کی منظوری دیتے ہی بنی۔

صدر بش نے عراق میں کیمیکل اور بائیولوجیکل ہتھیاروں کی موجودگی کے حوالے سے بھی اپنی انٹیلی جنس کا سہارا لیا تھا۔ اگست 2003ء میں بلکہ ہر طرف عراق پر امریکی حملے کی خبریں گرم تھیں۔ لاس اینجلس ٹائمز نے ایک رپورٹ شائع کی جس نے پورے امریکہ تو کیا پوری دنیا میں کھلبلی مچا دی اس خبر کی شہ سرخی کچھ یوں تھی ''امریکہ نے اعتراف کیا ہے کہ عراقی اسلحہ کے حوالے سے اس کی خبریں غلط تھیں۔ تفصیلات کے مطابق انٹیلی جنس انتظامیہ جنگ کا جواز بننے والے تمام مواد کا دوبارہ جائزہ لے رہی ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ صدام حسین کے ذرائع سے ملنے والی تمام معلومات بوگس تھیں۔ یہ رپورٹ امریکی انٹیلی جنس آفیشل جنہوں نے نام ظاہر کرنے سے انکار کیا تھا کی مہیا کردہ معلومات پر مبنی تھا۔ ٹائمز میں مصنف باب ڈراگن نے اپنے ذرائع کے حوالے سے تحریر کیا ہے کہ ''ان کو امریکی انٹیلی جنس نے اتنی معلومات مہیا کی گئی تھیں کہ جس سے وہ یہ یقین کر لیں کہ عراق کا ایٹمی پروگرام جاری ہے۔ چونکہ انہوں نے ہتھیاروں کی موجودگی کا یقین کر لیا تھا لہٰذا انہیں مزید دھوکہ دینے کیلئے عراقیوں نے پولی گراف ٹیسٹ کر لیے۔ تاکہ ان کا یقین پختہ ہو جائے'' صدام اپنے ہتھیاروں کے ذریعے اہل مغرب کو دھوکہ میں مبتلا کرنا چاہتا تھا۔ مگر اندازے کی غلطی کے باعث پوری قوم کو اس کا خمیازہ بھگتنا پڑا۔ دوسری جانب محترم کولن پاؤل صاحب بھی عراقی ذرائع سے ملنے والی معلومات پر تکیہ کر بیٹھے تھے۔

عراق میں ممکنہ ہتھیاروں سے متعلق تمام تر معلومات کا امریکی ذریعہ احمد جلابی تھا، ڈونلڈ فیلڈ ان کی ایجنسی او ایس پی اور جدت پسند تھنک ٹینکرز کا گروہ پی این اے سی یہ تمام کے تمام احمد جلالی پر بھروسہ کرتے تھے اور عراقی ہتھیاروں کے معاملے میں احمد جلابی کا اپنا ہی ایجنڈا تھا۔ وہ صدام حسین کو امریکہ کے زیرِ عتاب لا کر اقتدار پر اپنی گرفت مضبوط کرنا چاہتا تھا اور اسی کی مہیا کردہ معلومات کی بنا پر 30 مارچ 2003ء کو ڈونلڈ رمز فیلڈ نے صحافیوں سے گفتگو کرتے ہوئے اپنی کامیابی کا یقین دلایا۔ انہوں نے کہا ''ہم جانتے ہیں کہ وہ (عراق کے بڑے پیمانے پر تباہی پھیلانے

والے ہتھیار) کہاں ہیں۔ وہ تکریت اور بغداد اس کے آس پاس مشرق مغرب اور شمال جنوب میں کہیں ہوسکتے ہیں۔ ان کا یہ بیان خود ان کی اپنی بے یقینی کیفیت کا مظہر ہے۔ سوال یہ ہے کہ اگر ڈونلڈ رمزان فانو ہتھیاروں کے ٹھکانے سے واقف تھے تو پھر انہوں نے اقوام متحدہ کے اسلحہ انسپکٹروں کو ان کے مقام سے آگاہ کیوں نہ کیا۔ حالانکہ اقوام متحدہ اور آئی اے ای کے اسلحہ انسپکٹروں نے پہلے ہی اس امر کے خلاف شدید احتجاج کیا تھا کہ عراق کے اسلحہ کے بارے میں امریکہ اپنی انٹیلی جنس معلومات ہم سے شیئر نہیں کر رہا ہے۔

عراق کے کیمیکل اور بائیولوجیکل ہتھیاروں کے بارے میں دوسرا ذریعہ صدام حسین کا داماد حسین کامل تھا۔ کامل عراق سے 1995ء میں فرار ہوگیا تھا۔ اس نے امریکہ کو صدام حسین کے بائیولوجیکل ہتھیاروں کے بارے میں معلومات دیں اور کہا کہ 1991ء میں خلیج جنگ کے دوران عراق کے بائیولوجیکل ہتھیاروں کا پروگرام اتنا جدید تھا کہ جس کا کوئی تصور بھی نہیں کر سکتا۔ کامل 1996ء میں اچانک عراق واپس چلا گیا جہاں وہ پُراسرار حالت میں مارا گیا، صدر بش نے 17 اکتوبر 2002ء کو کامل کی فراہم کردہ معلومات کو توڑ مروڑ کر پیش کرتے ہوئے کہا کہ 1995ء میں عراق کی ملٹری انڈسٹریز کے سربراہ نے بتایا ہے کہ عراق کے پاس 30,000 لٹر سے زائد انتھراکس اور دیگر بائیولوجیکل ہتھیار ہیں۔ تاہم انسپکٹروں کا خیال ہے کہ عراق نے مذکورہ مقدار سے دوگنا یا چارگنا زائد انتھراکس تیار کی ہے۔ پاؤل نے بھی صدر بش کی طرح آدھا سچ اور آدھے جھوٹ کی آمیزش کرتے ہوئے کہا۔

عراق نے 4 ٹن سے زائد مہلک دوا وی ایکس تیار کی ہے۔ واضح رہے کہ انسانی جلد پر وی ایکس کا ایک قطرہ گرنے سے انسان کی چند لمحوں میں موت واقع ہو جاتی ہے۔ کولن پاؤل نے بھی مذکورہ معلومات کو صدام حسین کے مرحوم داماد کی جانب منسوب کیا۔ تاہم جس اہم پہلو کو صدر بش اور کولن پاؤل نے یکسر فراموش کر دیا وہ یہ کہ کامل نے یہ بھی کہا تھا خلیج جنگ کے بعد صدام حسین نے ان تمام ہتھیاروں کو ضائع کر دیا تھا"۔ نیوز ویک کے اس انکشاف کے بعد سی آئی اے کے ترجمان نے اس کی تردید کرتے ہوئے "غلط، بوگس، جھوٹ" قرار دیا۔ مگر دو دن بعد ہی "فیر" نامی جریدے نے کامل کا مذکورہ بیان جس کو اقوام متحدہ کے انسپکٹروں کی مدد سے حاصل کیا گیا تھا، من و عن شائع کر دیا۔ تاہم صدر بش اپنے اس بے بنیاد موقف پر سختی سے قائم رہے بعد ازاں عراق سے ملنے والے دو ٹرکوں کو بطور موبائل لیب، دنیا کے سامنے پیش کیا گیا۔ تاہم صدر بش دنیا کے سامنے ان ٹرکوں کو پیش کرتے ہوئے یہ بھول گئے کہ نہ تو ان ٹرکوں میں کیمیکل یا بائیولوجیکل ہتھیار برآمد ہوئے ہیں دوسری جانب ماہرین اسلحہ نے بھی اس خیال کو مسترد کر دیا کہ اس قسم کے ٹرکوں کو ان مقاصد کیلئے بنایا گیا ہے۔ مزید برآں ان ٹرکوں کی موجودگی اس امر کا نا کافی ثبوت ہے کہ ان میں ہتھیار رکھے گئے یا بنائے گئے۔ دوسری جانب یہ خاصی دلچسپ بات ہے کہ ہزاروں میل دور واقع امریکہ کو ایک ٹریلر سے خطرہ ہے۔ بعد ازاں ڈیفنس انٹیلی جنس ایجنسی، اسٹیٹ ڈیپارٹمنٹ کے اسلحہ انسپکٹر اور برطانوی ایجنسی کے ماہرین نے تصدیق کی کہ ان ٹریلروں کو ان ہی مقاصد کیلئے استعمال کیا گیا ہے۔ جیسا کہ عراق نے بیان کیا تھا۔ واضح رہے کہ عراق نے ان ٹرکوں کی موجودگی کے بارے میں کہا تھا کہ موسم کا حال جاننے والے غباروں کیلئے ہائیڈروجن تیار کی جاتی ہے اور یوں بالآخر صدر بش کا کیمیائی ہتھیاروں کا بہانہ بھی مبنی بر دروغ ثابت ہوا۔ تاہم بش کی اہمیت کو داد دینی چاہیے کہ جن امور کی نفی پورا میڈیا کرتا رہا۔ صدر بش لگاتار اور بار بار انہی امور کی بنیاد پر عراق

جنگ کا جواز فراہم کرتے رہے۔ اس سلسلے میں صدر بش نے تیسرا جھوٹ نیوکلیائی ہتھیاروں کی موجودگی کے متعلق بولا اس سلسلے میں 28 جنوری کو خطاب کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ

''برطانوی حکومت کے علم میں آیا ہے کہ صدام حسین نے حال ہی میں افریقہ سے یورینیم کی بہت بڑی مقدار حاصل کی ہے''۔

عراق پر حملے کا جواز تلاش کرتے ہوئے سی آئی اے نے جوزف سی ولسن جو صدام سے ملاقات کرنے والے آخری امریکی سفیر تھے کو افریقہ روانہ کر دیا۔ جوزف کے افریقہ اور عرب ممالک میں کئی دہائیوں پر مشتمل سفارتی روابط تھے جن کے ذریعے جلد ہی اس نے پتہ لگا لیا کہ یورینیم کی افریقہ سے خرید کی خبر غلط ہے۔ اس سلسلے میں جوزف نے سی آئی اے کو قواعد و ضوابط کے تحت یورینیم خریداری کے غیر حقیقی ہونے سے متعلق بتا دیا۔ تاہم وہ 28 جنوری کو صدر بش کی تقریر سن کر سناٹے میں آ گیا کہ جس میں انہوں نے کہا کہ عراق کی افریقہ سے یورینیم کی خریداری کے ثبوت ملے ہیں۔ وائٹ ہاؤس اور سی آئی اے نے رپورٹ کو مسخ کر کے عوام کے سامنے پیش کیا۔ تاہم صدر بش نے اس تقریر کے وقت اس پہلو کو بھلا دیا کہ جس قسم کی یورینیم کی خریداری کا عراق پر الزام لگایا جا رہا ہے۔ وہ تو عراق کے پاس پہلے ہی موجود ہے اور اس جیسی مزید یورینیم کی خریداری بھلا نیوکلیائی ہتھیاروں کی تیاری کا ثبوت کیونکر ہو سکتی ہے۔ ہتھیاروں کی تیاری کیلئے یورینیم کو جس عمل سے گزارا جائے گا اس کے لیے سینکڑوں گیس کے سنٹر فیوجز درکار ہونگے۔ ان سنٹری فیوجز سے خارج ہونے والی گیس حدت اور گاما شعاعیں مختلف الیکٹرونک آلات کی مدد سے بڑی آسانی سے تلاش کی جا سکتی ہیں۔ دوسری جانب 24 جولائی 2003ء کو نائب امریکی صدر ڈک چینی نے جنگ کی حمایت کرتے ہوئے کہا ہمیں اپنی انٹیلی جنس کی صلاحیتوں پر بھرپور اعتماد ہے۔ عراق کو اگر میزائل حاصل ہو گئے تو وہ بڑی آسانی سے نیوکلیائی ہتھیار بنا سکتا ہے۔ ڈک چینی کے عراق سے وابستہ خطرے میں سب سے دلچسپ پہلو تو یہ ہے کہ نیوکلیائی ہتھیار بنانے کیلئے کوئی بھی ملک اگر میزائل کے حصول میں کامیاب ہو جائے تو وہ ہتھیار بنا سکتا ہے۔ جبکہ بین الاقوامی ایٹمی ایجنسی کے انسپکٹروں نے جنگ سے چند ماہ قبل معائنہ کے بعد اعلان کیا تھا کہ عراق کے پاس ابھی وہ سہولیات اور میزائل ہرگز نہیں جو نیوکلیائی ہتھیار بنانے کیلئے ضروری ہیں۔ دوسری جانب ڈک چینی نے مذکورہ رپورٹ 6 ماہ قبل ہی تیار کر لی تھی بعد ازاں صدر بش نے المونیم...... کی موجودگی کو بھی یورینیم کی افزودگی پر مہر ثبت کرنے کیلئے استعمال کیا۔ حالانکہ المونیم کی ان ٹیوبس کی مدد سے یورینیم کی افزودگی ایک ناقابل عمل منصوبہ تھا۔ تاہم المونیم ٹیوب کی موجودگی سے امریکہ کافی عرصے تک عرق میں ایٹمی ہتھیاروں کی موجودگی کا ڈرامہ چلانے میں کامیاب رہا۔

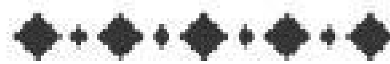
عراق پر حملہ کے سلسلے میں صدر بش نے جہاں ہتھیاروں کی موجودگی نیز القاعدہ سے تعلق کو بہانہ بنایا تھا۔ وہیں اس جنگ کو آسان اور ''حلوہ'' بھی قرار دیا تھا۔

13 فروری 2002ء کو عراق پر حملے سے عین قبل ڈونلڈ رمزفیلڈ کے نائب کین ایڈمین نے کہا تھا ''میں یقین رکھتا ہوں کہ حسین کی ملٹری قوت کو ختم کرنا اور عراق کو آزاد کروانا بہت آسان ہوگا۔ میں اس کے تین بہت آسان اور ٹھوس دلائل دیتا ہوں (1) پچھلی بار بھی عراق پر حملہ بہت آسان رہا تھا۔ (2) وہ بہت کمزور ہو گئے ہیں۔ (3) ہم بہت طاقتور ہو گئے ہیں۔

تاہم جنگ کے محض سات ماہ بعد صدر بش ان کی انتظامیہ جنگ کی موجودہ صورتحال اوراس کی موجودگی میں مستقبل کی صورت کا جائزہ لینے میں کامیاب ہوگئے۔ جنگ کا حال اور مستقبل صرف اور صرف امریکہ کیلئے مایوسی پر مبنی تھا، بڑھتا ہوا تشدد، نا قابل یقین صورتحال اور امریکی فوجیوں کی ڈیڈ باڈیز پر کسی بھی شخص کی فرسٹریشن کیلئے بہت تھا۔ ان تمام حالات کا انکشاف اس وقت ہوا جب عراق میں تعینات امریکی خاتون فوجی افسر نے ایک فلاحی تنظیم کو خط لکھا۔ خط میں اس نے کہا کہ یہ کہا جاتا ہے کہ ہماری افواج کے حوصلے بہت بلند ہیں میں آپ کو بتاتی ہوں یہ سب جھوٹ ہے ان کے حوصلے بہت پست ہیں۔ سپاہی زندگی سے نفرت کرنے لگے ہیں اتنی زیادہ نفرت کہ سمجھوتے کے بجائے خودکشی کرنا پسند کرتے ہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ صدر بش کو عراق جنگ کے آغاز میں رمزفیلڈ کے ڈاکٹرئن کی ناکامی کا اندازہ ہوگیا تھا۔ کیونکہ وائٹ ہاؤس کی خواہشات کے برعکس نہ تو عراقی عوام نے آزادی کے حصول کیلئے امریکی افواج کا ساتھ دیا نہ ہی ان کو خوش آمدید کہا گیا۔ الٹا امریکی فوجیوں کو فدائین کی جانب سے توقع سے زیادہ مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا۔ البتہ بش انتظامیہ نے محض دو واقعات کی بنیاد پر اپنی جھوٹی فتح کا اعلان کردیا۔ ان میں سے ایک تو صدام حسین کا مجسمہ گرانے کا عمل تھا۔ دوسری جارج بش کی وہ تقریر، جس میں انہوں نے فتح کا اعلان کیا تھا۔ صدر بش کو فتح کے اعلان کے چند دن بعد ہی جنگ میں صحیح معنوں میں اپنی پوزیشن کا احساس ہوگیا تھا کیونکہ جیسے وقت گزر رہا تھا۔ تشدد مار دھاڑ اور لوٹ کے واقعات میں اضافہ ہورہا تھا۔ اس انارکی نے یہ واضح کردیا تھا کہ بش انتظامیہ کے بعد از جنگ کا منصوبہ ناکامی سے دوچار ہے۔ سی این این کی رپورٹ کے مطابق یکم مئی سے 26 اگست تک امریکی فوجیوں کی ہلاکتوں کی تعداد 139 تھی۔ واضح رہے کہ یکم مئی وہ دن تھا جب صدر بش نے اپنی فتح کا اعلان کیا اور 24 مارچ تک ہلاکتوں کی تعداد بڑھ کر 341 ہوگئی اس قدر بڑی تعداد میں ہلاکتیں اس امر کی وضاحت کیلئے کافی ہیں کہ عراق جنگ ہرگز اتنی آسان نہ تھی۔ جتنا کہ اسے امریکہ سمجھ رہا تھا۔ اندازے کی یہی غلطی امریکہ کو لے بیٹھی۔ کیونکہ اپنے چوتھے جھوٹ کی بنیاد پر امریکہ نے پانچواں جھوٹ یہ بولا تھا کہ عراق کو دنیا کیلئے جمہوریت کا ایک نمونہ بنا دینگے۔ صدر بش نے 7 اکتوبر 2002ء کو کہا" اگر فوجی ایکشن ضروری ہوا تو امریکہ اور اس کے اتحادی عراق کو اپنی معیشت کی دوبارہ بحالی اور آزادی کی حفاظت میں مدد فراہم کرینگے تاکہ ایک امن پسند عراق دوسرے ممالک کے درمیان سر ابھار سکے اور آج اتنا عرصہ گزر جانے کے باوجود بھی نہ تو عراق میں جمہوریت کی بحالی کا عمل مکمل ہوسکا ہے نا ہی عراق جنگ اتنی آسان ثابت ہوئی ہے جیسا کہ صدر بش نے کیا تھا۔

یوں ہم کہہ سکتے ہیں کہ بش جونیئر نے ہم سے جھوٹ بولا۔ ہٹلر نے کہا تھا کہ جھوٹ کو اس طرح بولو لگاتار بولو کہ اس پر سچ کا گمان ہونے لگے، صدر بش اور پورے وائٹ ہاؤس نے بھی اسی مشہور مقولے پر عمل کرتے ہوئے جھوٹ بولا اور لگاتار بولا مگر وائے قسمت کہ حقائق ہیں کہ ہر طرف سے ہی سر اٹھا رہے ہیں اور بش کے فریب کا پردہ چاک ہورہا ہے۔

بشکریہ (ملیحہ ہاشمی)



جھوٹا بش۔ ہمارے بچوں کا قاتل

مسلم دشمنی میں سرتاپا غرق امریکی صدر بش'ان کے حواری ٹونی بلیئر بے شمار جلب کے مزدور حکمرانوں نے اسرائیلی مفادات کے تحفظ کی خاطر دشت عراق پر اپنے مکروہ پنجے گاڑے تو کون جانتا تھا کہ کرب وبلا کی سرزمین ایسی بے مثال مزاحمت کی تاریخ رقم کرے گی جو اپنی مثال آپ بن جائے۔ فرعون کے لہجہ میں بات کہنے کی عادی قصرابیض کے روسیاہ کے وہم وگمان میں بھی نہ ہوگا کہ انبیاء اور اولیاء کے مدفن کا اعزاز رکھنے والی دھرتی ایسے ایسے جری مجاہد پیدا کرے گی کہ جس کے سامنے دنیا کی سپر طاقت کی ساری سطوت' سارا غرور اور ساری قوت ششدر رہ جائے گی۔ شہر خاموشاں بنے بغداد میں ہنستے' مسکراتے' ناچتے' گاتے اور ٹھٹھہ اڑاتے ہوئے داخل ہونے والے امریکی ٹڈی دل کے دستے تو سمجھے تھے کہ کھیل ختم ہو چکا۔ عراق کے تیل کے چشمے اور عراقی عوام کے جسم ان کے قبضہ میں آ چکے ہیں۔ لیکن ان کا یہ دعویٰ خیال است محال است وجنوں است کی زندہ تصویر بن کر رہ گیا۔

ابتداء میں بندگان صحرائی نے دھیمے سروں میں مزاحمت کا آغاز کیا۔ وہ آندھی اور طوفان کی طرح نہ اٹھے بلکہ لمبی دوڑ کے گھوڑے کی طرح نپے تلے قدموں سے' چھوٹے چھوٹے مگر مضبوط قدم اٹھاتے ہوئے جو تحریک اٹھی وہ اتنی دھیمی تھی کہ قصرابیض کا فرعون اندازہ نہ لگا سکا اور فتح کا اعلان کر ڈالا۔ اصل جنگ تو اس کے بعد شروع ہوئی۔ جب شیعہ مسلمانوں کی بستیوں کے تحفظ کی خاطر سنی اور سنیوں کے مراکز کی پاسبانی کو مقتدر الصدر جیسا شیعہ نوجوان آگے بڑھا' اسلام کے ان دو بازوؤں نے مل کر باطل کے گرد شکنجہ کسا تو سارے کس بل نکل کر رہ گئے۔ بغداد سے نیویارک تک تابوتوں کی لائن لگی۔ زخمیوں سے ہسپتال بھر گئے۔ تابوت چھپائے جانے لگے' لیکن جب تقدیر تدبیر کو زیر کرنے پر تل جائے تو کون روک سکتا ہے۔ امریکی قوم میں سے ہی ایک نازک سی لڑکی لاشوں کی قطاریں دیکھ کر بے قابو ہوئی اور اس کے توسط سے امریکی قوم اپنے پیاروں کی لاشوں سے آشنا ہوئی۔ ایک کہرام ہی تو مچ کر رہ گیا۔

مضبوط قدموں پر کھڑا فرعون زلزلوں کی زد میں آ گیا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ تابوت اس کی قوت کے لئے قابل برداشت نہیں' اگر یہ لاشوں کے بکسے ایک تواتر سے آتے رہے اور ان کی تشہیر ہوتی رہی تو قصرابیض کا تمام تر تہور از خود تابوت کی نذر ہو جائے گا۔

یہ سب اس باعث تھا کہ بش جونیئر اپنی قوم سے آگاہ تھا۔ جانتا تھا کہ ٹھگوں کا ٹولہ لوٹ مار میں خوش تو رہتا ہے لیکن جب اپنی جان پر بن آئے جب اپنے پیاروں کو گولی چاٹنے آئے۔ ان کیلئے ناقابل برداشت ہو جاتا ہے۔ ویت نام کا تجربہ گواہ ہے کہ کس طرح امریکی قوم اپنی حکومت کے خلاف اٹھ کھڑی ہوئی اور بالآخر امریکی انتظامیہ کو میدان جنگ سے دم دبا کر بھاگنا پڑا اس انجام سے بچنے کی خاطر قصرابیض کے روسیاہ نے دو راستے اختیار کیے۔ ایک تو یہ کہ تابوتوں کی تصاویر پر قدغن لگا دی دوسرے یہ کہ عراق میں فرعونیت بڑھا دی۔ امریکی فوج کے ساتھ ساتھ مقامی طور پر

دستیاب ضمیر فروشوں کو شقاوت قلبی کی تربیت دے کر میدان کارزار میں اتارا اور ساتھ ساتھ عرب نژاد اسرائیلی یہودیوں کو میدان میں جھونکا جو انسانیت کی تذلیل کا تجربہ رکھتے تھے۔ اس شطانیت کا نتیجہ یہ نکلا کہ پورا عراق ٹارچر سیل میں بدل گیا۔ گرفتاری اور قید کے بجائے سرعام سڑکوں پر بستیوں میں لوگوں پر انسانیت سوز مظالم کا سلسلہ شروع کر دیا گیا۔ ایسا گھٹیا سلسلہ' جس کی مثال نہیں ملتی۔

امریکی گماشتے عراق میں انسانیت کا کس طرح سے مذاق اڑا رہے ہیں۔ اس کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ بی بی سی نیوز سے وابستہ صحافی رچرڈ گالین نے بغداد میں رہ کر جو کچھ دیکھا اسے اپنے قلم سے رقم کرتے ہوئے لکھا ہے کہ امریکی حمایت اور تربیت یافتہ عراق/ بغداد پولیس کے اہلکار شقاوت کی انتہا کو پہنچ گئے ہیں ان پر بغداد کے عام افراد اور شہریوں کو حراست اور گرفتاری کے بعد اچانک اور بہیمانہ موت کے الزامات تواتر کے ساتھ لگائے جا رہے ہیں۔ جن افراد کے خلاف جرائم کے الزامات موجود ہیں ان کی بھی ہلاکتیں ہو رہی ہیں۔ رچرڈ گالین کے بقول بغداد کے عام افراد کا کہنا ہے کہ یہ سب عراقی پولیس کا کام ہے جو امریکی چھتری کے تلے دھڑلے سے کام کر رہی ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ:

''بغداد کے ایک بہادر نوجوان نے ایک پریس کانفرنس کے ذریعے عراقی پولیس کے مظالم کو اُجاگر کیا ہے یہ نوجوان صحٰی عدنان صالح ہے۔ صحٰی عدنان صالح نے اپنی پریس کانفرنس میں صحافیوں کو بتایا کہ (جولائی) کے شروع میں اس کو اور اس کے 9 رشتہ داروں کو ان کے گھروں سے گرفتار کیا گیا۔ پھر انہیں عراقی پولیس کے ایک انٹروگیشن سینٹر میں لے جایا گیا جہاں سخت گیر پولیس افسران نے انہیں سخت تشدد کا نشانہ بنایا۔ آنکھوں پر پٹیاں باندھ کر ہمارے ہاتھ پشت کی طرف کر کے چرمی بیلٹوں سے کس دیئے گئے پھر انہوں نے ہمیں زدوکوب کرنا شروع کر دیا۔ وہ ہماری تکلیف اور چیخ و پکار سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ کوئی آدھے گھنٹے تک مسلسل تشدد سے ہم بے ہوش ہو گئے۔ تب انہوں نے مارنا پیٹنا بند کیا۔ جب ہمیں ہوش آیا تو ہم ایک فولادی کنٹینر میں بند تھے جس میں ہوا وغیرہ کا کوئی انتظام نہ تھا' یہ شام کا وقت تھا شاید عصر کے بعد کا۔ سانس لینے میں انتہائی دشواری ہو رہی تھی خود میرے سینے میں بھی شدید تکلیف تھی مار پیٹ کے نشانات اور کئی اعضاء پر خون جمنے کے نشانات بڑے واضح تھے۔ اس دوران میرے ساتھیوں میں سے 3 مر چکے تھے میں نے نقاہت کے باوجود ان کو ہلا جلا کر دیکھا تو وہ مر چکے تھے۔ جبکہ باقی بے ہوش تھے۔ صبح جب پولیس کمانڈوز اور گارڈ آئے تو میرے علاوہ 3 افراد زندہ تھے بقیہ پانچوں افراد تڑپ تڑپ کر ہلاک ہو چکے تھے۔

بی بی سی کے نامہ نگار مقیم بغداد رچرڈ گالین نے اس موقع پر زخمیوں سے بات چیت کی خواہش ظاہر کی۔ لیکن یہ درخواست حقارت کے ساتھ رد کر دی گئی اور صحافی کو کلاشنکوف کی نوک پر دور کر دیا گیا۔ ڈاکٹر نے رچرڈ کو بتایا کہ صحٰی کو جسمانی تشدد کے علاوہ الیکٹرک شاک بھی دیئے گئے جس سے اس کی زندگی کو سخت خطرات لاحق ہیں جبکہ صحٰی کے کئی اعضا پر خون جم چکا ہے۔

بغداد میں مقیم اکثر صحافیوں کی متفقہ رائے ہے کہ ایسے واقعات روزانہ وقوع پذیر ہو رہے ہیں اور ان واقعات میں امریکی فوج ملوث ہے۔ جو عام افراد پر مزاحمت کار ہونے یا ان کی حمایت کرنے کا الزام لگا کر انہیں گرفتار کرتے ہیں اور پھر تشدد کے ذریعے انہیں قتل کرتے ہیں۔ ایسے ہی کئی واقعات میں اہلکاروں نے عام شہریوں کو قتل کر کے ان کی لاشیں سڑکوں پر پھینک دی ہیں۔ جبکہ ان کی ہلاکت کا الزام مزاحمت کاروں پر لگایا جاتا ہے۔ رچرڈ گالین نے اپنی رپورٹ میں لکھا ہے کہ جب پولیس اہلکار نوجوان کو الزام لگا کر حراست میں لیتے ہیں تو وہ ایک عام شہری ہوتا ہے لیکن

جب اس کی لاش کسی گلی یا سڑک پر نظر آتی ہے تو وہ دہشت گرد یا مزاحمت کار قرار دیا گیا ہے۔ بعد میں تحقیق ہوتی ہے تو پتہ چلتا ہے کہ مقتول ایک عام شہری تھا۔ انٹروگیشن کے دوران پولیس اہلکار جنونی ہوتے ہیں وہ قیدیوں پر تشدد کے تمام حربے استعمال کرتے ہیں ان میں ڈنڈوں اور آہنی سلاخوں سے مارنا پیٹنا' ناخن کو پلاس کے ذریعے کھینچنا' جسم میں ڈرل کرنا' نازک اعضا پر کیمیکل لگانا' الیکٹرک شاک دینا اور آہنی کنٹینر میں بند کر دینا جیسے افعال شامل ہیں۔ ٹارچر کے حربوں میں سب سے بھیانک اور خطرناک حربہ ''ڈرل'' ہے جو عراقی پولیس سر عام استعمال کر رہی ہے لیکن پولیس اہلکار اس بات کا اہتمام کرتے ہیں کہ اس دوران کوئی فوٹو گرافر یا صحافی اپنے کیمروں کی آنکھ سے اس منظر کو قید نہ کر لے۔

24 جولائی کو بغداد میں درجنوں شہریوں نے نماز جمعہ کے بعد مقامی مسجد کے باہر عراقی شہریوں کے خلاف امریکی تربیت یافتہ پولیس اہلکاروں کی زیادتی' ظلم اور بہیمت کے خلاف ایک مظاہرہ کیا۔ اس مظاہرے پر پولیس کے مسلح افراد نے حملہ کر دیا ان مسلح اہلکاروں کے پاس بیٹری سے چلنے والی امریکی ساختہ ''ڈرل'' مشینیں اور پلاس موجود تھے۔ جن کے ذریعے انہوں نے کئی مظاہرین کو سخت لہولہان کر دیا پولیس اہلکاروں نے انتہا درجے کی بے رحمی اور شقاوت کا مظاہرہ کر کے کئی نمازیوں کے کولہوں' رانوں اور بازوؤں میں ڈرل مشین سے سوراخ کر دیئے جبکہ کئی نمازیوں اور نو عمر افراد کے ناخن پلاس سے کھینچ کر انہیں شدید زخمی کر دیا۔ اس موقع پر ایک مسلمان نوجوان نے اپنے چھوٹے سے کیمرے سے دو تصاویر اتار لیں۔

واضح رہے کہ ہیومن رائٹس واچ نے عراق میں پولیس کے تشدد کی تفصیلات میں تحریر کیا ہے کہ پولیس اہلکاروں کی طرف سے قید افراد کو اُلٹا لٹکا کر تشدد کرنا' تار کے ذریعے باندھ کر مارنا' الیکٹرک شاکس دینا اور حساس اعضائے جسمانی کو تکلیف پہنچانا ایک عام معمول بن چکا ہے۔ بغداد کی مسلم تنظیم' مسلم اسکالرز آرگنائزیشن نے بی بی سی کو ایک ویڈیو ٹیپ دی ہے جس میں قیدیوں کی کہنیوں' رانوں اور دیگر اعضاء پر ڈرل کرنے کے مناظر موجود تھے۔ اس ویڈیو کے بعض مناظر میں پولیس تشدد سے ہلاک افراد پر غسل کے دوران زخموں کی نشاندہی کی گئی تھی جن سے خون بہہ رہا تھا۔ کیمرے کی آنکھ نے صاف صاف دکھایا کہ اعضائے انسانی پر ڈرل کے نشانات موجود تھے۔

حقوق انسانی تنظیم کے ایک رہنما اور بغداد میں مقیم وکیل سلمان الفراجی نے زور دے کر کہا کہ معصوم شہریوں کی گرفتاری' تشدد اور خصوصاً ڈرل کا استعمال' عراقی پولیس کا عمومی رویہ بن چکا ہے۔ اس کے علاوہ ہاتھ پیروں کی ہڈیوں کا توڑنا' دانتوں کو توڑنا ایک عام سی بات ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ وزارت داخلہ کے اندرونی ذرائع کا کہنا ہے کہ وہی کچھ ہوگا جو پولیس چاہے گی کیونکہ یہ پولیس امریکی فوج کی تربیت کردہ ہے اس قسم کے کئی واقعات پر امریکی اور برطانوی اعلیٰ فوجی حکام کی توجہ مبذول کرانے کے باوجود کسی قسم کا کوئی مثبت ردعمل سامنے نہیں آیا ہے۔ جس سے بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ان کی پولیس کے تشدد پر آشیر واد کس حد تک پہنچ چکی ہے۔ عام افراد کے ساتھ پولیس کے بڑھتے ہوئے مظالم نے بغداد کے شہریوں کو برانگیختہ کرنا شروع کر دیا ہے۔ جس کی بنا پر مظاہروں کی تعداد بڑھ رہی ہے یہی وجہ ہے کہ عراقی پولیس اہلکار مزاحمت سے بچنے کیلئے ماسک لگا کر اپنی ذمہ داریاں انجام دیتے ہیں ان کو خطرہ ہے کہ اگر وہ کسی مرحلے پر پہچان لئے گئے تو ایک طرف مزاحمت کاروں کے ہاتھوں نہ بچ سکیں گے تو دوسری طرف وہ جن گرفتار شہریوں پر تشدد کرتے ہیں۔ ان کی ہلاکت یا معذوری کی صورت میں وہ یا ان کے اہل خانہ کو انتقام کا نشانہ نہ بنا سکیں۔

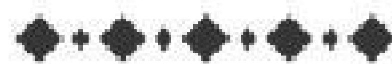
صلیبی فوج کی اس وحشیانہ پالیسی نے مہمیز کا کام کیا ہے اور عام عراقی شہری بھی مجاہدین کا معاون و مددگار ہو چکا ہے۔ جس کے سبب امریکیوں

کی ہلاکتوں میں اضافہ ہوتا جارہا ہے اور وہ وقت قریب ہے جب امریکیوں کے پاس فرار یا موت کے سوا کوئی راستہ نہیں ہوگا۔

اس وقت صورتحال یہ ہے کہ عراق میں تشدد اپنا منفی رنگ دکھا رہا ہے اور امریکہ کے اندر تابوتوں کی تصاویر کی اشاعت پر لگائی پابندی' ایک امریکی پروفیسر رالف بیگلیٹر کی طرف سے دائر کردہ مقدمہ میں امریکی عدالت سے مسترد ہو چکی ہے۔ بلکہ امریکی حکومت کو پابند بنا دیا گیا ہے کہ وہ مرنے والے امریکیوں کی آخری رسومات سمیت تمام تفصیلات سے سب کو آگاہ کرے' اس ذلت آمیز عدالتی شکست کے بعد پینٹا گون کو ایک ہفتہ میں 7 سو تصاویر جاری کرنا پڑیں جن کا تعلق افغانستان اور عراق میں مرنے والے فوجیوں کی آخری رسومات سے تھا۔ ان تصاویر میں آخری رسومات دکھائی گئی ہیں اور دکھایا گیا ہے کہ مرنے والے ان امریکی فوجیوں کو بینڈ باجے اور دعائیہ کلمات کے ساتھ امریکی بحریہ کے جہازوں سے سمندر برد کر دیا جاتا ہے۔ سینکڑوں فوجی جن کو لاپتہ ظاہر کیا گیا ہے۔ حقیقت میں سمندر کی مچھلیاں ان کے گوشت سے شکم سیری کر چکی ہیں یا ان کے لاشے فولادی صندقوں میں بند سمندر کی تہہ میں پڑے ہیں۔

یہ تصاویر منظر عام پر آتے ہی وہی ہوا جس کا وائٹ ہاؤس کو خوف تھا کہ جنگ میں مارے جانے والے امریکی فوجیوں کی مائیں متحد ہو کر میدان میں نکل آئیں۔ انہوں نے اتوار کے روز ٹیکساس میں بش کے فارم ہاؤس کے باہر احتجاجی مظاہرہ کیا۔ یہ خواتین نفرتیں بیچ رہی تھیں کہ بش نے جن ہتھیاروں اور مظالم کا بہانہ کر کے فوج عراق بھیجی وہ صاف جھوٹ تھا اب امریکی فوجیوں کو واپس بلایا جائے۔ ''ایک نے کہا میرا بیٹا کسمپرسی کی حالت میں مارا گیا' بش جنگ کے بارے میں جھوٹ بولتا ہے۔ اس احتجاجی مظاہرہ کے موقع پر بش کی سیکورٹی کونسل کے ایڈوائزر نے مظاہرین سے ملاقاتیں بھی کیں لیکن ان کا غصہ کم کرنے میں ناکام رہے۔ مظاہرین جن کی قیادت ایک مقتول فوجی کی ماں کر رہی تھی' ہمارے بچوں کا قاتل بش جھوٹا کے نعرے لگا رہی تھیں' مظاہرین کی قیادت کرنے والی خاتون شیہان نے بتایا کہ امریکی انٹیلی جنس نے ان مظاہرین کو ہراساں کیا اور دھمکی دی کہ اگر وہ باز نہ آئے تو ان کے اوپر گاڑیاں چڑھا دی جائیں گی۔ لیکن 20 سے زائد گاڑیوں میں بھر کر آنے والے مظاہرین پیچھے نہ ہٹے۔

بش قاتل کے نعرے لگانے والے امریکی فوجیوں کے ورثاء دراصل بارش کا پہلا قطرہ ہے۔ اب صرف عالم اسلام سے ہی نہیں نیویارک اور واشنگٹن سے بھی قاتل قاتل بش قاتل کے نعرے بلند ہونے لگے ہیں اور گزرتے ہوئے وقت کے ساتھ ان کی آواز بلند سے بلند تر ہوتی جارہی ہے اور وہ وقت دور نہیں جب زمین کے اس فرعون کو قصر ابیض بھی پناہ نہیں دے گا۔ اس کا تعاقب کرنے والے کوئی اور نہیں بلکہ ہلاک شدہ امریکیوں کی مائیں ہونگی۔



2020ء تک امریکا ٹوٹ سکتا ہے؟

امریکہ کی خفیہ ایجنسی سی آئی اے، دنیا کی سب سے بڑی انٹیلی جنس ایجنسی ہے۔ اس کے دو بڑے شعبہ ہیں۔ عمل (آپریشنز) اور تحقیق (ریسرچ)۔ آپریشنز ونگ دنیا بھر میں امریکا کا اثر ورسوخ قائم رکھتی ہے۔ یہ ونگ اثر ورسوخ قائم رکھنے کے لئے کسی بھی حد تک جا سکتی ہے۔ دنیا میں آپریشنز ونگ کے لگ بھگ 1200 خفیہ ایجنسی دفاتر اور 40 ہزار کارکن ہیں۔ یہ کارکن اور دفاتر دنیا بھر کے ممالک کی صورتحال پر نظر رکھتے ہیں۔ یہ امریکا کی بالادستی قائم رکھنے کے لئے ایسی حکومتیں بناتے ہیں جو امریکا کا حکم بجالاتی ہیں جو ان کے مفادات کی حفاظت کرتی ہیں۔ یہ حکومتوں کو گراتے محب وطن رہنماؤں کو بدنام کرتے' انہیں رشوت دینے یا پھر قتل کرنے کا کام بھی کرتی ہیں۔ یہ ونگ امریکا کی نظر میں اہم ممالک میں اپنی لابی اور رہنما بھی پیدا کرتی ہے۔ وہاں اپنی پسند کے بزنس مین' صنعتکار' سیاستدان' کھلاڑی اور رہنما بھی پیدا کرتی ہے اس کے برعکس ریسرچ ونگ کا کام دنیا میں ہونے والی تبدیلیوں پر نظر رکھنا اور مستقبل میں پیش آنے والے خطرات کا جائزہ لینا ہوتا ہے۔ اس ونگ نے اس کام کیلئے امریکا کے اندر اور امریکا کے باہر ہزاروں محقق' ماہرین اور تھنک ٹینکس کی خدمات حاصل کر رکھی ہیں۔ یہ لوگ تحقیق کے بعد اپنی اپنی رپورٹیں سی آئی اے ہیڈ کوارٹر بھجوادیتے ہیں۔ یہ رپورٹیں سی آئی اے کے سنٹرل ٹیبل پر جمع ہوتی ہیں بعدازاں ان کی بنیاد پر سی آئی اے کے اعلیٰ دماغ والے ایک سال' پانچ سال اور پندرہ سال کی پالیسیاں بناتے ہیں۔ سی آئی اے کی ریسرچ ونگ نے کچھ عرصہ پہلے "گلوبل ٹرینڈ 2020ء" کے نام سے ایک ایسی ہی رپورٹ تیار کی ہے اس رپورٹ میں یہ اندازہ لگایا گیا ہے کہ 2020ء تک دنیا کی صورتحال کیا ہوگی؟ اس رپورٹ میں 2020ء میں ہونے والے سیاسی' سماجی' اقتصادی اور مذہبی تبدیلیوں کی نشاندہی کی گئی' یہ رپورٹ پوری دنیا کیلئے چشم کشا ہے۔

"گلوبل ٹرینڈ 2020ء" کے دو حصے ہیں پہلے حصے کو ہم معاشی باب کہہ سکتے ہیں۔ اس باب کے مطابق 2020ء تک چین اور ہندوستان دنیا کی سب سے بڑی اقتصادی طاقت بن جائیں گے۔ آپ ان ممالک کی ترقی کا اندازہ یوں لگالیجئے کہ جس طرح مبصرین 19 ویں صدی کو جرمنی اور 20 ویں صدی کو امریکا کی صدی کہتے تھے بالکل اسی طرح 21 ویں صدی چین اور ہندوستان کی ہوگی۔ رپورٹ کے مطابق جاپان کو چین کی بڑھتی ہوئی اقتصادی طاقت سے بہت سی مشکلات پیش آئیں گی۔ جنوبی امریکا سے برازیل اور جنوب مشرقی ایشیاء سے انڈونیشیا بڑی طاقتیں بن کر ابھری ہیں۔ یورپ ایک بڑی مارکیٹ' واحد سنگل کرنسی' بہترین کارکن (ورک فورس) مضبوط جمہوری حکومتیں اور ایک بڑا تجارتی بلاک ہونے کی وجہ سے

ایک مضبوط طاقت بن کر سامنے آئے گا۔ اس کا نقصان امریکا کو ہوگا۔ لہٰذا امریکا کو ابھی سے اس خطرے کی پیش بندی کرنا ہوگی۔

گلوبل ٹرینڈ2020 رپورٹ کا دوسرا حصہ مسلمانوں اور اسلامی حکومتوں سے متعلق ہے۔ اس حصے میں انکشاف کیا گیا ہے کہ 2020 تک دنیا میں اسلامی ممالک کا اثر ورسوخ بڑھ جائیگا۔ اس کا بھی امکان ہے کہ ساری اسلامی دنیا یورپ کی طرح بلاک بنانے میں کامیاب ہو جائے۔ ان ''خطرناک اسلامی ممالک'' میں جنوب مشرقی ایشیاء' سنٹرل اور جنوبی یورپ کے ممالک شامل ہیں۔ موجودہ حالات میں یوں محسوس ہوتا ہے کہ آنے والے دور میں مسلمانوں کی آپس میں یکجہتی اور اتحاد بڑھنا شروع ہو جائیگا اور وہ فلسطین' چیچنیا' عراق' کشمیر اور جنوبی تھائی لینڈ میں جاری آزادی تحریکوں کی مدد کرنا شروع کر دینگے۔ اس رپورٹ میں یہ خدشہ بھی ظاہر کیا گیا ہے کہ 2020 تک اسلامی دہشت گردی ختم نہیں ہو سکے گی بلکہ اس میں اضافہ ہوگا اور القاعدہ کے طرز کی کئی نئی جماعتیں پیدا ہونگی جو امریکا کو چیلنج کریں گی' جن سے مستقبل میں امریکا کی سیاست کو خطرات پیش آئینگے۔ اس رپورٹ میں یہ خطرہ بھی ظاہر کیا گیا ہے کہ آنے والے 15 برسوں میں اسلامی دہشت گرد تنظیمیں جوہری' کیمیائی اور حیاتیاتی ہتھیار حاصل کر لیں گی جس کے نتیجہ میں امریکا اور یورپ کے کروڑوں لوگ ہلاک ہو سکتے ہیں۔ ان کے علاوہ مشرق وسطیٰ کے ممالک بھی خطرات کے باعث ایٹمی ہتھیاروں کے حصول کی دوڑ میں شریک ہو جائیں گے۔ 2020ء تک گیس اور تیل کی ضرورت میں 50 فیصد اضافہ ہو جائیگا۔ اب تک تیل اور گیس کے تمام بڑے ذخائر اسلامی دنیا کے پاس ہیں۔ یہ ذخائر آنے والے وقتوں میں مغربی دنیا بالخصوص امریکا کی اقتصادی زندگی کیلئے خطرہ بن سکتے ہیں۔ سی آئی اے کے گلوبل ٹرینڈ 2020ء رپورٹ میں مسلمانوں کے بارے میں ایک نئی خلافت کا نظریہ پیش کرتی ہے۔ اس خلافت میں دنیا کے تمام مسلمانوں' اسلامی ممالک اور اسلامی دہشت گرد تنظیمیں جمع ہو جائینگی اور مل کر مغربی ثقافت اور مغربی اقدار کیلئے چیلنج بن جائیں گی۔

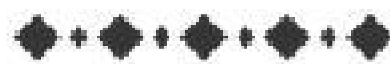
سی آئی اے کی اس رپورٹ کے آخر میں امریکی دانشوروں' ارباب بست وکشاد اور پالیسی سازوں کو بڑے دلچسپ مشورے دیئے گئے ہیں۔ انہیں بتایا گیا ہے کہ اگر امریکا 2020 کے خطرات سے بچنا چاہتا ہے؟ اگر وہ دنیا کو معاشی طور پر غلام رکھنا چاہتا ہے تو اسے چین اور ہندوستان کے معاملے میں چند اقدامات کرنے ہونگے۔ ان اقدامات میں امریکا کو سب سے پہلے ہندوستان کی معاشی مشینری کا تعاون کرنا چاہئے۔ امریکا کی اس معاونت کے نتیجہ میں چین کی انڈسٹری پر برے اثرات پڑینگے۔ جب ہندوستان معاشی طور پر چین سے آگے نکل جائے تو سنٹرل ایشیاء کے کسی ملک کو اس کے مقابلے میں کھڑا کر دیا جائے اور ہندوستان کے ساتھ بھی وہی کچھ کیا جائے جو چین کے ساتھ ہوگا۔ رہے ملائشیا اور انڈونیشیا جیسے اسلامی ممالک تو وہاں کسی نہ کسی طرح مذہبی منافرت پھیلا دی جائے۔ وہاں کے مسلمانوں کو تفرقہ بازی اور اختلافات کا شکار کر دیا جائے' ان حالات اور تفرقہ بازیوں کے نتیجہ میں ان ممالک کی ترقی بھی رک جائیگی یہ ممالک بھی ڈھلوان پر پیچھے کی طرف پھسلنا شروع کر دینگے۔

رپورٹ میں مشورہ دیا گیا ہے کہ اسلامی بنیاد پرستی مستقبل میں یورپ اور امریکا کیلئے انتہائی خطرناک ثابت ہوگی۔ لہٰذا اس کے تدارک کیلئے ابھی سے کوئی جامع پالیسی بنانی ہوگی۔ امریکا کو چاہئے کہ وہ تمام اسلامی ممالک کو لبرل بنائے' ان ممالک میں ڈسکو کلب' شراب خانے اور جوئے خانے کھولے جائیں۔ مخلوط تعلیم کو قانونی شکل دی جائے۔ تمام سرکاری اور غیر سرکاری دفتروں میں خواتین کی تعداد بڑھائی جائے۔ مانع حمل ادویہ کا استعمال بڑھایا جائے۔ بچوں کو اسکولوں میں جنسی تعلیم دی جائے۔ ریڈیو اور ٹیلی ویژن پر ایسے ڈرامے اور پروگرام دکھائے جائیں جن میں جنسی

اشارے اور لبرل ماحول ہو۔ ٹیلی ویژن پر شراب اور سگریٹ کے استعمال کے اشتہار دکھائے جائیں۔ وہ تمام ممالک جن کے درمیان اختلافات پائے جاتے ہیں اور ان اختلافات کے نتیجہ میں اسلامی ممالک میں جہاد کی سوچ پروان چڑھ رہی ہے ان ممالک کے درمیان اتحاد و صلح جوئی پیدا کی جائے' انگریزی کو تمام اسلامی ممالک میں ذریعہ اظہار بنا دیا جائے۔ جہادی تنظیموں' مدرسوں اور جماعتوں پر پابندی لگادی جائے۔ نقاب' حجاب اور داڑھی اور نماز کی حوصلہ شکنی کی جائے۔ مذہب کو ریاست کے بجائے پرائیویٹ معاملہ بنا دیا جائے۔ اسلامی دنیا کے پڑھے لکھے نوجوان کو یورپ اور امریکا منتقلی کی حوصلہ شکنی کی جائے۔ اسلامی دنیا میں ایسے دانشور' اخبارات اور ٹیلی ویژن چینل پروان چڑھائے جائیں جو ان ممالک کے عوام کو احساس کمتری کا شکار بنادیں۔ جو اپنے ممالک کے شہریوں کے دل و دماغ میں یہ بات راسخ کر دیں کہ ہم یورپ اور امریکا سے پیچھے ہیں اور اگر یورپ اور امریکا کی زندگی اور اصول نہ اپنائے گئے تو ہم ختم ہو جائیں گے وغیرہ وغیرہ۔ سی آئی اے کی اس رپورٹ میں امریکا کو مشورہ دیا گیا ہے کہ اگر امریکا نے ان معاملات پر فوری توجہ نہ دی تو 2020ء وہ سال ثابت ہوگا جس کے بعد امریکا کا عروج زوال بن جائیگا۔ امریکا سوویت یونین کی طرح ٹوٹ کر بکھر جائیگا۔

اگر ہم تھوڑا سا بھی غور فکر کریں تو ہمیں محسوس ہوگا کہ امریکا گلوبل ٹرینڈ 2020ء کی خدمات کی ابھی سے پیش بندی کر چکا ہے۔ اس نے ہندوستان کو صنعتی تعاون دینا شروع کر دیا ہے۔ ہندوستان کی صنعتی پیداوار میں پچھلے دو برسوں میں چار گنا اضافہ ہوا۔ یہ اضافہ امریکا کی مہربانی کا نتیجہ ہے۔ انڈونیشیا اور ملائشیا میں اسلامی نشاۃ ثانیہ کے نام پر مذہبی منافرت پھیلانے کا سلسلہ شروع ہو چکا ہے یورپ کے وہ تمام ممالک جن میں اسلامی تعلیمات اور اسلامی فکر موجود ہے انہیں یورپی یونین کا حصہ بنا دیا گیا ہے اور وہاں لبرل ازم کے نام پر کھیل شروع ہو چکا ہے جو سنٹرل اور مغربی یورپ میں پچاس برسوں سے کھیلا جا رہا ہے۔ جدید تعلیم اور تعاون کا بہانہ بنا کر مدرسوں کا ڈیٹا جمع کیا جا رہا ہے۔ مدرسوں کی نظریاتی اساس کو کمزور کرنے کا منصوبہ بنایا جا رہا ہے۔ ان سے جہادی اور اسلامی اتحاد پر مبنی آیات اور احادیث خارج کی جا رہی ہیں۔ تمام اسلامی ممالک میں کیبل اور ٹیلی ویژن چینلز کے ذریعہ فحاشی اور عریانی کو پروان چڑھایا جا رہا ہے۔ امریکا 2020ء آنے سے پہلے اسلامی دنیا کو نابود کرنا چاہتا ہے۔

بشکریہ (سلیم جاوید چودھری)



دنیا میں امریکی فوجی مداخلتیں

دہشت گردی کے نام پر جنگ لڑنے والے امریکہ نے دنیا بھر میں اپنی مرضی کی حکومتیں قائم کرنے اور ان ممالک کے قدرتی وسائل سے فائدہ اٹھانے (لوٹ مار) کے لئے ایک طویل منصوبہ بندی کر رکھی ہے۔ اس منصوبے پر 1890ء سے باضابطہ عمل شروع ہوا اور اب تک دنیا کے ایک کونے سے لے کر دوسرے کونے تک یعنی سارے براعظموں میں (113 برس میں) 137 مرتبہ وہ براہ راست فوجی مداخلت کر چکا ہے۔ کئی ممالک کے خلاف بار بار فوجی مداخلت کی گئی۔ چین' فلپائن' نکاراگوا' ڈومینکن ریپبلک' کیوبا اور ہیٹی سمیت بعض ممالک پر طویل فوجی قبضہ برقرار رکھا۔ اس قبضے کے بعد وہاں اپنی مرضی کی انتظامیہ مسلط کی گئی اور وہاں کے لوگوں کے تمام انسانی اور معاشی حقوق تہس نہس کر دیئے۔

جن ممالک میں تواتر اور وقفوں کے ساتھ فوجی حملے اور مداخلتیں کی گئیں ان میں ویتنام' پانامہ' میکسیکو' ایران' یورپ اور لاطینی امریکہ کے کئی ملک شامل ہیں۔ امریکہ اس وقت چھوٹے ممالک خاص طور پر مسلمان ممالک کے ایٹمی صلاحیت حاصل کرنے کے خلاف سخت دھمکی آمیز مداخلت کر رہا ہے اور اسے ایٹمی ہتھیاروں کے پھیلاؤ سے سخت تشویش اور فکر لاحق ہے حالانکہ عملی اور تاریخی اعتبار سے امریکہ وہ پہلا اور دوسرا ملک ہے جس نے دوسری جنگ عظیم کے دوران دوسرے ممالک پر اپنی دھاک بٹھانے کے لئے پہلا اور آخری ایٹم بم جاپان کے دو شہروں ہیروشیما اور ناگاساکی پر پھینکا جس نے لاکھوں انسان ہلاک کر دیئے اور مزید لاکھوں اپاہج اور انسانی افعال کے لئے ناکارہ بنا دیئے۔ امریکا نے پہلا ایٹم اور ہائیڈروجن بم بنایا اور ابتداء ہی میں استعمال بھی کر ڈالا۔ اس کے بعد ایٹمی طاقت بننے والے ممالک برطانیہ' فرانس' روس' چین' بھارت اور پاکستان نے نہ تو ایٹم بم استعمال کیا اور نہ کسی کو اس کے استعمال کی دھمکی دی۔ مشرق وسطٰی میں امریکہ کی ناجائز اولاد اسرائیل نے ایٹم بم کا کھلا تجربہ نہیں کیا لیکن وہ ایٹمی طاقت ہے اور اس کے پاس امریکہ کی دی ہوئی ٹیکنالوجی سمیت 200 کے قریب ایٹم بم بتائے جاتے ہیں۔ دوسرے معنوں میں صرف امریکہ ہی ایسا ملک ہے جس نے نہ صرف ایٹم بم کا استعمال کر کے لاکھوں بے گناہ اور نہتے شہری ہلاک کر دیئے بلکہ اس نے مختلف اوقات میں مختلف ممالک کو ایٹم بم پھینکنے کی دھمکیاں بھی دیں۔ ان ممالک میں ایران' مصر' روس' ویتنام اور یوگوسلاویہ شامل ہیں۔

امریکہ نے ایٹم بم تیار کر لینے کے فوراً بعد ہیروشیما اور ناگاساکی پر یہ ایٹم بم گرائے اور چند سال بعد 1947ء میں یوراگوئے پر ایٹمی حملہ کی دھمکی دی اور طاقت دکھانے کے لئے جنگی طیاروں کی پروازیں کیں۔ 1948ء میں ایران میں ایٹم بم گرانے کی دھمکی دیتے ہوئے روس سے کہا کہ وہ شمالی ایران سے اپنی فوجیں نکال لے۔ 1948ء میں ہی یوگوسلاویہ کو بھی ایٹمی حملے کی دھمکی دی جب اس نے ایک امریکی جنگی ہوائی جہاز کو حدود کی خلاف ورزی کرنے پر مار گرایا تھا۔

1948ء میں ہی امریکہ نے جرمنی کے خلاف ایٹمی بم گرانے کی دھمکی دیتے ہوئے اپنے جنگی طیارے برلن کے ہوائی اڈوں پر چوکس کر دیئے۔ 1954ء میں ویتنام اور 1956ء میں مصر اور 1958ء میں عراق اور چین کو ایٹمی حملوں کی دھمکیاں دی گئیں۔ 1962ء میں صدر کینیڈی کے دور میں ایک میزائل بحران پر امریکہ نے کیوبا کا محاصرہ کیا اور روس اور کیوبا کے خلاف ایٹم بم استعمال کرنے کی دھمکی دی تو جواب میں روس نے بھی اپنے ایٹمی بٹن آن کر دیئے یہ وہ موقع تھا کہ امریکہ کی دھمکی کے بعد دنیا پہلی ایٹمی جنگ کے دہانے پر پہنچ گئی تھی۔ روس اور امریکہ کے درمیان ایٹمی جنگ کا خطرہ اتنا شدید ہوگیا تھا کہ دنیا بھر کے لوگوں نے دعائیں مانگنا شروع کر دی تھیں۔ بعض امریکی اور دنیا بھر کے کئی دانشوروں کا کہنا ہے کہ امریکہ چونکہ بنیادی طور پر بزدل ہے اس لئے جب اسے روس کے جوابی حملے کا یقین ہوگیا تو اس نے محاصرہ ختم کرنے کا اعلان کر دیا۔ ایک دانشور کا کہنا ہے کہ امریکہ بزدل ہونے کے باوجود طاقت کے گھمنڈ میں دوسروں کو دھمکیاں دینے کا عادی ہے اور اس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ کمزور دھمکیوں سے ڈر جائے گا اور اس کا مقصد پورا ہو جائے گا لیکن جب کوئی دھمکیوں کا اثر نہ لے تو وہ اکثر اوقات پسپائی اختیار کر لیتا ہے۔

ایٹم بم گرانے کی دھمکیوں کا سلسلہ یہیں ختم نہیں ہوگیا 1993ء میں امریکہ نے مشرق وسطیٰ میں ایٹم بم استعمال کرنے کی دھمکی دی اور دنیا بھر میں اپنی فوجوں کو ہائی الرٹ کر دیا۔

اس کے علاوہ امریکہ نے دنیا کے ستر کے قریب ممالک اور علاقوں میں اپنی بحری اور ہوائی افواج سے براہ راست حملے کئے بعض ممالک پر تو طویل عرصہ تک فوجی قبضہ رکھا اور جب ان ممالک کے عوام امریکی فوجوں کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے تو اس نے اپنی فوجیں وہاں سے نکالیں لیکن کئی اہم مقامات پر بنائے گئے فوجی اڈے ابھی تک نہیں چھوڑے جہاں سے وہ اس علاقے میں سازشیں اور خفیہ مداخلت جاری رکھے ہوئے ہے۔ یہ حقیقت اب اظہر من الشمس ہو چکی ہے کہ دنیا کے مختلف حصوں میں جو شورش، خانہ جنگیاں اور بدامنی کے واقعات ہوتے ہیں ان کے پیچھے امریکہ کا ہاتھ ہوتا ہے اسی طرح وہ حکومتوں کے خلاف لوگوں کو اکسانے کے لئے پیسہ، ہتھیار اور حمایت فراہم کرتا ہے اور حکومتوں کو بلیک میل کر کے ان کے ہاتھ بھاری قیمت پر میزائل، طیارے، اسلحہ اور گولہ بارود فروخت کرتا ہے۔

امریکہ نے سب سے پہلی فوجی مداخلت مغربی ڈکوٹا میں 1890ء میں کی اور امریکی فوجیوں نے 300 لکوٹا انڈین وونڈڈ ڈکی کے علاقے میں ہلاک کر دیئے۔ اسی سال اس نے ارجنٹائن میں فوجیں اتار دیں۔ 1891ء میں چلی اور ہیٹی میں فوج بھیجی۔ 1892ء میں اڈاہو میں چاندی کی کانوں کے مزدوروں کی ہڑتال ختم کرنے کے لئے فوجی کاروائی کی۔ 1893ء میں امریکہ نے بحری اور بری فوج کی کاروائی کے ذریعے ریاست ہوائی پر قبضہ کر لیا اور وہاں کی آزاد حکومت کو ختم کر کے ہوائی کو پچاسویں ریاست کے طور پر امریکہ میں شامل کر لیا۔

1894ء میں نکاراگوا' چین اور کوریا امریکی فوجی مداخلت کا نشانہ بنے اور 1895ء میں پاناما میں امریکی فوجیں داخل کی گئیں۔ 1894ء میں امریکی فوجیں دوبارہ نکاراگوا میں داخل ہوئیں اور اس سال دوبارہ چین کے خلاف فوجی کاروائی کی گئی جو تین سال جاری رہی۔ 1898ء میں امریکی فوجوں نے سپین سے کاروائی کرکے فلپائن پر فوجی حملہ کرتے ہوئے اس پر قبضہ کرلیا اور چھ لاکھ سے زیادہ فلپینی باشندے ہلاک کردیئے۔ غیر ملکی فوجی مداخلت کے دوران اتنی بڑی تعداد میں بے گناہ شہریوں کی یہ پہلی ہلاکت تھی۔ فلپائن پر امریکی فوجوں کا قبضہ 13 سال تک جاری رہا۔ 1898ء میں ہی امریکہ نے سپین سے پھر کاروائی کرتے ہوئے کیوبا پر حملہ کیا اور 1902ء تک قابض رہا اب بھی کیوبا کے سمندر میں اس کا بحری اڈہ موجود ہے جہاں سے وقتاً فوقتاً کاروائی کی کوشش ہوتی رہتی ہے۔

1898ء ہی میں امریکہ نے پیورٹو ریکو' گوان' مینوسوٹا اور نکاراگوا کے خلاف فوجی کاروائی کی۔ پورٹو ریکو مینوسوٹو اور گوان پر قبضہ کرلیا جو ابھی تک جاری ہے اور یہ مقامات امریکی اڈوں کے طور پر استعمال ہو رہے ہیں۔ انیسویں صدی کے آخری سال 1899ء میں امریکی فوجوں نے سموا نکاراگوا اور اڈاہو پر حملہ کیا۔ بیسویں صدی کے پہلے سال 1901ء میں امریکی فوجیں اوکلاہاما میں بھیجی گئیں اور پانامہ پر قبضہ کیا جو 1914ء تک جاری رہا' اس دوران 1903ء میں پاناما کو کولمبیا سے علیٰحدہ کیا گیا اور 1914ء اسے سینٹرل زون میں شامل کیا گیا اس کے بعد امریکہ نے پے در پے دنیا کے مختلف ممالک پر فوجی حملے کئے مسلسل فوجی کاروائیاں کیں اور دوسری جنگ عظیم تک کئی ممالک پر طویل فوجی قبضہ جاری رکھا۔ کئی علاقوں پر بار بار حملے کئے گئے 1914ء سے 1918ء تک میکسیکو میں لگاتار فوجی کاروائیاں کی گئیں۔ 1914ء سے 1918ء تک میکسیکو مسلسل فوجی مداخلت کا شکار رہا اور 1914ء سے 1934ء تک ہیٹی پر 20 سالہ امریکی قبضہ رہا۔ 1916ء سے 1924ء (8 سال) ڈومینکن ریپبلک امریکی فوجی قبضہ میں رہا اور 1917ء سے 1933ء تک امریکی فوج کیوبا پر قبضہ کرکے وہاں دندناتی رہی اور اس کی معاشی وسائل کی لوٹ کھسوٹ کرتی رہی۔ 1917ء اور 1918ء میں پہلی جنگ عظیم کے دوران امریکہ نے ڈیڑھ سال تک جرمنی کے خلاف جنگ جاری رکھی۔ 1918ء سے 1922ء روس میں پانچ مرتبہ فوج اتاری۔ 1919ء میں پانامہ' ہنڈوراس اور یوگوسلاویہ کے خلاف فوجی کاروائی کی اور 1920ء اور 1921ء میں گوئٹے مالا اور مغربی جینیا اور 1922ء میں ترکی اور چین کی باری آئی۔ چین کے خلاف امریکی فوجی مداخلت پانچ سال تک جاری رہی۔ 1927ء سے 1934ء تک امریکہ کی فوجوں نے چین کے کئی علاقوں پر قبضہ کرلیا اور یہ کاروائی سات برس تک جاری رہی۔ 1941ء سے 1945ء تک دوسری جنگ عظیم کے دوران امریکہ نے فوجی مداخلت کی اور یورپ پر اپنی دھاک بٹھانے کے لئے اٹلی' ہوائی' جاپان اور جرمنی کے ساتھ تین سال تک جنگ کی اور پہلی مرتبہ جاپان کے دو شہروں ہیروشیما اور ناگاساکی پر ایٹم بم گرائے۔ اس میں امریکہ نے لاکھوں جاپانی ہلاک کردیئے۔ نہتے شہری اور بے گناہ لوگ جن میں بچے' عورتیں' جوان اور بوڑھے شامل تھے ہلاکت کے علاوہ معذور ہوگئے اور ایسی بیماریوں میں مبتلا ہوگئے گویا زندہ درگور ہوگئے۔ یہ انسانی تاریخ کی سب سے بڑی دہشت گردی تھی جس میں ایٹمی اسلحہ استعمال کیا گیا اور یہ امریکہ نے کیا۔

جنگ عظیم دوم کے بعد امریکہ نے اسی پر بس نہیں کیا بلکہ اس کے بعد مسلسل ہر سال مشرق سے مغرب تک تمام براعظم امریکی فوجی کاروائیوں کی زد میں رہے۔ جن ممالک کے خلاف پہلی بار یا دوسری بار بھی کارروائی کی گئی ان میں ایران' یوگوسلاویہ' یوراگوئے' یونان' جرمنی' چین' فلپائن'

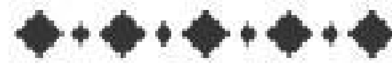
یوکرائن' پورٹیریکو' کوریا' ایران' گوئٹے مالا' مصر' لبنان' عراق' پانامہ' لاؤس' کیوبا' انڈونیشیا' ڈومینکن ریپبلک' کمبوڈیا' اومان (مسقط)' جنوبی ڈکوٹا' چلی' انگولا' لیبیا' ایلسلیوڈیڈار' لبنان' گرینیڈا' بولیویا' ورجن جزائر' لائبیریا' سعودی عرب' کویت' صومالیہ' بوسنیا' زائرے (کانگو)' البانیہ' سوڈان اور یمن شامل ہیں۔

بیسویں صدی کے آخر میں امریکہ نے نائن الیون کو بہانہ بنا کر افغانستان اور عراق پر حملہ کر دیا اور اب تک ان پر نہ صرف قابض ہے بلکہ لاکھوں نہتے' بے گناہ اور معصوم شہریوں کو ہلاک کر چکا ہے۔ امریکہ کا دعویٰ یہ ہے کہ وہ دہشت گردی کے خلاف جنگ کر رہا ہے لیکن امریکہ میں اب امریکی عوام' دانشوروں' صحافیوں اور سب سے بڑھ کر سیاستدانوں کو یہ یقین ہونے لگا ہے کہ امریکی فوجی کارروائیوں کا کوئی جواز نہیں ہے اور امریکہ کے نصیب میں سوائے نفرت' بدنامی اور قتل عام کرنے والے ملک کی شہرت کے کچھ نہیں آ رہا ہے۔ امریکی لوگ اب مطالبہ کرنے لگے ہیں کہ دنیا بھر میں امریکی مفادات کے نام پر جاری فوجی کارروائیوں کا خاتمہ کیا جائے اور امریکی فوجیں افغانستان اور عراق سمیت ہر جگہ سے واپس بلائی جائیں۔ گزشتہ 113 برس میں امریکہ نے مختلف ممالک میں 137 فوجی مداخلتیں یعنی حملے کیے اور ایک کروڑ سے زیادہ بے گناہ لوگوں کو ہلاک کیا اس ساری صورتحال کا جائزہ لینے سے یہ حقیقت عیاں ہو جاتی ہے کہ دنیا میں بدامنی اور دہشت گردی سب سے زیادہ امریکہ نے پھیلائی' بدامنی پھیلانے کے لئے دہشت گردوں کی حوصلہ افزائی کی اور اپنے مقاصد کے لئے ان لوگوں کو جمہوری حکومتوں کے خلاف استعمال کیا۔

امریکہ مختلف ممالک کے دہشت گردوں کو منتخب حکومتوں کا تختہ الٹنے کے لئے حمایت فراہم کرنے کے علاوہ انہیں تسلیم بھی کر لیتا ہے۔ اب یہ بات ڈھکی چھپی نہیں رہی۔ ہر تین برس کے بعد (یعنی ہر سال پچھلے تین برس) کی جو خفیہ دستاویزات امریکہ عام کرتا ہے ان میں ہر بات کھل کر سامنے آ گئی ہے۔ اسے امریکی حکومت اپنے عوام کا منہ بند کرنے کے لئے امریکی عوام کو بیرونی حملوں سے بچانے میں مدد دینے والے قرار دے کر جواز پیدا کرتی ہے لیکن چونکہ ہر چیز کی ایک حد ہوتی ہے امریکہ بھی اپنی تمام ناجائز مداخلتوں' دھمکیوں اور کارروائیوں کی تمام حدود پھلانگ چکا ہے اور دوربین لوگوں کے خیال میں اب قدرت کا اپنا عمل شروع ہو چکا ہے اور دنیا کو 113 سال تک اپنی دھمال پر نچانے والا امریکہ اب قطرینہ اور ریٹا جیسے ہولناک طوفانوں کی ہواؤں اور سمندری پانی کی دھمال پر ہر قسم کے ''رقص'' بھول گیا ہے۔ دنیا بھر کو دھمکیاں دینے والے جارج بش نے سمندری طوفان کا مقابلہ کرنے میں ناکامی کا اعتراف کرتے ہوئے اس کی ذمہ داری قبول کر لی ہے گویا اس نے تسلیم کر لیا ہے کہ وہ قدرتی نظام کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ جارج بش اور امریکی محکمہ دفاع سی آئی اے اور ایم آئی سی کو معلوم ہونا چاہئے کہ یہ انسان کی خام خیالی اور شیطان کا بہکاوا ہے کہ وہ بہت طاقتور ہے اور اپنی دانش سے قدرت کا مقابلہ کر سکتا ہے۔ اس خالق کائنات نے ایک نظام وضع کر رکھا ہے جس میں ذرا برابر بھی جھول نہیں ہے۔ قرآن کریم میں اسی خالق کائنات کا ارشاد ہے کہ جب انسان شیطان کے بہکاوے میں آ کر غلط راستہ اختیار کر لیتا ہے تو ہم اس سے منہ موڑ لیتے ہیں اور اسے غلط راستے پر آزاد چھوڑ دیتے ہیں لیکن جب وہ اپنی حدود عبور کرتا ہے تو قدرت اسے پکڑ لیتی ہے اور پھر اسے کوئی چھڑا نہیں سکتا۔ سوویت یونین بھی ایک زمانہ میں مادر پدر آزاد ہو کر آئے دن فوجی مداخلت کرتا تھا اور مشہور تھا کہ جب سوویت فوجیں آ جاتیں تو انہیں کوئی نکال نہیں سکتا لیکن دنیا نے دیکھا کہ نہ صرف یوگوسلاویہ' ہنگری اور

افغانستان وغیرہ سے روسی فوجیں ذلیل وخوار ہو کر نکلیں بلکہ خود سوویت یونین بھی صفحۂ ہستی سے مٹ چکا ہے۔ قرآن کریم میں احکام خداوندی اس بات کے شاہد ہیں کہ جب قوموں نے اپنی حدود عبور کیں تو قدرت نے انہیں کبھی طوفان نوح' کبھی تیز ہواؤں کے ذریعے کنکروں اور ریت کی بارش اور کبھی بستیوں کو الٹ پلٹ کر اور کبھی فرعون اور اس کے لشکر کو سمندر میں غرق کر کے آنے والوں کے لئے عبرت بنا دیا اور انہیں سبق دیا کہ ان تباہیوں اور قدرت کی سزاؤں سے عبرت پکڑو اور اللہ کے بتائے ہوئے سیدھے راستے پر آ جاؤ ورنہ تمہارا بھی نشان باقی نہیں رہے گا۔ قطرینہ کے بعد اب ریٹا طوفان 250 کلومیٹر فی گھنٹہ سے زیادہ کی رفتار سے فلوریڈا اور جارج بش کے آبائی علاقے ٹیکساس کی جانب بڑھ رہا ہے۔ ان سطور کی اشاعت تک یہ نیا طوفان ٹیکساس کو اپنی تباہ کاری کا ہدف بنا چکا ہوگا جہاں کروڑوں لوگ' کارخانے اور تیل کی 22 بڑی ریفائنریاں بھی ہیں کیا قطرینہ اور ریٹا طوفان نوح کی طرح وارننگ نہیں ہیں؟

بشکریہ (شاہد سلیم)



عراق سٹڈی گروپ' بش اور عراق

چھ دسمبر 2006ء بروز بدھ' عراق سٹڈی گروپ نے آخر کار اپنی رپورٹ صدر امریکا جارج بش کو پیش کر دی۔ یوں معلوم ہوتا ہے صدر جارج ڈبلیو بش کو مشورہ کی ضرورت محسوس ہو رہی ہے۔ عراق سٹڈی گروپ ''یونائیٹڈ سٹیٹس انسٹیٹیوٹ آف پیس'' نامی ادارے کا تشکیل کردہ اور اس کا حصہ ہے۔ یہ بلا منافع کام کرنے والا فلاحی ادارہ ہے جسے امریکی حکومت فنڈز فراہم کرتی ہے اور بالواسطہ طور پر اس کا کنٹرول صدر کے پاس ہوتا ہے۔ صدر ہی اس ادارے کے پندرہ رکنی بورڈ آف ڈائریکٹر کے ارکان مقرر کرتا ہے۔ یونائیٹڈ سٹیٹس انسٹیٹیوٹ آف پیس کو عام طور پر غیر جانبدار یا وہ جماعتی نقطہ نظر کا حامل ادارہ بتایا جاتا ہے۔ وہ جماعتی حوالے کی وجہ سے تمام بورڈ ممبران کی تقرری صدر کرتا ہے اور اس ادارے نے بالواسطہ بیس برسوں میں بہت سی علمی اور تحقیقاتی رپورٹوں کی اشاعت ممکن بنائی ہے۔ اس قسم کی پبلک فاؤنڈیشن یا تھنک ٹینک ضروری معلومات' آئیڈیاز اور پالیسیوں پر کام کرتی ہیں اور پھر رائے عامہ ہموار کرنے کیلئے انہیں سرگرمی سے عام کرتی ہیں۔

عراقی سٹڈی گروپ کی اس رپورٹ کے پیچھے عراق میں روز بروز امریکی فوج کے تنہا ہو جانے اور امریکی وزارت خارجہ کے حکام کو اس حقیقت کا سامنا کرنے پر تیار کرنے کا مقصد کارفرما ہے۔ اس رپورٹ کے ابتدائی الفاظ ''عراق میں موت اور تنہائی کی کیفیت'' خود اس رپورٹ کے مرکزی خیال کی وضاحت کرتے ہیں۔ اس رپورٹ کا مقصد عراقی عوام میں یا عراق میں اتحادی افواج کے درمیان اتفاق سے زیادہ خود امریکا کے سیاسی حکام کے درمیان عراق کے حوالے سے پائے جانے والے اختلافات کا حل ڈھونڈنا ہے۔ اس رپورٹ میں اسرائیل کو عراق کے معاملے کیساتھ جوڑ کر پیش کیا گیا۔ رپورٹ اس حوالے سے کہتی ہے کہ ''مشرق وسطیٰ میں امریکا اپنے مقاصد اس وقت تک حاصل نہیں کر سکتا جب تک کہ وہ خود عرب اسرائیل جھگڑے کو نہ نمٹائے''۔ اس وجہ سے اسرائیل اور امریکا و مغربی دنیا میں اس کی خارجہ پالیسی کے حامیوں نے اس رپورٹ کو شکست کی دستاویز قرار دینا شروع کر دیا ہے۔ اس رپورٹ کے ناقدین اس بات پر ایک جیسے خیالات کے حامل ہیں اسرائیلی خارجہ پالیسی کے مقاصد ہمیشہ وہی رہے ہیں جو امریکی خارجہ پالیسی کے مقاصد عراق میں مہم جوئی سے جو نقصان اٹھا رہی ہے اس کے نتائج کا فائدہ اسرائیل اٹھا رہا ہے۔ شاید عراق سٹڈی گروپ نے اپنی رپورٹ پیش کرنے کیلئے سوچ سمجھ کر ''پرل ہاربر ڈے'' کا انتخاب کیا ہے اور عراق کے تصوراتی مہلک ہتھیاروں کے خاتمہ کی آڑ میں ''پیشگی حملے'' نے امریکا کیلئے تیل سے مالا مال اس خطے میں جو مشکلات پیدا کر دی ہیں ان سے نکلنے کیلئے صدر بش کو ایران کا تعاون

لینے کا کہا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ اس بار صدر بش توقف کریں' تفصیلات کا جائزہ لیں اور غور کریں کہ تیل کی دولت سے مالا مال ایران پر ایٹمی ہتھیاروں کی تیاری کا الزام لگا کر "پیشگی حملہ" کرنے کے نتائج کس قدر سنگین صورت میں برآمد ہوسکتے ہیں۔

7 دسمبر 1941ء کو جاپان نے ہوائی کے امریکی مقبوضہ جزیرے کی پرل ہاربر پر اس لئے حملہ کیا تھا کہ 24 جولائی 1941ء کو صدر روزویلٹ نے جاپان پر تیل درآمد کرنے کی پابندیاں عائد کردی تھیں۔

یہ سوال قابل غور تھا کہ صدر روزویلٹ نے اعلان جنگ کا درجہ رکھنے والا یہ فیصلہ کیوں کیا کہ جاپان جیسے ملک پر تیل کی پابندی لگادی جس نے امریکا کے ساتھ کوئی خرابی نہیں کی تھی؟ اور پھر جب امریکا نے اس پر پابندی لگائی تو جاپان نے اس شدت سے جواب کیوں دیا؟ ٹھیک ہے کہ روزویلٹ نے جاپان پر یہ پابندی اس وقت لگائی تھی جبکہ ہٹلر سوویت یونین میں چند ہفتے پہلے یعنی 22 جون 1941ء کو داخل ہوچکا تھا اور دکھائی دیتا تھا کہ وہ چند ہی روز میں ماسکو تک پہنچ جائے گا تاہم جاپان اگرچہ جرمنی اور دوسری "برائی محور" یورپی ریاستوں کا اتحادی تھا مگر اپنے اتحادیوں کی یورپی جنگ میں اس کی دلچسپی بہت تھی۔ حقیقت یہ تھی کہ جاپان 1933ء سے' جب ہٹلر جرمنی میں اور روزویلٹ امریکا میں برسر اقتدار آئے' ایشیائی سرزمینوں پر بھرپور جنگ میں مصروف رہا تھا۔ 1941ء کے اختتام تک جاپانی افواج کوریا' تائیوان' ویتنام اور ایک تہائی چین پر قابض ہوچکی تھیں۔ لیکن آج کی طرح اس وقت کا جاپان بھی وسائل کے حوالے سے غریب تھا۔ جاپان کو تیل اور ربڑ کے لئے کلی طور پر انڈونیشیا' بورنو اور جنوبی پیسفک میں یورپی نوآبادیات پر انحصار کرنا پڑتا تھا۔ روزویلٹ کے ساتھ کئی ماہ تک مذاکرات کے بعد جاپانی ایڈمرل' ایماموتو نے فلیٹ آرڈر نمبر ایک جاری کردیا' یہ جاپان کا پہلا شاہی بیڑا تھا' جس میں ایئر کرافٹ کیریئر شامل تھے۔ اس بیڑے کو حکم دیا گیا کہ پرل ہاربر پر موجود امریکا کے اس اڈے کو تباہ کردے جہاں سے جاپان کو تیل کی سپلائی روکنے کیلئے جہاز اور فورس موجود تھی دوسرے شاہی بیڑے کو جزیرہ نما ملایا اور فلپائن میں ڈچ' برطانوی اور امریکی جنگی طیاروں' ایئر فیلڈز' جنگی بحری جہازوں اور نیول تنصیبات کو نشانہ بنانے کا حکم دیا گیا۔ دوسرے بیڑے کو اس روز فلپائن اور ملایا میں جاپانی فوجی دستوں کی مدد کیلئے وہاں پہنچنے کی ہدایت بھی کی گئی۔ جاپان کا پرل ہاربر پر حملہ حیران کن حد تک کامیاب رہا۔ انہوں نے وہاں موجود لڑاکا طیاروں اور جنگی جہازوں کی بڑی تعداد تباہ یا غرق آب کردی۔ ڈوبنے والے جہازوں میں برطانیہ کی رائل نیوی کا فخر "ایچ ایم ایس پرنس آف ویلز" بھی شامل تھا۔ پرل ہاربر پر امریکا کے آٹھوں جنگی جہاز جاپانی حملے میں غرق اور تقریباً تمام فوجی طیارے تباہ ہوگئے۔ روزویلٹ اور چرچل نے ایسا بھیانک خواب تک کبھی نہیں دیکھا تھا کہ جاپانی ان کے اڈوں' بمبار طیاروں اور جنگی جہازوں کو تباہ کرکے اتنے مختصر وقت میں سنگاپور اور فلپائن کو فتح کرلیں گے۔

صدر بش اگر ایران پر پابندیاں عائد کرنے کی بجائے پیشگی حملے کا جارحانہ راستہ اختیار کرتے ہیں تو وہ ایران کو اس کے حق سے محروم رکھ کر اسے مشتعل کرنے کا سبب بن سکتے ہیں' وہ حق جو ایٹمی ہتھیاروں کے عدم پھیلاؤ کے سمجھوتے پر دستخط کرنے کی وجہ سے اسے پرامن مقاصد کیلئے ایٹمی توانائی کے استعمال کی اجازت دیتا ہے۔ کیا اس خطے میں امریکیوں کیساتھ کچھ ہونے والا ہے؟ خاص طور پر خلیج فارس میں امریکی نیوی' جنگی جہازوں اور ان سپلائی جہازوں کا کیا ہوگا جو عراق' کویت اور قطر وغیرہ میں موجود امریکی افواج کو مدد دیتے ہیں۔ یہ جہاز ایران کے سپر سانک سی سکمنگ اینٹی

شپ میزائلوں کیلئے پرل ہاربر پر امریکی جہازوں کی نسبت سپیس زیادہ آسان ہدف ہو سکتے ہیں۔ بحریہ کی مدد کے بغیر عراق میں موجود افواج کے زور پر کتنی دیر لڑا جا سکے گا؟ اس لئے بش کو عراق سٹڈی گروپ کی نصیحت پر عمل کرنا پڑے گا اور انہیں اسی ایران سے عراق میں ہلاکتوں کے جہنم میں موجود اپنے فوجیوں کو بچانے کیلئے مدد لینا پڑے گی آئی اے ای اے کے مطابق ایٹمی ہتھیار نہ رکھنے والے ایران کیخلاف بمباری کا آپشن امریکا کے لئے کسی صورت فائدہ مند نہیں ہو سکتا۔ امریکا کیلئے ایران اور شام کے ساتھ تعلقات کے نئے سرے سے استواری مفید ثابت ہوگی مگر اس طرح کی بات چیت کے ذریعے سے خطے کے تمام مسائل کا پائیدار حل تلاش کرنا ممکن نہیں۔

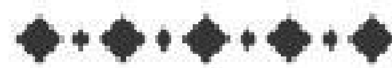
عراق سٹڈی گروپ کی رپورٹ کا وہ پہلو خاص طور پر اہمیت کا حامل ہے جسے پہلے چا پلیس صفحات میں جائزے کی صورت میں پیش کیا گیا' یہ حصہ افسوسناک مگر حقیقت پسندانہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ ان صفحات میں تشدد میں اضافے کی سطح اور " سٹے دی کورس" پالیسی کے ذریعے اس میں کمی لانے میں ناکامی بیان کی گئی ہے۔ یہ پالیسی ابہام اور دھند میں لپٹی امیدوں کے سوا کچھ نہیں۔ سٹڈی گروپ کی پورٹ میں نوشتہ دیوار سمجھے جانے والے اس سوال کا جواب کہیں نہیں ملتا کہ اگر موجودہ عراقی حکومت کا منظم طور پر تختہ الٹ دیا گیا تو کیا ہوگا؟ عراق کو غلطی سدھارنے کی کوشش کے طور پر نہیں بلکہ اس سے بڑھ کر توجہ دینے کی ضرورت ہے' امریکا کو ایک ایسے ملک سے اپنا وجود سمیٹ کر نکلنا ہوگا جہاں وہ پہلی حیثیت کے مالک نہیں رہے۔ یہ جنگ امریکا نے شروع کی۔ گزشتہ چار برسوں کے دوران امریکا نے ایسی قابض طاقت کے طور پر خود کو پیش کیا ہے جس کے اثر و رسوخ میں ہمہ گیری کے باوجود عراق کی مشکلات حل نہیں ہو سکیں۔

صدر بش کیلئے یہ بڑا موزوں وقت ہے کہ وہ عراق کو عراقی لوگوں کیلئے خالی کر دیں' نہتے اور بے گناہ شہریوں کو مارنے اور فرقہ وارانہ تشدد یا سول وار کا سلسلہ روک کر امریکا کے داخلی معاملات پر توجہ دیں جہاں 3 کروڑ 70 لاکھ امریکی خط افلاس سے نیچے زندگی گزار رہے ہیں۔ صدر جارج ڈبلیو بش کے برسراقتدار آنے کے بعد ان مفلسوں کی تعداد میں 50 لاکھ افراد کا اضافہ ہو چکا ہے۔

امریکا جہاں دنیا میں سب سے زیادہ یعنی 269 ارب پتی افراد رہتے ہیں۔ سیاہ فام امریکیوں کی ایک تہائی تعداد خط افلاس سے نیچے سسک رہی ہے: 22 فیصد ہسپانوی مفلس ہیں مگر سفید فام شہریوں کی خط افلاس سے نیچے آبادی کا تناسب صرف 8.6 فیصد ہے۔

امریکا میں 4 کروڑ 60 لاکھ شہری ہیلتھ انشورنس سے محروم ہیں۔ صرف لاس اینجلس میں 82 ہزار افراد بے گھر ہیں۔

بشکریہ (علی جعفر زیدی)



صدام کا نشیب و فراز

تکریت...... سرزمین عراق کا مشہور قصبہ بغداد سے 80 کلومیٹر دور اور مشہور قصبے سامرا سے (836 سے 876ء تک خلافت عباسیہ کا دارالخلافہ)30 میل شمال میں دریائے دجلہ کے مغربی کنارے پر سلسلہ جبل صحرین کے دامن میں واقع ہے۔ تکریت کا پرانا قصبہ چند پہاڑوں پر تعمیر ہوا تھا' اس کے دامن میں ایک دریا بہتا ہے' شمال کی طرف سنگ ریگی کی چٹان ہے جس پر پرانے قلعے کے آثار موجود ہیں۔ یہ دریائی سطح سے 200 فٹ بلند ہے۔ قدیم شہر کسی زمانے میں ایک بہت بڑا رقبہ گھیرے ہوئے تھا۔ مذکورہ بالا پہاڑیوں کے مغرب میں پرانے شہر کے آثار ایک بڑے دائرے کے شکل میں پھیلے ہوئے ملتے ہیں۔

اس شہر کا ذکر سب سے پہلے بطلیوس نے رشہ کے نام سے کیا' رمیانوس اور مارکیونس نے اسے درتہ کے نام سے موسوم کیا۔ قلعے کی پہاڑی کو اب تک درتہ کہا جاتا ہے' سریانی کتب میں اس کا نام تغریث لکھا گیا ہے' عرب مصنفین کے بقول اس کی بنیاد ساسانی بادشاہ سابورین اردشیر نے رکھی۔ اس کا نام ایک عیسائی بدوی تکریت بن وائل کے نام پر رکھا گیا۔ ابن حوقل نے لکھا ہے کہ اس کی آبادی میں مسیحیوں کی کثرت تھی جنھوں نے یہاں اپنی ایک خانقاہ بھی بنا رکھی تھی۔ مقدسی نے یہاں کی پشم (اون) کی بہت تعریف کی ہے اور تلوں کی کثرت سے بوائی کا بھی ذکر کیا ہے۔ مستوفی تکریت کے تربوزوں کو سراہتا ہے جن کی فصل اس کے بقول سال میں تین مرتبہ ہوتی تھی۔ ابن بطوطہ نے تکریت کے بازاروں اور بے شمار مساجد اور ماضی میں تکریت کی مرکزی حیثیت کا بھی تذکرہ کیا ہے۔

تکریت کو 16ھ میں عبداللہ بن معتم نے جنہیں حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ نے بھیجا تھا فتح کیا۔ 20ھ میں ایک صلح نامے کے تحت تکریت کے باسیوں نے مسلمانوں کی اطاعت قبول کی' مسعود بن حریث یہاں کا پہلا فرمانروا تھا جس نے سب سے پہلے یہاں جامع مسجد بنوائی۔ ساتویں صدی عیسوی کے آخر میں اس شہر کے نواح میں قیس اور بنو تغلب میں جنگ ہوئی' گیارہویں صدی میں یہاں خود مختار سرداروں کی حکومت تھی۔ بعد میں طغرل بیگ سلجوقی نے اس پر قبضہ کر لیا۔ 90ھ میں یہ شہر عباسی خاندان کے قبضے میں آ گیا' عہد سلاجقہ میں سلطان صلاح الدین ایوبی کا والد نجم الدین ایوب تکریت کا والی تھا' تکریت کو زیادہ شہرت صلاح الدین ایوبی رحمۃ اللہ علیہ کے مولد (جائے پیدائش) ہونے کی وجہ سے بھی ملی جنہوں نے مصر سے خلافت فاطمیہ کا خاتمہ کیا اور صلیبیوں سے فیصلہ کن جنگیں لڑیں' حج کے راستوں کو محفوظ بنایا اور قبلہ اول بیت المقدس کو عیسائیوں کے قبضے سے آزاد کر کے اسلامی پرچم لہرایا۔ ان کی عظمت اور بہادری کا اعتراف یورپ بھی کرتا ہے' صلاح الدین ایوبی کا نام آج بھی مسلمانوں

کے خون میں زندگی کی لہر دوڑا تا ہے۔ ماضی قریب میں جب اسرائیل نے لبنان پر حملہ کیا تو سلطان ایوبی کا مزار مرجع خلائق بنا رہا۔ تکریت کو بعد کی صدیوں میں نظرانداز کیا جاتا رہا' یہ کبھی پر رونق شہر تھا لیکن اس کی اہمیت کم کر کے ایک معمولی قصبہ بنا دیا گیا۔ بغداد کی مہم کے دوران ہلاکو نے دریائے دجلہ تکریت سے ہی پار کیا تھا۔ انیسویں صدی کی اصلاحات کے بعد اس کی حیثیت کو مزید کم کر کے ولایت بغداد کی قضا سامرا کا حصہ بنا دیا گیا۔ یہاں کی اکثریت حنفی العقیدہ مسلمانوں کی ہے' یہاں ترکی زبان بھی بولی جاتی ہے۔ صدام حسین کی ولادت بھی تکریت کے ایک چھوٹے گاؤں ''العوجاء'' میں ہوئی' ان کے والد کا نام حسین عبدالماجد اور والدہ کا نام صبحا طلفاح المصلات تھا' بھیڑوں کی پرورش اس غریب خاندان کے گزربسر کا ذریعہ تھا۔ صدام نے غربت اور دکھ کے ملے جلے ماحول میں اس وقت آنکھ کھولی جب اس کے والد چھ ماہ سے لاپتہ تھے۔ اسی عرصے میں صدام کا 13 سالہ بھائی بھی سرطان کا شکار ہو کر موت کی آغوش میں چلا گیا۔ شوہر کی گمشدگی سے بے حال اور بیٹے کی موت سے نڈھال ماں صبحا کے ہاں 28 اپریل 1937ء کو صدام نے جنم لیا۔

صدام کا بچپن دکھوں اور محرومیوں سے عبارت تھا' باپ کے سائے سے محرومی نے شیر خوارگی میں چچا خیر اللہ کے پاس بغداد پہنچا دیا' جہاں وہ تین سال کی عمر تک رہا' اسی دوران والدہ نے دوسری شادی کر لی۔ ننھا صدام ماں کے پاس واپس آیا تو اسے سوتیلے باپ کے سوتیلے پن کا سامنا کرنا پڑا' دس سال کی عمر میں صدام نے گھر چھوڑ دیا اور اپنے چچا کے پاس لوٹ آیا جو اب تکریت میں قیام پذیر تھے۔ بھیڑوں کی گلہ بانی کرنے والے خاندان کے بچے کیلئے چچا کے ہاں قیام ایک اہم موڑ ثابت ہوا جس نے اس کی زندگی کو بدل ڈالا کیونکہ صدام کے چچا خیر اللہ ان دنوں عراق کی سیکولر اور عرب قوم پرست بعث پارٹی کے اہم عہدے دار' نوآبادیاتی نظام کے خلاف عسکریت کے حامی اور کٹر سنی العقیدہ مسلمان تھے۔ ان کی تربیت اور خیالات نے صدام کی شخصیت پر نہایت گہرے اثرات مرتب کیے۔ صدام اپنے لڑکپن میں حکومت مخالف مظاہروں میں خاصے سرگرم رہے اور برطانوی نوآبادیاتی حکومت اور امیر جاگیرداروں کے خلاف تحریک کا حصہ بن گئے۔ ان کے چچا خیر اللہ نے ان کی تربیت جاری رکھی جس سے ان کے جوہر کھلتے چلے گئے۔ 1959ء میں صدام نے بعث پارٹی میں باقاعدہ شمولیت اختیار کی جبکہ وہ صرف بیس سال کے تھے۔ ان دنوں مشرق وسطیٰ انقلابی تحریکوں کا مرکز تھا اور عربوں میں بادشاہوں کے خلاف ردعمل شدید سے شدید ترین ہوتا چلا جا رہا تھا۔ مصر میں جمال عبدالناصر کی کامیابی نے دیگر عرب ممالک میں انقلابیوں کے حوصلے بلند کر دیئے' ملوکیتوں کو نگلنے کے لئے عرب انقلابی بے تاب تھے۔

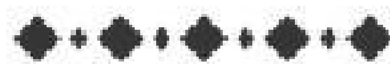
صدام کے بعث پارٹی میں شامل ہونے کے صرف ایک برس بعد جولائی 1958ء میں شاہ فیصل دوم کی بادشاہت کا خاتمہ جنرل عبدالکریم قاسم نے فوجی انقلاب کے ذریعے کیا اور شاہ فیصل کو قتل کر کے ملک کی زمام حکومت ایک انقلابی کونسل کے سپرد کر دی۔ بعث پارٹی نے نو تشکیل شدہ حکومت کی پرزور مخالفت کی اور جنرل قاسم کو اقتدار سے ہٹانے کی کوششوں میں مصروف ہو گئی۔ نوجوان صدام اپنی خداداد صلاحیتوں کی بدولت بعث پارٹی میں نمایاں مقام حاصل کر چکا تھا۔ جب جنرل قاسم کو قتل کرنے کا منصوبہ بنا تو اس پر عملدرآمد کے لیے منصوبہ سازوں کی نظر صدام حسین پر پڑی جسے منتخب کر لیا گیا۔ یہ منصوبہ بوجوہ ناکامی کا شکار ہو گیا' صدام کے پاؤں میں گولی لگی مگر وہ گرفتاری سے بچ گیا اور تکریت کی طرف فرار ہو گیا۔ جنرل قاسم سے منصوبہ قتل کو چونکہ امریکا کی پشت پناہی حاصل تھی اس لیے صدام کو سی آئی اے اور مصری انٹیلی جنس ایجنسیوں کے اہلکاروں نے پہلے

شام اور پھر لبنان کے شہر بیروت پہنچا دیا جہاں سی آئی اے نے صدام کو عسکری تربیت دی۔ تربیت کے حصول کے بعد صدام مصر کے دارالحکومت قاہرہ پہنچ گئے' جہاں قاہرہ یونیورسٹی میں قانون کی تعلیم حاصل کی۔ ان کی عدم موجودگی میں عراقی عدالت نے انہیں سزائے موت سنائی۔ جلاوطنی کے دوران ہی 1963ء میں اپنے چچا خیر اللہ کی بیٹی ساجدہ خیر اللہ سے ازدواجی بندھن میں بندھ گئے۔

جنرل قاسم کے کمیونسٹوں سے بڑھتے روابط امریکا کے لئے ناقابل برداشت تھے۔ پہلے منصوبے کی ناکامی کے بعد 1963ء میں سی آئی اے اور بعث پارٹی نے ایک نئے فوجی انقلاب کی منصوبہ بندی کی اور بعث پارٹی کے سرگرم رکن عبدالسلام عارف نے تختہ الٹ کر ملک کی بھاگ دوڑ سنبھال لی۔ وہ صدر بنا دیئے گئے' جنرل قاسم کو پھانسی دے دی گئی' حالات کی سازگاری دیکھ کر صدام اپنی جلاوطنی ختم کر کے واپس عراق آ گئے مگر یہاں عبدالسلام عارف اور دیگر بعثی رہنماؤں کے چپقلش نے غیر متوقع صورتحال پیدا کر دی۔ صدام کئی دوسرے بعثی رہنماؤں کے ساتھ جیل بھیج دیئے گئے۔ چار سالہ قید کے بعد صدام 1967ء میں جیل سے فرار ہو گئے۔ کہا جاتا ہے کہ جیل سے فرار کرانے میں سی آئی اے نے ان کی مدد کی تھی۔ جیل سے نکلنے کے بعد صدام کا شمار بعث پارٹی کے سرکردہ قائدین میں ہونے لگا۔ عبدالسلام عارف 1966ء میں ایک ہوائی حادثے میں انتقال کر چکے تھے جس کے بعد ان کے بھائی عبدالرحمٰن عارف صدر بنے۔ 1968ء میں بعث پارٹی کے جنرل احمد حسن البکر نے عبدالرحمٰن عارف کا تختہ الٹ دیا' اس انقلاب میں صدام کا اہم کردار تھا۔ اس لیے جنرل البکر نے صدام کو نائب صدر بنا دیا۔ بحیثیت نائب صدر ان کی جولانی طبع اور صلاحیتیں نکھر کر سامنے آئیں' انہوں نے ایک طرف بعث پارٹی کو متحد و مضبوط کیا۔ سیاسی انارکی کو ختم کر کے عراق کی پسماندگی کو دور کرنے میں لگ گئے۔ ان اقدامات نے انہیں بعث پارٹی کے کارکنوں اور عوام میں مقبول بنا دیا اور وہ سنی شیعہ اور عرب کرد مناقشوں سمیت لاتعداد اختلافات کے شکار عراقی معاشرے میں اتحاد کی علامت بن گئے۔ بیروت میں حاصل کردہ عسکری تربیت کی بنیاد پر صدام نے صدر البکر سے فور اسٹار جنرل کا عہدہ حاصل کر لیا' عوامی طاقت کے مراکز فوج اور انتظامیہ پر اثر و نفوذ کے بل بوتے پر 16 جولائی 1979ء کو حسن البکر کو مستعفی ہونے پر مجبور کر دیا' جس کے بعد صدام نے پارٹی کے ڈپٹی سیکرٹری جنرل سے سیکرٹری جنرل' انقلابی کونسل کے چیئرمین' مسلح افواج کے سپریم کمانڈر اور صدر کے عہدے سنبھال لیے۔ خود کو سماجی' انقلابی' جدت پسند قرار دے کر اپنے ایجنڈے کو آگے بڑھایا۔ معیشت کو نئے خطوط پر استوار کیا' بغاوتوں کی روک تھام کے نظام کی تشکیل' تیل کا عوامی ترقی کے منصوبوں کے لئے استعمال' زرعی نظام کی جدت' کسانوں کی مراعات' تعلیم و صحت کی سہولیات کی مفت فراہمی صدام کے کارنامے ہیں۔ یہ سماجی بہبود اس خاندانی پس منظر کی وجہ سے تھی جس میں اس نے آنکھ کھولی تھی اور پھر غربت و عسرت میں زندگی بسر کی۔

صدام کے فلاحی منصوبوں نے عراق کے غریب اور متوسط طبقے کو اس خوشحالی سے ہمکنار کیا جس کا تصور بھی دوسرے ممالک میں ناممکن تھا۔

بشکریہ (حافظ سجاد ستی)



(37) عیسائی بیسویں صدی میں کھود کے غلام کیسے بنے؟

(سید عاصم محمود)

یہ مارچ ۱۹۱۳ء ہے۔ ووڈرو ولسن کو امریکا کا اٹھائیسواں صدر بنے چند ہی دن ہوئے ہیں۔ ایک دن وہ وائٹ ہاؤس میں موجود تھا کہ سیموئیل انٹر میئر (Samuel Untermeyer) نام کا ملاقاتی اسے ملنے آیا۔ میئر نیو یارک کا مشہور وکیل تھا۔ مزید براں اس نے نیشنل ڈیموکریٹک کمیٹی کو دل کھول کر چندہ دیا تھا جس کی مدد سے ولسن ۱۹۱۲ء کے صدارتی انتخابات جیت چکا تھا۔ اس لئے نومنتخب امریکی صدر نے فوراً اسے اپنے کمرے میں بلا لیا۔ انتخابی مہم کے دوران ان کی ملاقات ہو چکی تھی۔

انٹر میئر نے امریکی صدر کو یہ بتا کر حیران و پریشان کر دیا کہ وہ اپنی سائلہ کی طرف سے اس پر مقدمہ دائر کرنے لگا ہے کیونکہ اس نے سائلہ سے شادی نہ کر کے وعدہ خلافی کی ہے۔ تاہم ولسن اسے چالیس ہزار ڈالر ادا کر دے، تو وہ مقدمہ کھڑا نہیں کرے گا۔ انٹر میئر کا سائلہ پرنسٹن یونیورسٹی کے ایک سابق پروفیسر کی بیوی تھی۔ ولسن بھی ایک زمانے میں اسی یونیورسٹی میں پڑھاتا تھا۔

اب انٹر میئر نے جیب سے ان عشقیہ خطوط کا پلندہ نکالا جو ولسن نے اپنے ساتھی کی بیوی 'میری ایلن پیک کو لکھے تھے۔ تب وہ دونوں پڑوسی تھے۔ خطوط سے ثابت ہوتا تھا کہ دونوں کے مابین ناجائز روابط تھے۔ ولسن نے جوش جوانی میں اپنی شادی شدہ محبوبہ کو کئی خط لکھے تھے جو اس نے ضائع نہیں کیے بلکہ 'سنہرے موقع' کے انتظار میں سنبھالے رکھے۔ اب وہ 'سنہرا موقع' آ پہنچا تھا۔ ولسن نے بے چارگی کے عالم میں اقرار کیا کہ وہ خطوط اسی کے تحریر کردہ ہیں۔

۱۹۱۰ء میں ولسن نے پرنسٹن یونیورسٹی کو خیرباد کہہ دیا تھا تاکہ ریاست نیوجرسی کا گورنر بن سکے۔ ۱۹۱۲ء میں وہ صدارتی انتخابات جیت کر امریکی صدر بن گیا۔ اس دوران ولسن کا سابقہ محبوبہ نے اپنے شوہر سے طلاق لے کر واشنگٹن کے ایک رہائشی سے شادی کر لی۔ اس آدمی کا ایک بالغ لڑکا تھا

جو واشنگٹن کے ممتاز بینک میں ملازمت کرتا تھا۔

ملاقاتی نے میزبان کو بتایا کہ اس کی سابقہ معشوقہ اپنے سوتیلے بیٹے کو بہت چاہتی ہے۔ یہ بیٹا آج کل مالی مسائل کا شکار ہے اور اسے فوری طور پر چالیس ہزار ڈالر درکار ہیں۔ کیوں؟ اس کی تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں، بس اسے فوراً یہ رقم چاہیے تھی۔ اس کی سوتیلی ماں کو قدرتی طور پر خیال آیا کہ اس کا سابق عاشق ہی اتنی بڑی رقم فراہم کرسکتا ہے جو اب امریکہ کا صدر بھی ہو چکا ہے۔

سارا قصہ سن کر نو منتخب امریکی صدر شش و پنج میں پڑ گیا۔ اگر اس کی رنگ رلیوں کا ماجرا اخبارات میں اچھل جاتا' تو اس کی عزت خاک میں مل جاتی۔ صدارت کے آغاز ہی میں یہ سکینڈل اس کی شہرت کو داغدار کرسکتا تھا۔ ان خدشات کے باوجود ولسن نے انترمیئر کو چالیس ہزار ڈالر دینے سے انکار کردیا۔ ملاقاتی جز بز نہ ہوا' اس نے اسے سوچنے کے لیے مزید چند دن دیے اور وائٹ ہاؤس سے نکل گیا۔

چند دن بعد انترمیئر پھر امریکی صدر سے ملا۔ ولسن نے اسے بتایا کہ اس کے پاس فی الحال اتنی بڑی رقم نہیں تاہم آنے والے ہفتوں میں وہ بندوبست کردے گا۔ مگر انترمیئر کی سائلہ کو فوری طور پر رقم درکار تھی۔ آخر انترمیئر نے مسئلے کا حل نکال لیا۔ اس نے ولسن کو بتایا کہ وہ ایک شرط پر اس کی سابقہ محبوبہ کو چالیس ہزار ڈالر ادا کرسکتا ہے...... وہ یہ کہ جب بھی امریکی سپریم کورٹ کے لیے نیا جج منتخب کرنے کا موقع آیا' تو انترمیئر کا نامزد کردہ شخص ہی جج بنے گا۔

مزید گفتگو کیے بغیر امریکی صدر نے ملاقاتی کی تجویز منظور کر لی۔ اس طرح انترمیئر نے ولسن کی سابقہ محبوبہ کو چالیس ہزار ڈالر دے دیے اور معاملہ دب گیا۔ عشقیہ خطوط انترمیئر کے پاس ہی محفوظ رہے' شاید اس لیے کہ مستقبل میں بھی ولسن کے خلاف استعمال ہوسکیں۔ امریکی صدر نے انترمیئر کا شکریہ ادا کیا کیونکہ اس نے اسے گہری کھائی میں گرنے سے بچا لیا تھا۔

ظاہر ہے انترمیئر نے خواہ مخواہ جیب سے اتنی بڑی رقم ادا نہیں کی...... دراصل وہ اپنے ایک دیرینہ خواب کو عملی جامہ پہنانا چاہتا تھا۔ وہ کٹر یہودی تھا اور اب اس وعدے کے ذریعے پہلی بار کسی یہودی جج کو امریکی سپریم کورٹ جیسے بااثر اور معزز ادارے تک پہنچانا چاہتا تھا۔ جلد ہی اس کی تمنا بر آئی اور اس کی سفارش پر صدر ولسن نے یہودی وکیل، لوئیس ڈیمبڈز براںڈیز کو سپریم کورٹ کا جج بنا دیا۔ اس حقیقی ڈرامے کے تینوں کرداروں نے یہودیوں کی فلاح و بہبود کے لیے جو کارنامے انجام دیئے وہ آگے بیان ہوں گے۔

یہ حیران کن واقعہ اس امر کی نشاندہی کرتا ہے کہ یہودیوں (یا صیہونیوں) نے کیسی کیسی چالوں' سازشوں اور ترکیبوں کے ذریعے اپنے مقاصد پورے کیے ہیں۔ عیاری کی یہ داستان چند برسوں پر محیط نہیں بلکہ پورے تین ہزار برس کی تاریخ رکھتی ہے۔ یہ داستان اتنی چکرا دینے والی ہے کہ پڑھنے والا مبہوت ہو کر رہ جاتا ہے اسے پڑھ کر یہی احساس ہوتا ہے کہ یہودی اپنی سازشوں کے ذریعے دنیا کے حاکم بننا چاہتے ہیں۔ اسی لیے انھوں نے دنیا کی دو بڑی قوتوں کو آپس میں لڑوا دیا تاکہ اپنے مذموم عزائم کی تکمیل کرسکیں۔

آج مسلمان یہ دیکھ کر حیرت زدہ رہ جاتے ہیں کہ عیسائی اور یہودی ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے مسلمانوں اور اسلام کے خلاف سرگرم عمل ہیں۔ حیرت اس لیے کہ یہ یہودی ہی تھے جنھوں نے (نعوذ باللہ) حضرت عیسیٰؑ کو جھوٹا اور ان کی والدہ' حضرت مریمؑ کو زانیہ کہا اور اپنی سازشوں کے

ذریعے آخر کار انہیں (اپنی دانست میں) مصلوب کر دیا۔ پھر یہ انقلاب عظیم کیسے آیا کہ جو مذہبی نظریات یہودی رکھتے ہیں، وہ آج کروڑوں عیسائیوں کے دلوں میں بس چکے ہیں؟۔

یہ کس قسم کے نظریات ہیں؟ ان کا مختصر سا خلاصہ یہ ہے:

توریت اور انجیل میں آنے والے وقت کے سلسلے میں کئی پیش گوئیاں کی گئی ہیں۔ ان کی رو سے حضرت عیسیٰ دوبارہ زمین پر آکر اپنے دشمنوں سے عظیم جنگ کریں گے اور انہیں شکست دے کر ایک ہزار سال تک اپنی حکومت قائم کریں گے۔ لیکن ان کی تشریف آوری اسی وقت ممکن ہے جب یہودی دریائے نیل سے لے کر دریائے فرات کے درمیانی علاقے پر قابض ہو جائیں اور مسجد اقصیٰ کی جگہ ہیکل سلیمانی تعمیر کر لیا جائے۔

یہ ہے ان مذہبی پیشن گوئیوں کا خلاصہ جن پر آج کروڑوں عیسائی یقین رکھتے اور اسی لیے کھل کر اسرائیل کی ہر ممکن مدد کرتے ہیں، ان پر آگے چل کر مزید بحث ہو گی۔ (واضح رہے کہ بحیثیت مسلمان میرا ایمان ہے کہ توریت اور انجیل یعنی بائبل کے دونوں حصے تحریف شدہ ہیں)۔ چونکہ درج بالا پیشن گوئیوں سے سب عیسائی متفق نہیں، اس لیے اول الذکر دنیائے عیسائیت میں انا جیلی یا صیہونی عیسائی یا انتہا پسند عیسائی کہلاتے ہیں۔ ان کی تعداد چالیس کروڑ تک بتائی جاتی ہے۔ امریکا میں پندرہ سے بیس کروڑ انا جیلی بستے ہیں۔ یہ خود عیسائیت کے دو بڑے فرقوں میں ایک فرقے پروٹسٹنگ کی شاخ ہیں۔

خاص بات یہ ہے کہ امریکا میں انا جیلی بڑے طاقت ور اور اثر و رسوخ والے ہیں۔ حتیٰ کہ اب امریکی صدور بھی ان کے نظریات سے متاثر ہیں۔ اسی لیے امریکی خارجہ پالیسی کا جھکاؤ واضح طور پر اسرائیل کی حمایت میں اور مسلمانوں کے خلاف ہے۔

کتب احادیث میں بھی پیشن گوئیاں موجود ہیں جن کا خلاصہ یہ ہے:

قرب قیامت کی ایک نشانی دجال کا نمودار ہونا ہے۔ یہودی خاص طور پر اس کے پیروکار بن جائیں گے۔ تب امام مہدی کا ظہور ہو گا۔ وہ ایک عظیم جنگ (الملحمۃ الکبریٰ) میں اس سے مقابلہ کریں گے مگر اسے شکست نہیں دے سکیں گے۔ تب حضرت عیسیٰؑ کا نزول ہو گا جو دجال پر فتح پا کر روئے زمین پر صحیح اسلامی حکومت قائم کریں گے۔

دنیائے عیسائیت میں ابتدا سے یہ نظریہ موجود ہے کہ حضرت عیسیٰؑ ایک بار پھر دنیا میں آئیں گے مگر چند سو برس پہلے تک ایسا ہونے کے لیے یہ شرط موجود نہیں تھی کہ ان کی تشریف آوری کے لیے مشرق وسطیٰ میں ایک یہودی مملکت کا قیام اور مسجد اقصیٰ کی تباہی لازمی ہے۔ پھر یہودی اصل رکھنے والے یہ نظریے عیسائیوں نے کیسے قبول کر لیے؟ اسی موقع پر ایک بڑی گہری صیہونی سازش کا اہم کردار سائرس انگرسن اسکوفیلڈ سامنے آتا ہے

۔

اسکوفیلڈ...... گناہ گار جو رہنما بن گیا

یہ وہ شخص ہے جس نے دنیا کو تباہی کے دہانے پر لا کھڑا کیا مگر بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ یہ کون ہے اور اس نے اپنی زندگی کیسے گزاری؟ حالانکہ اس نے دنیائے عیسائیت پر جس قسم کے اثرات مرتب کیے انہیں دیکھتے ہوئے اسے مقبول عام شخصیت ہونا چاہیے تھا۔ اس کے باوجود اسکو

فیلڈ کے پیروکار ہر ممکن کوشش کرتے ہیں کہ اس کے حالات زندگی سامنے نہ آئیں۔ آخر کیوں؟ اس لیے کہ اس کی پوری زندگی گناہوں سے آلودہ ہے۔

اسکوفیلڈ جب پیدا ہوا' تب امریکا میں یہودی خفیہ سازشوں میں مصروف تھے تاکہ اس نئے ملک میں اپنے قدم جما سکیں۔ اس سلسلے میں انھوں نے متفرق اقسام کے ہتھکنڈے استعمال کیے۔ ان میں سب سے اہم یہودی مذہبی نظریات کو عام عیسائیوں میں مقبول بنانا تھا تاکہ ان کی آنکھوں میں دھول جھونک کر انھیں اپنا ہمنوا بنایا جاسکے۔ اس وقت کنگ جیمز بائبل سب سے زیادہ پڑھی جانے والی اور تسلیم شدہ بائبل تھی۔ برطانوی شاہ جیمز اول نے ۱۶۱۱ء میں اس کا ترجمہ کروایا تھا۔

اب یہودیوں اور صیہونیوں نے منصوبہ بنایا کہ کوئی ہم خیال پادری کنگ جیمز بائبل کی شرح بالکل نئے انداز سے لکھے......وہ اس طرح کے بائبل کے جملوں' حاشیوں' ابواب اور صفحوں کے نیچے یہودی مذہبی نظریات کئی ہزار نوٹس کی شکل میں ٹھونس دے۔ اس نہایت اہم کارروائی کو سرانجام دینے کے لیے ان کی نگاہ انتخاب اسکوفیلڈ پر آٹھہری۔ (یاد رہے کہ یہودی اور صیہونی ایک ہی جیسے خیالات ونظریات رکھتے ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ انیسویں صدی کے اواخر میں جو یہودی ریاست اسرائیل بنانے کے لیے سرگرم عمل ہوئے انھیں صیہونی کہا جاتا ہے)۔

اسکوفیلڈ نے یہودی منصوبے کو اس کامیابی سے عملی جامہ پہنایا کہ ان کے وہم وگمان میں بھی نہ تھا۔ بعد کو یہودیوں نے اس کی اشاعت اور ترویج پر اتنی زبردست توجہ دی کہ یہ امریکا میں سب سے زیادہ فروخت ہونے والی بائبل کا اعزاز حاصل کر چکی ہے۔ چونکہ کنگ جیمز بائبل قدیم انگریزی میں لکھی گئی ہے' لہٰذا نئی نسل کے لیے اسے سمجھنا دشوار سے دشوار تر ہوتا گیا۔ تب اس نے اسکوفیلڈ بائبل کا رخ کرلیا جو درحقیقت کنگ جیمز بائبل سے بہت مختلف ہے۔ اسکوفیلڈ نے اپنے آقاؤں کے مطابق ایک نہایت جدید اسرائیلی ریاست کا بت تراش دیا جسے پوجنے والوں کی تعداد میں روز بروز اضافہ رہا ہے۔

آنے والی امریکی نسلیں اسکوفیلڈ کے نوٹس کو 'بائبل کا حصہ' اور 'خدا کا فرمان' سمجھنے لگیں۔ انھیں یقین ہوگیا کہ یہودی خدا کی 'پسندیدہ ترین' قوم ہے اور فلسطین کا علاقہ خدا نے ہی اسے عطا کیا ہے۔ امریکی حکومت کے کئی اعلیٰ عہدے داروں سے امریکی صدر تک' بڑے بڑے صنعت کار' تاجر اور امریکی عوام سب انھی نظریات پر یقین رکھتے ہیں کیونکہ یہ ان کی بائبل کا حصہ ہیں۔ اسی لیے امریکی حکومت اپنا ''نیا عالمی حکم نامہ'' پوری شدت سے دنیا پر لاگو کرنا چاہتی ہے۔ یہ اس کا مذہبی فریضہ بھی ہے اور اسی لیے امریکا فلسطین میں یہودی بستیوں کی تعمیر رکوانا نہیں چاہتا۔

اگر اسکوفیلڈ کے نوٹس علیحدہ کتابچے کی شکل میں شائع ہوتے' تو یقیناً انھیں بھلا دیا جاتا' وہ گوشہ گمنامی میں سڑتے رہتے مگر بائبل میں شامل کرنے کے باعث انھیں دوامی حیثیت مل گئی۔ آسان فہم ہونے کے باعث وہ نئی نسلوں کے ذہن میں رچ بس گئے اور وہ نادانستہ طور پر صیہونی عیسائی بنتے چلے گئے۔ اسکوفیلڈ بائبل کے پیروکار اسے خدا کا تحفہ قرار دیتے ہیں۔ ان کے صیہونی نظریات اتنے راسخ ہو چکے ہیں کہ وہ اس بائبل کے خلاف کوئی بات سننے کو تیار نہیں۔ ان کے نزدیک اسکوفیلڈ سے اختلاف کرنا حضرت عیسیٰ سے اختلاف کرنے کے مترادف ہے۔

دلچسپ امر یہ ہے کہ دنیائے عیسائیت میں سب معروف بائبل سوسائٹیوں (یعنی بائبل شائع کرنے والے اداروں) کی یہ پالیسی رہی ہے کہ

بائبل کے اندر کوئی نوٹ یا اپنا ذاتی نظریہ شامل نہیں کرنا۔ اسکوفیلڈ نے اس اصول کی نفی کر دی۔ حتیٰ کہ انجیل میں درج اس حکم کو بھی مسترد کر دیا:

''خبردار ایسا نہ کر! میں بھی تیرا اور تیرے بھائی نبیوں اور اس کتاب کی باتوں پر عمل کرنے والوں کا ہم خدمت ہوں۔(یوحنا کا مکاشفہ۔۱۹:۲۲)

اسکوفیلڈ نے توریت اور انجیل میں سامل کسی کتاب کو نہیں بخشا اور جملوں میں جگہ جگہ اپنے نوٹس داخل کر دیے۔ یوں عام لوگوں کے نزدیک وہ بھی مذہبی کتاب کا حصہ بن گئے جو بہت بڑی غلط فہمی ہے۔

یہ نام نہاد بائبل پہلی بار ۱۹۰۹ء میں طبع ہوئی اور تب سے اس کی متعدد اشاعتیں نکل چکی ہیں۔ یورپ کی متفرق زبانوں میں بھی اس کا ترجمہ ہوا ہے اور اب یورپی ممالک میں بھی صہیونی عیسائی نظریات پھیل رہے ہیں۔ یہ تین بار نظر ثانی کے عمل سے گزری ہے اور ہر بار مدیران نے یہودی پیشن گوئیوں کو موثر بنانے کے لیے نوٹس میں قطع و برید سے کام لیا (ثبوت آگے فراہم ہوں گے)۔

سب سے پہلے ۱۹۱۷ء میں اسکوفیلڈ نے اپنے ہم خیالوں کے ساتھ اس کا از سر نو جائزہ لیا تاکہ 'خامیاں' دور کی جاسکیں۔ ۱۹۶۷ء میں ناشر نے اناجیلی پادریوں سے اسے درست اور حالات کے مطابق 'ہم آہنگ' کروایا۔ ۱۹۸۴ء میں یہ بائبل پھر نظر ثانی سے گزری۔ تاحال یہی نسخہ بار بار شائع کیا جا رہا ہے۔ اسکوفیلڈ بائبل میں جو صیہونی نظریے ٹھونسے گئے ہیں' ان کا اصل موجد اسکوفیلڈ بھی نہیں بلکہ اس کا گرو جان نیلسن ڈربی ہے۔ اس برطانوی پادری نے ایک نئے فرقے' تقدیر مست (Dispensantionalism) کی بنیاد رکھی تھی جس کے تمام نظریات یہودی اصل رکھتے ہیں۔ اسکوفیلڈ اسی فرقے کا پیروکار تھا۔ قارئین ڈربی اور اس کے فرقے کے 'کارنامے' آگے پڑھیں گے۔

اسکوفیلڈ کی گناہ آلود زندگی

سائرس انگرسن اسکوفیلڈ ۱۹ اگست ۱۸۴۳ء کو ریاست مشی گن کی لیناوی کاؤنٹی میں پیدا ہوا۔ ۱۸۶۱ء میں جب امریکی خانہ جنگی شروع ہوئی تو اس کے ماں باپ ریاست ٹینیسی منتقل ہو گئے۔ اس نے وہیں کانفیڈریٹ آرمی کی طرف سے خانہ جنگی میں حصہ لیا۔ ایک سال بعد اسے فوج سے نکال دیا گیا کیونکہ وہ جانفیڈریٹ ریاستوں شہری نہیں تھا۔ اس نے جھوٹ بول کر فوج میں شمولیت اختیار کی تھی۔

خانہ جنگی ختم ہونے کے بعد اسے ریاست میسوری کے شہر سینٹ لوئیس میں پایا گیا۔ اب وہ شادی شدہ اور دو بچوں کا باپ بن چکا ہے۔ یہ پتا نہیں چلتا کہ ۱۸۶۹ء میں کنساس شہر جانے تک وہ گھریلو اخراجات کیونکر برداشت کرتا رہا۔ کچھ مورخین لکھتے ہیں کہ وہ وکالت کرتا رہا۔ مگر سینٹ لوئیس کی عدالتی تاریخ میں ایسا کوئی مقدمہ نہیں جو اس نے لڑا ہو۔ دوسرے مورخین کہتے ہیں کہ اس دوران وہ دوسروں کو ٹھگ کر کمائی کرتا رہا اور یہی بات درست ہے۔ دراصل ایسا کوئی ثبوت موجود نہیں جس سے پتا چلے کہ اس نے کسی کالج میں وکالت کی باقاعدہ تعلیم حاصل کی ہو۔ اسکوفیلڈ نے خود ہی اپنے آپ کو وکیل قرار دے دیا۔

۱۸۶۹ء میں وہ بال بچوں سمیت کنساس شہر چلا آیا جہاں اس کی بیوی لیونٹین کیری کی کچھ جائداد تھی۔ اس جائداد ہی سے متعلق ایک مقدمے کے سلسلے میں اس کی ملاقات یہودی وکیل جان جے انگلاس سے ہوئی۔ ۱۸۴۳ء میں پیدا ہونے والا یہ یہودی دراصل ایک خفیہ تنظیم 'دی سیکرٹ

سکس' سے منسلک تھا جس کا صدر دفتر بوسٹن میں تھا۔ اس تنظیم کا بظاہر مقصد امریکی جنوبی ریاستوں سے غلامی کا خاتمہ کرنا تھا مگر اصل میں یہ امریکہ میں خانہ جنگی کروانا چاہتی تھی تاکہ یہاں صیہونیوں کو قدم جمانے کا موقع مل سکے۔ دی سیکرٹ سکس خود مشہور زمانہ یہودی تنظیم الومانتی (illumuinate) کی ذیلی شاخ تھی۔

اب تو اسکوفیلڈ کی چاندی ہوگئی۔ علاقے میں دی سیکرٹ سکس کے ارکان خاصا اثر و رسوخ رکھتے تھے۔ انگلاس اور ان ارکان کی کوششوں سے اسے کنساس بار میں شمولیت کا پروانہ مل گیا حالانکہ اسکوفیلڈ نے وکالت کی کوئی رسمی تعلیم حاصل نہیں کی تھی۔ یوں اس نے جھوٹ بول کہ وہ مینٹ لوئیس بار کا رکن ہے۔ اثر و رسوخ سے کان لے کر یہ دونوں وکیل کنساس اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔ انگلاس کے ساتھ اٹھتے بیٹھتے ہی اسکوفیلڈ پہلی بار یہودی مذہبی نظریات اور صیہونی منصوبوں سے آگاہ ہوا۔

۱۸۷۲ء میں امریکی سینٹ کے انتخابات ہوئے۔ اسکوفیلڈ کے آقا' انگلاس نے کنساس سے سینٹ کا انتخاب لڑا۔ اسکوفیلڈ نے اس کی انتخابی مہم میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ اتفاق سے اس کے حریف پر سرکاری اہل کاروں کو رشوت دینے کے الزامات لگ گئے، یوں انگلاس امریکی سینٹ کا رکن بن گیا۔

چونکہ اسکوفیلڈ نے اس کی انتخابی مہم میں نمایاں کردار ادا کیا تھا، اس لیے انگلاس نے اسے انعام دینے کا فیصلہ کرلیا۔ ۱۱ مارچ ۱۸۷۳ء کو اس نے امریکی صدر گرانٹ کو یہ پٹیشن بھیجی کہ اسکوفیلڈ کو ریاست کنساس کا اٹارنی جنرل بنا دیا جائے۔ درخواست منظور ہوئی اور اسکوفیلڈ اس زمانے میں امریکہ کا سب سے کم عمر ریاستی اٹارنی جنرل بن گیا۔ اس کی عمر انتیس سال تھی۔

نئے عہدے کا حلف اٹھاتے ہوئے مستقبل کے مشہور مذہبی رہنما نے ایک اور جھوٹ داغ دیا۔ اس نے بیان دیا "خدا کی قسم میں نے کبھی رضا کارانہ طور پر ریاست ہائے متحدہ (امریکہ) کی فوج کے خلاف ہتھیار نہیں اٹھائے اور نہ ہی میں کانفڈریٹ فوج میں شامل رہا۔" حالانکہ اس نے ایک سال تک کانفیڈریٹ فوج میں رضا کارانہ طور پر خدمات انجام دی تھیں۔

دراصل اس زمانے تک امریکی حکومت ان افراد کو سزائیں دے رہی تھی جنھوں نے کانفیڈریٹ فوج کی طرف سے خانہ جنگی میں حصہ لیا تھا۔ اسکوفیلڈ نے اٹارنی جنرل بننے کی خاطر سچ چھپانے میں کوئی عار محسوس نہیں کیا۔ دلچسپ امر یہ ہے کہ ستائیس برس بعد جب کانفیڈریٹ فوج کی یادیں تازہ کرنے والے ایک ادارے نے اسے تمغہ دیا، تو اسکوفیلڈ نے اسے بخوشی قبول کرلیا۔

لیکن اسکوفیلڈ زیادہ عرصے اپنے نئے عرصے سے لطف نہ اٹھا سکا۔ کیونکہ مقامی اخبارات میں اس کی بے ایمانی کی خبریں آنے لگیں۔ معلوم ہوا کہ اس نے ری پبلکن پارٹی کے کئی مقامی عہدے داروں کو ٹھگ لیا ہے۔ ۱۴ دسمبر ۱۸۷۳ء کو ریاستی شہر، لیون ورتھ کے اخبار ڈیلی ٹائمز نے یہ خبر شائع کی کہ اسکوفیلڈ نے ایک آدمی سے بھاری رقم طور رشوت لی ہے تاکہ اس پر مقدمہ نہ چل سکے۔ اخبار کے مطابق اس کے پاس بطور ثبوت تحریری حلفی بیان بھی موجود ہے۔ ان الزامات کے باعث اسکوفیلڈ نے صرف چھ ماہ بعد ۲ دسمبر ۱۸۷۳ء کو اپنے عہدے سے استعفیٰ دے دیا۔ اس نے کوئی وجہ نہیں بتائی۔ اب انگلاس اس کا اثر و رسوخ کام آیا اور اس کے خلاف کسی قسم کی تفتیش نہ ہوسکی۔

ذلت اٹھا کر اسکوفیلڈ سینٹ لوئیس واپس چلا گیا۔ وہ بیوی بچوں کو ریاست کنساس کے شہر ایچی سن چھوڑ گیا جہاں اس کی ساس مقیم تھی۔ تب تک اس کے ہاں ایک بیٹا بھی پیدا ہو چکا تھا۔ خیال ہے کہ وہ سینٹ لوئیس جا کر وکالت کرنے لگا مگر ساتھ ساتھ اس نے لوگوں کو دھوکہ دینے کا دھندا بھی جاری رکھا۔ حتیٰ کہ اس نے اپنی ساس کو بھی نہیں بخشا۔

سینٹ لوئیس پہنچ کر اس نے اپنی بیگم کو خط لکھا کہ وہ اپنی ماں کی جمع کردہ رقم، تیرہ سو ڈالر اسے بھیج دے تاکہ وہ کہیں سرمایہ کاری کر کے کثیر منافع کما سکیں۔ کچھ ہفتوں کی خط کتابت کے بعد بیگم نے اپنی ماں کی کل جمع پونجی شوہر کو ارسال کر دی۔ اسکوفیلڈ نے انہیں ایک رہن نامہ بھجوایا جو سینٹ لوئیس میں کسی جائداد کے متعلق تھا۔ اس پر چارلس بیسٹ کے دستخط تھے۔ بعد میں پتا چلا کہ رہن نامہ اور اس پر ہونے والے دستخط دونوں جعلی تھے۔ اسکوفیلڈ نے زندگی بھر یہ تیرہ سو ڈالر ساس کو واپس نہیں لوٹائے۔

مقدمات کا ریکارڈ:

سینٹ لوئیس کی عدالتوں میں اسکوفیلڈ کے خلاف دائر کیے جانے والے تین مقدمات کا ریکارڈ آج بھی موجود ہے۔ ان مقدموں کے نمبر بالترتیب ۴۴۲۵۲، ۴۵۳۲۶ اور ۴۶۳۳۳ ہے۔ تینوں دھوکا دہی سے متعلق تھے، وہ جعل سازی کے ایسے واقعات کا بھی مرتکب ہوا جن کا تھانے یا عدالت میں اندراج نہ ہو سکا۔ مؤرخین کے مطابق ۱۸۷۸ء یا ۱۸۷۹ء میں ایک مقدمے کے سلسلے میں اسے سزا ہوئی اور وہ کم از کم چھ ماہ جیل میں قید رہا۔

اسیری کے دوران ہی اس نے جان ڈربی کے یہودی فلسفے کا مطالعہ کیا اور اس سے بڑا متاثر ہوا۔ کچھ مورخ یہ بھی لکھتے ہیں کہ جیل میں اس کی ملاقات ان راہباؤں سے ہوئی جو سینٹ لوئیس کے وال نٹ سٹریٹ پریسبٹیرین چرچ سے تعلق رکھتی تھیں۔ اس چرچ کا پادری، جیمز برڈکس جان ڈربی کا گہرا دوست تھا۔ انہوں نے اسکوفیلڈ کو ڈربی کے تقدیریت سے متعارف کروایا۔

اس واقعے کے بعد اسکوفیلڈ، دوبارہ پیدا ہونے والا عیسائی (Born again christian) بن گیا۔ یہ دراصل تقدیریت کا ایک نظریہ ہے جس کے مطابق تقدیریت قبول کر لینے والا گناہوں سے پاک ہو کر نیا عیسائی بن جاتا ہے۔ یقیناً آپ نے کئی بار امریکی بش کی زبان سے یہ فقرہ سنا ہوگا "آئی ایم بارن اگین کرسچین"۔

بیوی بچوں کو لاوارث چھوڑ دیا

اسکوفیلڈ اب وکیل سے پادری بننے کی راہ پر گامزن ہو گیا لیکن اسی دوران اس کے دامن پر طلاق یافتہ ہونے کا بڑا نمایاں دھبہ لگا۔ ۱۸۷۳ء میں سینٹ لوئیس آنے کے بعد اسکوفیلڈ کی اپنی بیوی سے ان بن رہنے لگی جو اس کی غیر شریفانہ حرکتوں سے بہت تنگ تھی۔ اس کے گناہوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ دسمبر ۱۸۷۴ء میں اسکوفیلڈ کا بیٹا، گائے چل بسا۔ اب اس کی ازدواجی زندگی مزید پریشان کن ہو گئی۔ ناکافی آمدنی نے گھریلو زندگی اجیرن کر دی۔ اس کے بعد اسکوفیلڈ کا اپنی بیوی بچیوں سے ناطہ ٹوٹ گیا اور وہ شرابی مرد کی صورت میں سامنے آیا۔

اسکوفیلڈ نے اسی عرصے میں سینٹ لوئیس فلاور مشن سے وابستہ ایک نوجوان لڑکی کو اپنی داشتہ بنا لیا۔ تلاش بسیار کے باوجود اس لڑکی کا نام معلوم

نہ ہو سکا۔ بعدازاں اس نے دوسری لڑکی بیٹی وان وارٹ سے ناجائز تعلقات قائم کر لیے۔ پہلی بیوی اور دونوں بچیاں اسکوفیلڈ کی زندگی سے یوں نکل گئیں جیسے ان کا وجود ہی نہیں۔ کیا یہ سخت دلی کی نمایاں مثال نہیں ہے؟ پھر اس زمانے میں امریکی حکومت لاچاروں کی مدد کرنے کے قابل نہ تھی اور اچھی ملازمتیں بھی دستیاب نہیں تھیں۔ اس سے بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ جب شفیق القلب شوہر اور باپ نے اپنی بیوی اور بیٹیوں کو لاوارث چھوڑ دیا تو ان پر مصائب کے کیسے پہاڑ ٹوٹ پڑے ہوں گے۔

جولائی ۱۸۸۱ء میں آخر کار تنگ آ کر لیونٹین نے مقامی عدالت میں طلاق کا مقدمہ دائر کر دیا۔ اپنی درخواست میں اس نے یہ وجہ بیان کی:

''وہ اپنی بیوی اور بچوں پر دھیان نہیں دیتا بلکہ اس نے انہیں لاوارثوں کی طرح چھوڑ دیا ہے۔ اس نے انتہائی غیر ذمے داری کا مظاہرہ کیا ہے اور اپنی بیوی بچوں کو کسی قسم کا خرچ نہیں بھیجتا۔ اس نے انہیں نہ غذا فراہم کی ہے نہ کپڑے اور نہ رہنے کو مکان حالانکہ اب وہ اتنا امیر ہے کہ ہمارے اخراجات برداشت کر سکتا ہے۔''

مقدمہ چلتا رہا یہاں تک کہ نومبر ۱۸۸۳ء میں عدالت نے لیونٹین کے حق میں فیصلہ دے دیا۔ عدالت نے فیصلے میں لکھا:

''مدعا علیہ عدالت میں صرف ایک بار حاضر ہوا اور پھر کبھی نظر نہیں آیا۔ تفتیش کے دوران یہ بات سامنے آئی کہ وہ بیوی بچوں کے سلسلے میں اپنے حقوق ادا نہیں کر رہا اور اس لحاظ سے ان کا مجرم ٹھہرتا ہے۔ عدالت اس لیے میاں بیوی کے درمیان رشتے کو توڑنے کا حکم جاری کرتی ہے۔

اور یہ کہ مدعا علیہ کی دونوں بیٹیاں، ابیجل اور ہیلن کو ان کی ماں کے سپرد کیا جائے، وہ ہی ان کی پرورش اور دیکھ بھال کی ذمہ دار ہوگی۔

عدالت کی نظر میں مدعا علیہ بچوں کی دیکھ بھال کرنے کے سلسلے میں موزوں باپ نہیں۔ بچوں کی تعلیم و تربیت کے سلسلے میں اب مدعا علیہ کا کوئی تعلق نہیں ہوگا۔''

اس وقت تک اسکوفیلڈ کو پادری بنے چار برس ہو چکے تھے۔ طلاق ملتے ہی صرف تین ماہ بعد اسکوفیلڈ نے اپنی محبوبہ، بیٹی وان سے شادی کر لی۔ عیسائیوں کے ممتاز رہنما اور حضرت عیسیٰ کے حواری سینٹ پال (پطرس) انجیل میں شامل، تیم تھیس کے نام پہلے خط میں لکھتے ہیں کہ جو شخص پادری بننا چاہتا ہے، اس میں یہ خصوصیات ہونی چاہیے:

''یہ بات سچ ہے کہ جو شخص نگہبان کا عہدہ چاہتا ہے وہ اچھے کام کرنے کی خواہش کرتا ہے۔ پس اسے بے الزام، ایک بیوی کا شوہر، پرہیزگار، متقی، شائستہ، مسافر پرور اور تعلیم دینے کے لائق ہونا چاہیے۔ وہ نشے میں غل مچانے یا مار پیٹ کرنے والا نہ ہو۔ اپنے گھر کا بخوبی بندوبست کرتا اور بچوں کو کمال سنجیدگی سے تابع رکھتا ہو۔ (جب کوئی اپنے ہی گھر کا بندوبست نہ کر سکے، تو خدا کے کلیسا کی خبرگیری کیسے کرے گا؟)'' (۳:۲ تا ۵)

قارئین! اندازہ لگائیے کہ کیا اسکوفیلڈ اخلاقی لحاظ سے پادری بننے کے لائق تھا؟ اس نے تو اپنے بیوی بچوں کو لاواث چھوڑ کر حالات کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا۔ دیکھیے پطرس ایسے شخص کے بارے میں کیا کہتے ہیں:

''اگر کوئی اپنوں اور خاص کر اپنے گھرانے (خاندان) کی خبرگیری نہ کرے تو وہ ایمان کا منکر اور بے ایمان سے بھی بدتر ہے۔ (تیم تھیس کے نام پہلا خط۔ ۵:۸)

حضرت عیسیٰ ؑ کے بعد دنیائے عیسائیت کے سب سے بڑے اور مقبول رہنما کے نزدیک اسکوفیلڈ پرلے درجے کا ذلیل شخص ہے لیکن بیسویں صدی کے عیسائیوں کی عقل پر نجانے کیا پردہ پڑ چکا ہے کہ انھوں نے اسے مہاتما کے درجے تک پہنچا دیا۔

سزا یافتہ پادری بن گیا

جیسا کہ پہلے بتایا کہ ۱۸۷۹ء میں جیل کے دوران اسکوفیلڈ تقدیر مت کے نظریات سے واقف ہوا اور نتیجتاً نئے سرے سے پیدا ہونے والا عیسائی بن گیا۔ رہا ہونے کے بعد عیسائی دینیات سے ناواقف اور حقیقتاً ناخواندہ یہ نام نہاد وکیل جیمز ایچ بروکس سے عیسائی تعلیمات حاصل کرنے لگا۔ یہ بروکس صاحب امریکہ میں تقدیر مت کے بابا (Father) کہلاتے ہیں۔ بروکس نے اپنے 'ہونہار شاگرد' کی تربیت اس ماہرانہ انداز میں کی کہ وہ تقدیر مت کا 'بڑا عالم' بن گیا۔ اسکوفیلڈ خود کہتا ہے ''میں نے جیمز بروکس سے وہ کچھ سیکھا جو اس زمانے میں بڑے بڑے امریکی پادریوں کو بھی معلوم نہ تھا۔''

بروکس ہی نے ڈیوائٹ موڈی سے اس کا تعارف کروایا جو تب امریکی اناجیلیوں کا بڑا رہنما تھا۔ (تفصیل آگے آئے گی)۔ اسے یہ ذہین نوجوان بہت بھایا جو 'مطلب کی باتیں' بہت جلد سمجھ جاتا تھا۔ ان کی ذہنی ہم آہنگی کا نتیجہ یہ نکلا کہ جب پادری موڈی نے ۱۸۷۹ء کے اواخر میں تقدیر مت کے نظریات عیسائیوں تک پہنچانے کے لیے مہم چلائی، تو متعلقہ پادریوں کی فہرست میں اسکوفیلڈ کا نام بھی شامل تھا۔ سینٹ لوئیس میں کوئی بھی اس پادری کو نہیں جانتا تھا۔

اسکوفیلڈ اپنے پرانے الو مانتی دوستوں اور نئے دوستوں کی مدد سے 'ترقی' کرتا رہا۔ ان کا اثر ورسوخ ہر جگہ کام آیا اور راہ کی رکاوٹیں دور ہوتی رہیں۔ بروکس نے اپنی طرف سے اسے عیسائی دینیات میں طاق کر کے جولائی ۱۸۸۰ء میں ایک گرجے، پلگرم کانگری گیشنل کا پادری بنا دیا حالانکہ اسکوفیلڈ اس مرتبے کے لائق ہرگز نہ تھا۔ یقیناً بروکس جانتا تھا کہ اسکوفیلڈ نے اپنے خاندان کو لاوارث چھوڑ رکھا ہے مگر اسے تو اپنے ذہین شاگرد سے کئی کام لینے تھے، وہ سونے کی اس چڑیا کو ہاتھ سے کیسے جانے دیتا؟

اسی سال بروکس کی کوششوں سے اسے سینٹ لوئیس ایسوسی ایشن آف دی کانگری گیشنل چرچز نے بحیثیت پادری تبلیغ کرنے کا لائسنس بھی دے دیا۔ اسکوفیلڈ نے اس سنہرے موقع سے فائدہ اٹھایا اور ہائیڈ پارک کانگری گیشنل چرچ میں عیسائیت کی تبلیغ کرنے لگا۔ اس دوران جب کنساس میں یہ خبر پہنچی کہ ریاست کا سابق اٹارنی جنرل پادری بن چکا ہے، تو وہاں کئی اخباروں نے اس بدمعاش پر مضامین چھاپے اور اس کا پول کھول دیا۔ ۲۷ اگست ۱۸۸۱ء کو کنساس کے صدر مقام، توپیکا کے ممتاز اخبار 'دی ڈیلی کیپٹل' میں شائع ہونے والے مضمون میں سے ایک اقتباس درج ذیل ہے:

''کنساس کا سابق وکیل، سیاست دان اور بددیانت سائرس آئی اسکوفیلڈ دوبارہ منظر عام پر آ چکا ہے۔ شہرت حاصل کرنے کے لیے وہ ماضی کی طرح پھر ہاتھ پیر مار رہا ہے۔ بدذاتوں کا یہ پیر چند سال قبل دھوکا دہی اور جعل سازی کے مقدمات میں پھنسنے کے بعد ریاست اور اپنے کنگال خاندان کو چھوڑ کر کہیں اور بھاگ گیا تھا اور اس کے بارے میں کچھ معلوم نہ ہو سکا۔

''دو سال پہلے پتا چلا کہ وہ سینٹ لوئیس چلا گیا تھا جہاں اس کی امیر بیوہ بہن مقیم ہے۔ اس نے جن جن لوگوں کو ٹھگا تھا، انہوں نے وہاں اس کا گھیراؤ کر لیا۔ آخر کار امیر بہن نے ہر ایک کو منہ مانگی رقم دے کر اپنے بھائی کو ان کے چنگل سے آزاد کروایا۔ لیکن سینٹ لوئیس میں بھی اسکوفیلڈ دھوکے بازی کے کئی واقعات میں ملوث ہو گیا۔ ایک مقدمے میں اسے سزا بھی ملی اور وہ چھ ماہ جیل میں رہا۔ یہی مجرم اسکوفیلڈ اب سینٹ لوئیس میں پادری بن گیا ہے۔ وہ اس جامے میں کیا گل کھلاتا ہے، یہ آنے والا وقت ہی بتائے گا۔''

یہ مضمون اس امر کی شہادت ہے کہ اسکوفیلڈ کی روح شیطان کے نقش قدم پر چلنے کے لیے بے تاب رہتی تھی۔ پادری بن کر وہ امریکی ریاستوں کے مختلف گرجاؤں اور عیسائی تنظیموں سے وابستہ رہا۔ اس کے حلقہ احباب اور اثر و رسوخ میں اضافہ ہوتا رہا۔ تقدیریت اختیار کرنے والے کئی پادری اور وہ امریکی رہنما اس کے دوست بن گئے جن میں صیہونی اور اشترا کی پیش پیش تھے۔

ڈاکٹر بننے کی طرف پہلا قدم

۱۸۸۸ء میں خود ساختہ لکھاری اسکوفیلڈ کے قلم سے پہلا شاہکار نکلا۔ اس کتابچے کا نام 'دنیائے سچ کو تقسیم کرنے کا صحیح طریقہ' اس میں اسکوفیلڈ نے تقدیریت کے متفرق اصول، آسان فہم، زبان میں بیان کیے جو وہ تبلیغ کے دوران اپنے طلباء اور عام لوگوں کو بتاتا اور سمجھاتا رہا تھا۔ (یہی اصول یا قوانین بعد میں نوٹس کی شکل میں اسکوفیلڈ بائبل کا حصہ بنے)

بظاہر اسکوفیلڈ شمالی امریکہ میں بائبلی پیشین گوئیوں اور حضرت عیسیٰؑ کے ہزار سالہ دور (Millennial) کی اس تحریک کا رکن تھا جو جان ڈربی اور اس کے ساتھیوں نے شروع کی تھی مگر ساتھ ساتھ وہ اس کا اہم کردار بھی بنتا چلا گیا۔ وہ باقاعدگی سے بائبل کانفرنسوں میں بھی شرکت کرنے لگا جن کا مقصد تقدیریت کے نظریات پورے شمالی امریکا میں پھیلانا تھا۔ اس قسم کی کانفرنسیں ۱۸۶۸ء میں شروع ہوئیں اور بیسویں صدی کے اوائل تک جاری رہیں۔ ابتدا میں ان کا مقصد ایسی معاشرتی برائیوں کا سدباب کرنا تھا جو آزاد خیالی (Liberalism) کے باعث عیسائی معاشرے میں پھیل رہی تھیں۔ ان کانفرنسوں میں ہر فرقے کے عیسائی رہنما شریک ہوئے مگر بعد میں یہ تقدیریت کے پادریوں اور صیہونی رہنماؤں کی کٹھ پتلیاں بن گئیں کیونکہ تحریک آزاد خیالی کے پیچھے یہودی فلسفہ ہی کارفرما تھا۔

مثال کے طور پر ۱۸۷۸ء میں جب نیاگرا کے مقام پر بائبل کانفرنس منعقد ہوئی، تو ایک منظور کردہ قرارداد میں جان ڈربی کے فرقے اور صیہونی عیسائیت کے وہ نظریات پیش کیے گئے جن کا اسکوفیلڈ معتقد بن رہا تھا:

''ہمیں یقین ہے کہ دنیا حالیہ دور میں (عیسائی) نہیں بنے گی بلکہ روز حساب (قیامت) قریب آ رہا ہے۔ جلد عیسائی دنیا میں ارتداد کی زبردست لہر پھیلے گی، اس کے بعد حضرت عیسیٰؑ نازل ہو کر ہزار سالہ دور کا آغاز کریں گے، تب اسرائیل (یہودیوں) کو ان کی زمین پر آباد کیا جائے گا اور دنیا پر خدا کی حکمرانی قائم ہو گی۔ ہر عیسائی کو چاہیے کہ وہ شدت سے اس وقت کا انتظار کرے کیونکہ اس کے آنے کی پیشین گوئی انجیل میں ہے۔''

۱۸۹۰ء میں اسکوفیلڈ نے ''بائبل خط کتابت اسکول'' شروع کر دیا، ساتھ ساتھ وہ عیسائی دینی اسکولوں میں تعلیم بھی دینے لگا۔ لوتھر رالیس اس کا چہیتا شاگرد تھا۔ ۱۸۹۲ء میں لوتھر پادری بنا تو اس موقع پر منعقدہ تقریب میں اسکوفیلڈ نے تقریر کی۔ وہ بعد از اں کتابچے 'حضرت عیسیٰؑ مبلغ کی حیثیت

سے' کے نام سے شائع ہوئی۔ اس میں پہلی مرتبہ اسکوفیلڈ نے اپنے آپ کو 'ڈاکٹر' قرار دے دیا۔ وہ نیا عیسائی بن کر بھی دھڑلے سے جھوٹ بولنے سے باز نہ آیا۔ اس قسم کا کوئی ثبوت نہیں ملتا کہ کسی تعلیمی ادارے نے اسے ڈاکٹریٹ کی اعزازی ڈگری بھی دی ہو، وہاں تعلیم حاصل کرنا تو دور کی بات ہے۔

بہر حال ڈاکٹر بن کر اسکوفیلڈ نے یقیناً عام لوگوں کی نظر میں اپنا قد و قامت بڑھا لیا اور یہی اس کے صیہونی سرپرست چاہتے تھے۔ ۱۹۰۱ء تک اس نے بیرون ملک خصوصاً برطانیہ میں مقیم تقدیر مت کے چاہنے والوں اور صیہونی رہنماؤں سے تعلقات قائم کر لیے۔ ان کی کوششوں سے ۱۹۰۱ء کے اوائل میں 'ڈاکٹر صاحب' کو نیویارک کے ایک 'معزز' کلب لوٹس (Lotos) کی رکنیت مل گئی۔

لوٹس کلب دراصل نیویارک کے صحافیوں، مصوروں، موسیقاروں، ادیبوں، ماہرین سائنس وغیرہ کا ٹولہ تھا جن میں بیشتر یہودی یا اشترا کی تھے۔ اس کا مقصد فن کاروں کے مابین معاشرتی میل ملاپ بڑھانا تھا۔ بوجھیے اس کا سربراہ کون تھا؟ جی ہاں سموئیل انترمیئر!

کلب کے رکن صرف فن کار ہی بن سکتے تھے۔ اس وقت اسکوفیلڈ نہ ادیب تھا نہ فنون لطیفہ کی کسی شاخ کا ماہر مگر کئی صیہونی اس کی پشت پناہ تھے۔ اسی لیے اسے لوٹس کلب کا رکن بنا لیا گیا حالانکہ لادینی تنظیم میں ایک پادری کا کیا کام؟ اسکوفیلڈ عام رکن نہیں تھا، اگلے بیس برس اس کی رہائش کا پتا کلب ہی تھا۔

دراصل اسی کلب میں یہ منصوبہ باقاعدہ طور پر ترتیب پایا "ایک حوالہ جاتی (ریفرنس) بائبل لکھی جائے جو دنیائے عیسائیت میں نئے دور کا پیش خیمہ ثابت ہو"۔ یہ انقلابی بائبل لکھنے کا سہرا ڈاکٹر اسکوفیلڈ کے سر باندھا گیا۔ اس نے فوراً تحقیق شروع کر دی اور تقدیر مت کے نظریے چن چن کر اس طرح ترتیب دیے کہ انہیں کنگ جیمز بائبل میں متعلقہ جگہوں پر موزوں کیا جاسکے۔ تحقیق میں صیہونی اور تقدیر مت کے دیگر 'علماء' بھی موصوف کی مدد کرتے رہے۔

۱۹۰۱ء تا ۱۹۰۷ء اسکوفیلڈ نے سوئٹزرلینڈ اور برطانیہ کے کئی چکر لگائے تاکہ وہاں کے علماء سے بائبل کی تیاری کے سلسلے میں تبادلہ خیال کرے اور معلومات لے سکے۔ تحقیق کے دوران وہ تقریباً ایک برس سوئٹزرلینڈ مقیم رہا۔ اسی برس وہاں عالمی صیہونی کانگریس بھی ہوئی۔ یہ اتفاق کی بات نہیں تھی۔ پھر وہ لندن اور کیمبرج یونیورسٹی میں مقیم رہا۔ جب اس کے پاس 'وافر مواد' جمع ہو گیا تو اس نے نیویارک میں بیٹھ کر اسکوفیلڈ بائبل لکھ ڈالی۔ لکھنے کے دوران اسے تقدیر مت کے پادریوں، ڈیوائٹ معذی اور آرنو گلیلین سے خصوصی مدد ملی۔

یہ معمولی کام نہیں تھا، اس کے لیے بڑا وقت اور سرمایہ درکار تھا۔ اسکوفیلڈ کے پاس وقت تو تھا مگر اسے سرمائے کی ضرورت تھی۔ الومانتی کے وابستہ یہودیوں نے اسے دل کھول کر رقم فراہم کی، آخر ان کی تمنا بر آرہی تھی۔ تقدیر مت کے بھیس میں صیہونی نظریوں کو بائبل میں جگہ ملنے والی تھی۔ اسکوفیلڈ بائبل کی تکمیل کے بعد اسے شائع کرنے کا مرحلہ آیا۔ صیہونی چاہتے تھے کہ اس کی اشاعت وسیع پیمانے پر کی جائے، خوب تشہیر بھی ہو تاکہ دنیا کا کوئی بڑا ناشر اسے شائع کرے۔ خود بخود ان کی نظر کے مشہور اور معزز اشاعتی ادارے آکسفورڈ یونیورسٹی پریس پر جا ٹھہری۔ اس ادارے سے تقدیر مت اور صیہونیت کے کئی رہنماؤں کے روابط تھے۔ مشہور زمانہ صیہونی خاندان، روتھ شیلڈز نے بھی اس میں سرمایہ کاری کر رکھی تھی۔ ۵

جون ۱۹۰۷ء کو اسکوفیلڈ نے اپنی بائبل چھپوانے کے سلسلے میں آکسفورڈ یونیورسٹی پریس سے معاہدہ کرلیا۔

کیا یہ بات عجیب نہیں لگتی کہ دنیا کا ایک بہت بڑا اشاعتی ادارہ ایک چھوٹی سی کتاب اور چند کتابچوں کے مالک مصنف کی کتاب شائع کرنے پر رضامند ہوگیا؟ اسکوفیلڈ عبرانی، آرامی یا یونانی زبان میں سے کوئی زبان نہیں جانتا تھا جن میں بائبل کے قدیم ترین نسخے لکھے گئے تھے۔ اس کے پاس کوئی ڈگری نہیں تھی، وہ کئی مقدمات میں ملوث اور اپنے بیوی بچوں کا مجرم تھا، اس کے باوجود آکسفورڈ یونیورسٹی پریس جیسے مستند اشاعتی ادارے نے اس سے معاہدہ کرلیا۔

حوالہ جاتی بائبل لکھنا بچوں کا کھیل نہیں، اسے لکھنے کے لیے معلومات میں جتنی گہرائی ہونی چاہیے، وہ عمر بھر مطالعہ کرنے ہی سے حاصل ہوتی ہے۔ اسکوفیلڈ کی زندگی میں مطالعے کا یہ معیار ہرگز نظر نہیں آتا۔ صاف ظاہر ہے کہ انہی صیہونیوں ہی نے معزز اشاعتی ادارے سے اسکوفیلڈ کا معاہدہ کروایا جنھوں نے اس سے بائبل لکھوائی اور اسے 'ڈاکٹر' بنایا تھا۔

اسکوفیلڈ بائبل چھپوانے کے لیے انترمیئر نے خود بھی رقم فراہم کی اور دوسرے صیہونی، فری میسنری اور اشترا کی رہنماؤں سے بھی مدد لی جن میں سموئیل گومپرز، فیوریلو لاگارڈیا، ابراہام سٹراس، برنارڈ برانڈیز، جیکب شیف، بیزمان ڈیلے وغیرہ نمایاں تھے۔ انہی لوگوں نے ۱۹۰۱ء سے لے کر ۱۹۱۰ء تک اسکوفیلڈ کے سارے اخراجات برداشت کیے، اسے یورپ کے دورے کروائے، بائبل چھپوائی اور اسے وسیع پیمانے پر تقسیم کروانے کا بندوبست کیا۔

انہی صیہونی رہنماؤں نے ہر ممکن کوشش کی کہ کس طرح لوگوں کے سامنے 'ڈاکٹر' اسکوفیلڈ کا ماضی سامنے نہ آنے پائے اور وہ سات پردوں کے پیچھے چھپ جائے۔ انہوں نے اس کی قابلیت، انسان دوستی اور نیکیوں کے خوب چرچے کیے اور اسے ایک بڑے عالم کی صورت میں پیش کیا۔

لیکن افسوس ان کی محنت رنگ نہ لا سکی اور آج غیر جانب دار اور انصاف پسند عیسائی مؤرخ اس کا کچا چٹھا دنیا کے سامنے لا رہے ہیں۔ ان ہی کی تحریروں کی روشنی میں یہ مضمون تیار ہوا ہے۔ سچ کو لاکھ پردوں کے پیچھے بھی چھپا دیا جائے تو ایک دن وہ طشت از بام ہو کر رہتا ہے۔

۱۹۰۱ء کے بعد اسکوفیلڈ کو روپے پیسے کی کبھی تکلیف نہ ہوئی مگر نیکی جیسے اسے چھو کر بھی نہیں گزری تھی۔ اس کی بیٹیوں، ابجیل اور ہیلن نے کئی بار باپ سے مالی مدد مانگی مگر وہ ہر بار انہیں یہی جواب دیتا ''آج کل میرے پاس پھوٹی کوڑی تک نہیں، بڑی تنگی کی زندگی بسر کر رہا ہوں۔'' ثابت ہوا کہ وہ کنجوس ہونے کے علاوہ شفقت پدری سے عاری انسان تھا۔ حالانکہ ۱۹۱۰ء کے بعد اسے اپنی بائبل کی بھاری بھر کم رائلٹی بھی ملنے لگی تھی۔

اسکوفیلڈ اپنی 'تہلکہ خیز' بائبل لکھنے کے بعد امریکا کے مختلف گرجوں اور مذہبی اداروں سے وابستہ رہا۔ یہاں تک کہ ۲۴ جولائی ۱۹۲۱ء کو اللہ تعالیٰ نے اسے اپنے پاس بلالیا۔ پتا نہیں اس نے حضرت عیسیٰؑ کا سامنا کیسے کیا ہوگا۔ اس کی دنیاوی آرام گاہ نیویارک میں ہے۔

امریکہ میں بنیاد پرستی

(تحریر: نعیم الحق)

(ترجمہ: مشتاق احمد ضیاء)

اگرچہ بہت سے مغربی لوگوں نے اسلامی بنیاد پرستی پر الزام لگایا ہے کہ وہ آج دنیا میں موجود ابتری کی ذمہ دار ہے لیکن امریکہ میں موجود عیسائی بنیاد پرستی پر گہری نظر اس نتیجے تک پہنچنے میں مدد دیتی ہے۔ کہ (عیسائی بنیاد پرستی پر مبنی) یہ طاقتور تحریک عالمی امن کے لئے ایک خوفناک خطرہ بن چکی ہے۔ حالیہ سالوں میں امریکہ ایک معاشرے کے طور پر پہلے سے کہیں زیادہ مذہبی بن چکا ہے اور اس نے سیاسی معاملات کو پہلے کی نسبت زیادہ مذہبی تناظر میں دیکھنا شروع کر دیا ہے۔ اس (تحریک) نے عیسائی بنیاد پرستوں کو اس قابل بنا دیا ہے کہ وہ امریکہ کے لئے سیاسی ایجنڈے کا تعین کریں اور اس پر اثر انداز ہوں۔ اس سے امریکہ کے دنیا پر غلبے کے حوالے سے حقیقی ارادوں کے بارے نئے سوالات جنم لے رہے ہیں۔ امریکی خارجہ پالیسی پر ان بنیاد پرستون کا اثر آج سے پہلے اتنا زیادہ کبھی نہیں تھا۔

ایونجلیسٹس (عیسائیوں کی تبلیغی جماعت Vangelists) کے زیر اثر ریلیجس رائٹ (دائیں بازو کے مذہبی لوگ Religious Right) کے نام سے معروف اس طاقتور تحریک نے امریکی خارجہ پالیسی پر اثر انداز ہونے اور اسلام کو اپنا بنیادی حریف قرار دینے کی خواہش میں اسرائیل کے دفاع اور سلامتی کو اپنا مقصد اولیں بنا رکھا ہے۔ یہ ایک خطرناک اور بدقسمت پیشرفت ہے جو دنیا کے دو بڑے مذاہب اسلام اور عیسائیت کے مابین عدم موافقت پر غیر ضروری زور دیتی ہے۔

اس کی ایک اہم وجہ عیسائیوں کا Pre-Millennial Dispensatioanlism (حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ہزار سالہ دور حکومت سے پہلے کے نظام) کے عقیدے پر یقین ہے۔ اس عقیدے کے مطابق انسانیت حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کے دور سے پہلے اصلاح احوال کے لئے نازل شدہ احکامات اور وعدوں پر مبنی نظام، عہد کلیسا میں داخل ہو چکی ہے۔ اس ہزاریے (Millenniam) کا سبب حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کی دوسری آمد ہوگی جو عالمگیر سلطنت کی بنیاد رکھیں گے جس کا مرکز یروشلم ہوگا۔ تاہم حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کی واپسی سے پہلے اس جوش و جذبے کا ظہور ہوگا جس میں خدا معافی کے لئے دوسرا موقع دینے کی خاطر کچھ لوگوں کو دوبارہ زندہ کرے گا اور زندہ لوگوں میں سے نجات کے

لئے منتخب لوگوں کو آسمان پر اٹھا لے گا۔ جو پیچھے رہ جائیں گے وہ دجال کی ہلاکت اور سات سالہ مصیبت کے خوف کو برداشت کریں گے جو (بائبل میں مذکور) دنیا کے اختتام پر اسرائیل میں ہونے والی خیر و شر کے مابین لڑائی (Armagaddon) میں عروج پر ہوگی۔ حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) اس کشت وخون کے دوران آئیں گے اور ہزار سالہ حکمرانی کی بنیاد رکھیں گے۔ اس عقیدے کے مطابق مسجد اقصیٰ کی جگہ یہودی عبادت گاہ کی تعمیر حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کی آمد کے لئے شرط ہے۔ چنانچہ ایک یہودی ریاست کی مذہبی اہمیت یروشلم پر اقتدار اعلیٰ کے ساتھ مشروط ہے۔

اپنے عالمی نقطہ نظر کے اظہار میں ریلیجس رائٹ کے امریکی رہنماؤں کے عصر حاضر کے قدامت پسند سیاستدانوں اور مفکروں کی صورت میں ایک مثالی ساتھی مل گیا ہے جنہیں بش کے دونوں ادوار کی انتظامیہ پر غلبہ حاصل ہے۔ ڈک چینی (Dick Cheney) ڈونلڈ رمز فیلڈ (Donald Rumsfeld) کارل رو (Karl Rove) رچرڈ پیرل (Richard Perie) پال ولفووٹز (Paul Wolfowitz) ڈک فیتھ (Doug Feith) اور برنارڈ لوئس (Bernard Lewis) نے بش انتظامیہ کے خطرناک اور تباہ کن لائحہ عمل کی تشکیل کو امریکی مفادات کو لاحق خطرے سے نبٹنے اور دنیا پر غلبے کی طرف پھیر دیا ہے۔ ریلیجس رائٹ اور عصر حاضر کے قدامت پسندوں کے زیر اثر بش انتظامیہ نے امریکی پالیسیوں کے مخالف ممالک میں تبدیلیاں لانے اور ان پر دباؤ ڈالنے کے لئے فوجی دھمکی اور اقدام کے استعماری تصور کی پیروی شروع کر دی ہے۔ اسرائیل کی 1967ء سے پہلے کی سرحدوں تک واپسی کے ساتھ آزاد فلسطین کا قیام امریکہ میں یہود و نصاریٰ بنیاد پرست قدامت پسندوں کے طاقتور اتحاد کے لئے ہنوز ناقابل قبول ہے۔ نتیجے کے طور پر صدر بش نے فلسطین کی آزادی کا ٹائم ٹیبل اپنے ذمے لینے سے انکار کر دیا ہے اور مشرق وسطیٰ میں امن کے لئے روڈ میپ پر مذاکرات شروع کرنے کے اقدامات کو پس پشت ڈال دیا ہے۔ یہ بہت زیادہ غیر ذمہ دارانہ اور قابل افسوس اقدام ہے۔

9/11 کے نتائج وعواقب میں امریکہ میں عیسائی بنیاد پرستوں کی طرف سے اسلام کی غلط تصویر کشی مسلسل جاری ہے۔ پیٹ روبرسن (Pat Roberson) جیری فلاویل (Jerry Flawell) فرینکلن گراہم (Franklin Graham) جیسے معروف مبلغ باقاعدگی سے اسلام اور حضور (ﷺ) کے حوالے سے تنقید اور توہین کر رہے ہیں۔

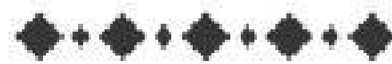
عراق میں جنگ کے انعقاد پر ان کا اثر اتنا مضبوط رہا ہے کہ محض گزشتہ دو سالوں کے دوران وہ بش انتظامیہ کے درپے رہے ہیں کہ وہ انہیں مقبوضہ بغداد میں کم از کم نو ایونجلک چرچ بنانے کی اجازت دیں۔ پیٹ رابرسن (Pat Roberson) نے حال ہی میں وینزویلین صدر ہوگو شاویز (Hugo Chavez) کو قتل کرنے کا مطالبہ کیا ہے کیونکہ وہ امریکی پالیسیوں کی مخالفت کرتا رہا ہے۔ کنزرویٹو سکالرز کی ایک بڑی تعداد نے ان کے زیر اثر اسلام کے ''خطرات'' کے بارے میں بہت زیادہ لکھا ہے۔ وہ اسلام کو مغربی طرز حیات کے لئے سب سے بڑا خطرہ قرار دیتے ہیں۔ حتیٰ کہ ان میں سے چند سکالرز نے قرآن کی اپنے طور پر تشریح کی جو اس مقدس کتاب کے بہت زیادہ غلط اور منفی تاثر کا باعث بن رہی ہے۔

کانگریس میں طاقتور حامیوں کے ہمراہ امریکہ میں ایک مضبوط عیسائی زیونسٹ (یہودیوں کو پھر سے فلسطین میں آباد کرنے کی حامی Zionist) تحریک کا قیام بھی اس بات کو یقینی بنانے کی بھرپور کوشش کا حصہ ہے کہ امریکہ یروشلم میں دارالحکومت کے ساتھ اقتدار اعلیٰ کا حامل فلسطین بنانے کے لئے اقدام کرنے سے باز رہے۔ عیسائیوں اور یہودیوں کی عالمی جماعت پورے امریکہ کے کلیساؤں میں اسرائیل کے لئے یوم دعا مناتی ہے۔ اس کے رہنماؤں نے فلسطینی ریاست کو نامناسب قرار دیا ہے۔ وہ القائدہ، ایران، صدام کے عراق، شام، سعودی عرب، حماس اور حزب اللہ کو ''برائی'' کے طور پر دیکھتے ہیں۔ مشہور برطانوی ناول نگار نے کچھ عرصہ پہلے ایک مضمون میں اعلان کیا کہ بنیاد پرست عیسائیت نے امریکہ کو' تاریخی پاگل پن' کے دور میں دھکیل دیا ہے۔

عیسائی بنیاد پرست عراقی جنگ کو صلیبی جنگ کے طور پر دیکھتے ہیں۔ نیشنل ایسوسی ایشن آف ایونجلیکلز (National Association of Evangellicals) کے سربراہ کائل فسک (Kyle Fisk) کہتے ہیں، ایران، لیبیا اور مشرق وسطیٰ میں حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کی انجیل پھیلانے کے لئے عراق مرکز بنے گا۔ آزاد عراق اس امر کو ممکن بناتا ہے کہ حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کی تعلیمات ان اقوام میں بھی پھیلائیں جہاں قانون ہمیں باہر رکھتا ہے۔ بش انتظامیہ کے بہت سے اعلیٰ افسران عراقی جنگ کو 'برائی کے خلاف لڑائی'' کے طور پر دیکھتے ہیں۔ صدر بش نے اپنے 2002ء کے سٹیٹ آف یونین ایڈریس (State of Union Address) میں اچھائی اور برائی کے درمیان جنگ کی وضاحت کرتے ہوئے اسی امر پر زور دیا۔ انہوں نے کہا: آپ یا تو ہمارے ساتھ ہیں یا دہشت گردوں کے۔ ڈیلی مرر (Daily Mirror) کے ایک حالیہ مضمون میں بش نے بلیئر سے اپنی اس خواہش کا اظہار کیا کہ ان کا دل چاہتا ہے کہ قطر میں الجزیرہ ٹی وی سٹیشن کو امریکہ مخالف پروگرام نشر کرنے کے باعث بموں سے اڑا دیا جائے۔ اس سے صرف یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ انتہا پسندی نے موجودہ امریکی قیادت میں ایک قدرتی حلیف پا لیا ہے۔

ریلیجیس رائٹ کی زبردست قوت کا امریکی سیاست میں آزاد خیال اور ترقی پسند قوتوں کی نفسیات پر اثر خاصا پریشان کن ہے۔ ڈیموکریٹک پارٹی کے اکثر رہنما اہم قومی و بین الاقوامی امور پر درمیانی راہ اپناتے اور روایتی آزاد خیال پوزیشن لینے سے دور جاتے دکھائی دے رہے ہیں۔ امریکہ میں دائیں اور بائیں بازو کے مابین کشمکش کبھی بھی اتنی شدید نہیں رہی۔ آزاد خیال مشرقی اور مغربی ساحلی ریاستوں کے مابین امریکی سیاسی میدان قدامت پسند ریلیجیس رائٹ کے حامیوں پر مشتمل ہے جو کسی بھی قومی انتخاب میں زبردست قوت تشکیل دیتے ہیں۔

سچ تو یہ ہے کہ امریکہ کے عیسائی بنیاد پرست دنیا کی عیسائی اکثریت کے خیالات کی ترجمانی نہیں کر رہے۔ یورپ، لاطینی امریکہ، افریقہ اور ایشیا میں اکثر عیسائیوں کے خیالات ایک دوسرے سے نہیں ملتے کیونکہ یورپ میں چرچ خالی پڑے ہیں جب کہ ایشیا، افریقہ اور لاطینی امریکہ کے غریب لوگوں کی توجہ کا زیادہ تر ارتکاز اپنے معاشی مسائل پر ہے۔ ہوسکتا ہے کہ امریکہ کے عیسائی بنیاد پرست سیاسی امور کی وضاحت مذہبی نقطہ نظر سے کرنے کی کوشش میں خود کو تنہا پائیں۔



صدرامریکہ جارج ڈبلیو بش صلیب کو تلوار بنانا چاہتے ہیں؟

(قیصر محمود وڑائچ کا عراق اور افغانستان کے پس منظر میں تجزیہ)

11 ستمبر 2001ء کے روز آسمان سے گرنے والے طیاروں نے امریکی شہر نیویارک میں قیامت صغریٰ برپا کردی۔ تین ہزار سے زائد افراد لقمہ اجل بن گئے اور امریکی اقتصادیات کی عظمت کا علمبردار ورلڈ ٹریڈ سنٹر ملبے کے ڈھیر میں بدل گیا۔

امریکی صدر بش جونیئر نے حملے کے بعد آنے والی اتوار کو قوم سے خطاب کرتے ہوئے کہا یہ کہ صلیبی جنگ ہے، یہ دہشت گردی کے خلاف جنگ ہے، جو شروع ہوگئی ہے، یہ ایک نئی قسم کی جنگ ہے جو ایک نئی قسم کی شیطنت کے خلاف ہے۔

امریکی ذرائع ابلاغ کی درجنوں تاویلوں کے باوجود یہ بات واضح ہے کہ امریکی صدر نے کروسیڈ کا لفظ بلا سوچے سمجھے استعمال نہیں کیا، کیونکہ بعد میں پیش آنے والے حالات نے ثابت کردیا کہ تیسری ہزاروی میں امریکی بمبار طیاروں کی عراقی اور افغان عوام پر اندھا دھند اور بلا امتیاز کلسٹر اور تھرموبیرک بموں کی بارش نے لاکھوں مسلمانوں کو موت کی نیند سلا دیا۔ انگریزی ڈکشنریوں میں کروسیڈ کے مرکزی معنی اس تاریخ کا بیان ہے، جس میں ہزاروں مسلمانوں کو مقدس عیسائیت کے نام پر موت کی وادی میں دھکیل دیا گیا تھا۔ کنسائز اوکسفورڈ ڈکشنری میں اس کے معنی انتہائی سرگرم تحریک کے ہے، (کسی برائی کے خلاف جیسے غربت)۔ کروسیڈ قدیم لاطینی زبان کے لفظ کروسی ایڈا سے ماخوذ ہے، جس کے معانی صلیب کا نشان زدہ ہے۔ اس لفظ سے وابستہ یادیں اتنی ہولناک ہیں کہ کروسیڈ کا ذکر آتے ہی یورپ کے جنگجوؤں کے جنگی جرائم آنکھوں کے سامنے گردش کرنے لگتے ہیں۔ آج سے ایک ہزار سال قبل صلیبی جنگجو مسلمانوں کے کٹے ہوئے سر قلعے کی دیواروں کے اوپر سے اندر پھینک رہے تھے، جہاں مسلمان فوج محصور تھی۔ بالکل اسی طرح جس طرح امریکی جنگی طیارے عراق اور افغانستان کے معصوم شہریوں پر آسمان سے موت برسا رہے ہیں۔ امریکی تھرموبیرک اور کلسٹر بموں کا نشانہ بننے والے بے گناہ اور معصوم افغان اور عراقی شہریوں کو اس بات کا علم تک نہیں تھا کہ انہیں کس جرم میں قتل کیا جارہا ہے، سوائے اس بات کے کہ وہ مسلمان تھے۔ آج سے ایک ہزار سال قبل یروشلم میں مسلمانوں کے قتل عام کے بارے میں پوپ کے نام لکھے ہوئے ایک خط میں صلیبی جنرل مسلمانوں کے اندھا دھند قتل عام کے بارے میں لکھتا ہے کہ میں یروشلم کے جس مقام پر کھڑا ہوں، خون مسلم میں میرے ٹخنے ڈوبے ہوئے ہیں اور تاحد نظر انسانی انسانی جسموں کے ٹکڑے، سر، کٹے ہوئے بازو اور انسانی جسم نظر آرہے ہیں۔ پورے شہر میں انسانی خون کی

بوپھیلی ہوئی ہے۔عراق اور افغانستان میں امریکی بمباری اور یروشلم میں یورپی صلیبیوں کے ہاتھوں مارے جانے والے بے گناہ انسانوں کا صرف اتنا قصور تھا کہ وہ مسلمان تھے۔

امریکی ذرائع ابلاغ کروسیڈ کے لفظ کے حوالے کو محض ایک اتفاق قرار دے رہے ہیں اور یہ بات ثابت کرنے کی کوشش میں مصروف ہیں کہ مغرب ایک صدی قبل عیسائیت کو ترک کر کے سیکولرازم کو اپنا چکا ہے۔ بوسٹن ڈاٹ کام کے مطابق مغرب کے لئے ضروری ہے کہ وہ مسلم امہ کو یہ باور کروانے کی کوشش کرے کہ مغرب اور یورپ کی یہ جنگ عرب دنیا اور مسلمانوں کے خلاف نہیں ہے بلکہ یہ فرد واحد کے خلاف جنگ ہے جو بدی کی علامت ہے، جسے روکنے کے راستے تلاش کرنے کے لئے یہ جنگ لڑی جارہی ہے۔"

حالانکہ کروسیڈ یورپ کے عیسائیوں کے فلسطین پر 1098ء تا 1270ء کے درمیان کئے جانے والے حملوں کا ایک طویل سلسلہ تھا۔ یورپی صلیبی جنگجوؤں نے یروشلم کو مسلمانوں سے آزاد کروانے کے لئے فلسطین کے علاقے پر بار بار چڑھائی کی۔ ابتداء میں یورپی صلیبیوں کو کامیابی ملی ہوئی، لیکن 112 سال طویل جنگ میں آخری فتح مسلمانوں کو نصیب ہوئی، بش نے اپنے خطاب میں کہا تھا کہ یہ ایک طویل جنگ ہے جو کئی برس جاری رہ سکتی ہے۔ عرب مؤرخوں نے یورپی درندگی کی اس داستان کو حرب الصلیب کے نام سے تاریخ کے صفحات میں محفوظ کر دیا ہے، جس کا ایک ایک لمحہ یورپی عیسائیوں کی درندگی اور مسلمان قیدیوں، بچوں، عورتوں اور بوڑھوں کے ساتھ "حسن سلوک" کی داستان بیان کر رہا ہے۔ یورپ کے بعض بڑے مستند مؤرخوں نے بھی مسلمانوں کی آخری فتح کے بعد ان کی انسان دوستی کا اعتراف کیا ہے۔

اسامہ بن لادن نے اپنی تنظیم کا نام ہی یہود و نصاریٰ کی صلیبی جنگ کے خلاف جہاد رکھا تھا اور صدر بش کی جانب سے افغانستان پر حملے کے لئے کروسیڈ کے لفظ کا استعمال بن لادن کی جدوجہد کے برملا اعتراف کا اظہار تھا۔ 11 ستمبر کے حملے کے بعد عرب ذرائع ابلاغ نے بش کروسیڈ کو انتہائی نمایاں کر کے شائع کیا اور اس لفظ کے استعمال کی صدائے بازگشت توقعات سے کہیں زیادہ گہری ثابت ہوئی۔ کروسیڈ کے اعلان نے نہ صرف مغرب نواز مسلمانوں، بلکہ امریکی اتحادیوں کو بھی پریشان کر کے رکھ دیا، کیونکہ صلیبی جنگوں کی طویل فوجی مہمات مغربی تہذیب کو موجودہ شکل دینے میں اہم موثر ثابت ہوئیں۔ اس جنگ کے نتیجے میں تشکیل پانے والی سیاسی، اقتصادی، سماجی یہاں تک کہ مذہبی اصلاحات اور روایات یوریشیا سے ہوتی ہوئی برطانوی جزائر اور پھر عرب دنیا تک جا پہنچیں۔

11 ستمبر کے حملے کا ردعمل ظاہر کرنے کے لئے سارا بوجھ امریکی صدر کے کندھے پر تھا۔ اسی طرح آج سے ایک ہزار سال قبل ایسی ہی مایوس کن صورت حال کا سامنا بش کے روحانی جد امجد کیتھولک پوپ کے سر پر تھا۔ پوپ کو ایک صدی قبل گم ہو جانے والی عیسائی ریاست کے دوبارہ قیام کے لئے یورپ کے انتہا پسند عیسائی لیڈروں اور عام شہریوں پر انحصار کرنا پڑا تھا۔ پوپ نے مقدس جنگ کا نعرہ لگاتے ہوئے یورپی شہریوں کو اکسایا تھا کہ عیسائیوں کے مقدس مقامات پر مسلمان کافروں کا قبضہ ہے۔ جسے آزاد کروانا عالم عیسائیت کا مذہبی فریضہ ہے۔ پوپ کے اعلان کے چند ہی ماہ کے اندر ایک لاکھ عیسائی جنگجوؤں نے (موجودہ آبادی کے تناسب سے 10 لاکھ) مسلمانوں سے جنگ آزمائی کے لئے صلیب اٹھا لی۔

حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کے نام پر یہ صلیبی جہاں بھی گئے، انہوں نے درندگی، وحشت و ظلم کی دل ہلا دینے والی داستانیں رقم کیں عیسائیوں

نے حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) سے اظہار وابستگی کے لئے اپنی چھاتیوں پر کراس کے نشان کندہ کروالئے اور عیسائیت کے بنیادی تصور میں اہم تبدیلیاں کرلیں۔ صلیبی جنگ سے قبل عیسائیت کا بنیادی نظریہ حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کا دوبارہ زندہ ہوکر انسانی شکل اختیار کرنا تھا لیکن اس تصور پر حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کا پھانسی پر چڑھ جانے کا المناک تصور غالب آگیا۔ حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کی المناک موت (عیسائی نقطہ نظر سے) کے تصور نے عیسائیت میں تشدد اور درندگی کو ایک مقدس عمل کے طور پر داخل کردیا، اس کے ساتھ ہی جنگ میں مارے جانے کی صورت میں امر ہوجانے کا بھی فلسفہ بھی داخل کردیا گیا، جبکہ اسلام میں اللہ کی راہ میں مارے جانے کی صورت میں شہید کا تصور پہلے دن ہی سے موجود تھا۔

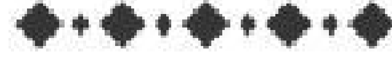
11 ستمبر کے فدائی حملہ آور شائد اس بات پر پختہ یقین رکھتے تھے کہ اپنے مقصد کو پالینے کے لئے مارے جانے یا خود کو مار لینا ایک ہی عمل ہے۔ صلیبی جنگوں کے دوران عیسائیت نے بھی یہی نظریہ اپنالیا تھا کہ صلیبی جنگ میں مارے جانے والوں کو جنت میں جگہ ملے گی۔ یہی وجہ ہے کہ صدر بش نے انتقام کا لفظ استعمال کرنے کی بجائے کروسیڈ کا لفظ استعمال کیا، جس کے مفہوم سے وہ بخوبی آگاہ تھے، کیونکہ بش ایک انتہا پسند عیسائی ہیں اور حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) ان کے محبوب ترین فلسفی رہنما ہیں لیکن یہ حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) وہ نہیں ہیں، جن کا ارشاد ہے کہ اگر کوئی ایک گال پر تھپڑ مارے تو دوسرا آگے کردو، ایشیا ٹائمز کی رپورٹ (دی بش کروسیڈ) کے مطابق جس عیسیٰؑ کے بش پیروکار ہیں، اس نے صلیب کو تلوار کا نشان بنا رکھا ہے۔ صلیبی جنگوں میں مقدس زندگی کے حصول کے نام پر لاکھوں مسلم شہریوں کو ایک ہزار سال قبل شہید کردیا گیا، یہی عمل اب بش کی سربراہی میں جاری ہے۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق افغانستان، عراق اور فلسطین میں ڈیڑھ لاکھ مسلمان شہید کئے جاچکے ہیں اور یہ عمل بغیر کسی رکاوٹ کے اب بھی جاری ہے۔

بش کی موجودہ کروسیڈ کا سب سے خطرناک پہلو یہ ہے کہ کہیں یہ جنگ مسلمانوں اور عیسائیوں کے درمیان مذہبی جنگ میں تبدیل نہ ہوجائے، اگر ایسا ہوگیا جس کے اب واضح امکانات نظر آرہے ہیں، تو اس جنگ میں ہونے والی تباہی تصور سے کہیں زیادہ المناک ہوگی۔ امریکہ میں اگرچہ مذہب اور سیاست کے لئے دو علیحدہ پلیٹ فارم ہیں لیکن امریکہ خود کو عیسائیت کا سب سے بڑا محافظ قرار دیتا ہے۔ سابق امریکی صدر آئزن ہاور کے وزیر خارجہ نے ایک بار کہا تھا کہ اشتراکیت کی مخالفت کی سب سے بڑی وجہ اس مکتب فکر میں خدا کے وجود کی عدم موجودگی ہے۔

بش کا منصوبہ اتنا وسیع اور بے حد پیچیدہ حکمت عملی کا مجموعہ ہے، جس میں سازش، عقیدے اور تنظیم کو ایک دوسرے کے ساتھ مربوط کردیا گیا ہے۔ توپ اور تھرمو بیرک اور کلسٹر بموں کی مدد سے بش کی مقدس جنگ نے امریکی نظام کے مخالفوں کو عالمی سطح پر تاریخی مجاہدین میں تبدیل کرکے رکھ دیا ہے۔ امریکی نظام کے مخالف بھی شائد ایسی ہی خواہش رکھتے تھے۔ عراق ہو یا افغانستان، فلسطین ہو یا سوڈان، صومالیہ ہو یا ایران ہر جگہ امریکہ دشمنوں کے نام بدل جاتے ہیں، افغانستان میں اسامہ اور ملا عمر، عراق میں صدام اور پھر ابو مصعب زرقاوی، ایران میں خمینی اور خامنائی اور شمالی کوریا میں کوئی اور.........

سائنس اور ٹیکنالوجی میں ہونے والی نت نئی ایجادات نے باغیوں کے چھوٹے چھوٹے گروہوں کو یہاں تک کہ ایک انفرادی شخص کو عالمی سطح پر

اتنی بڑی تباہی برپا کرسکتا ہے، جس کا تصور بھی محال ہے۔ 11 ستمبر کے حملوں کے فوراً بعد انتھراکس سے آلودہ خط جو مختلف امریکی اہلکاروں اور صحافیوں کو ارسال کیے گئے۔ کیمسٹری اور حیاتیات کے مضامین میں ہونے والی تحقیق تک عام شخص کی رسائی کی زندہ مثال ہیں، جینیاتی انجینئرنگ میں ہونے والی ترقی نے تباہی کو چند ہاتھوں تک محدود کردیا ہے، جسے ماضی میں انجام دینے کے لئے ایک بڑی فوج کی ضرورت تھی۔ کیا بش کی صلیبی جنگ ماضی کی صلیبی جنگ کی ترتیب اختیار کرلے گی اور دہشت گردی کے خلاف امریکی جنگ ایک مذہبی جنگ میں بدل جائے گی۔ جس کے نتیجے میں دنیا ایک المناک تباہی سے دوچار ہو جائے گی۔ اس کا فیصلہ آنے والے دنوں پر چھوڑتے ہیں۔



صدام حسین!

غربت سے آمریت تک اور محرومیٔ اقتدار سے پھانسی تک سات عشروں پر پھیلی ہوئی ہوشربا کہانی

(تنویر قیصر شاہد)

گزشتہ روز جب عالم عرب میں عیدالاضحیٰ منائی جارہی تھی اور حج کے ایام اپنے اختتام کو پہنچ گئے تھے، عراق کے سابق صدر صدام حسین کو پھانسی کے تختے پر لٹکا دیا گیا۔ صدام حسین کو موت کی سزا پر عمل درآمد 2006ء کی سب سے بڑی اور اہم ترین خبر قرار دیا جاسکتا ہے۔ عراقی حکام کی طرف سے کہا گیا ہے کہ صدام حسین کے پانچ ساتھیوں کو آئندہ چند دنوں میں سزائے موت دے دی جائے گی۔ ان افراد میں صدام حسین کے دو سوتیلے بھائی بھی شامل ہیں جو صدامی اقتدار کے دنوں میں عراقی فوج اور پارلیمنٹ میں اعلیٰ عہدوں پر فائز تھے۔

صدام حسین کو سزائے موت دینا دراصل امریکی صدر جارج ڈبلیو بش کی فتح ہے۔ عراق پر قبضہ کرنے بعد امریکی فوج اور امریکی صدر کو مسلسل جس ناکامی، ہزیمت اور شرمندگی کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا، اس پس منظر میں صدام کو سزائے موت دینا صدر بش کی اکلوتی فتح ہی قرار دی جاسکتی ہے۔

صدام حسین اس دنیائے رنگ و بو میں تقریباً 70 سال جیئے اور اب جبکہ وہ پھانسی کے پھندے پر جھول کر اپنے خالق کے حضور پہنچ چکے ہیں جہاں انہیں اپنے اعمال کا حساب دینا ہے، ضرورت اس امر کی ہے کہ ان وجوہات اور اسباب وعوامل کا جائزہ لیا جائے جن کی بنیاد پر عراق کے اس سابق ''مرد آہن'' اور سابق صدر صدام حسین کو یہ روز بد دیکھنا پڑا۔ تقریباً تین برس قبل 13 دسمبر کی ایک یخ بستہ شام جب صدام حسین کو ان کے آبائی قصبے تکریت کے مضافات میں واقع ایک زمین دوز غار سے گرفتار کیا گیا، وہ ایسے لمحات تھے جنہوں نے عالم اسلام پر مجموعی طور پر اور عالم عرب پر خصوصی طور پر نہایت منفی اثرات مرتب کئے۔ صدام حسین کو جس رسوا کن انداز میں گرفتار کیا گیا، یہ منظر ناقابل فراموش تھا۔ گرفتاری کے وقت ان کے پاس 9 بندوقیں، 400 گولیاں اور 97 ہینڈ گرینڈ تھے لیکن عراق کے اقتدار پر فوجی وردی میں ملبوس 33 برس گزارنے والے صدام حسین سے ایک گولی بھی نہ چلائی جاسکی۔ تنقید نگاروں نے کہا کہ اگر وہ ذرا سی غیرت اور حمیت کا ثبوت فراہم کرتے تو ان ہتھیاروں سے کم از کم خودکشی تو کر سکتے تھے۔ وہ

ہٹلر کی ''سنت'' پر عمل کرتے ہوئے زندہ اپنے دشمنوں کے ہاتھ تو نہ لگتے۔ لیکن وہ نہ خودکشی کرسکے اور نہ گرفتار ہونے سے قبل بندوقوں اور گرنیڈوں سے اپنے دشمن پر حملہ کرسکے۔ چھاتی تک پھیلی داڑھی کے ساتھ جب وہ غار سے گرفتار کئے گئے تو 14 دسمبر 2003ء کو ''نیویارک ٹائمز'' نے اپنے صفحۂ اول پر یہ اہم خبر شائع کرتے ہوئے لکھا تھا: ''عراق کے سابق ڈکٹیٹر کو تکریت کے ایک غار سے ایسے نکالا گیا جیسے چوہے کو دم سے پکڑ کر باہر نکالا جاتا ہے'' فاعتبرو یا اولی الابصار۔

صدام حسین کہنے کو تو سنی العقیدہ مسلمان تھے لیکن انہوں نے اقتدار کا سارا عرصہ ایک سیکولر انسان کی حیثیت سے گزارا، ایک ایسے انسان کی طرح جس کی زندگی میں مذہب کا نام ونشان دور دور تک ہمیں نظر نہیں آتا۔ انہوں نے ایک نہایت غریب خاندان میں آنکھ کھولی تھی لیکن اقتدار کے ایوانوں میں داخل ہو کر انہوں نے دولت وثروت اور حکومت سے اپنے سارے دلدّر دور کئے۔ تعلیم سے فراغت کے بعد انہوں نے سیاسی زندگی کا آغاز کیا تو اپنے لئے ''بعث'' پارٹی کا انتخاب کیا۔ اور ''بعث'' پارٹی ایک مذہب بیزار بلکہ مذہب دشمن سیاسی جماعت تھی۔ اس پارٹی کے خالق مائیکل افلق تھے جو ایک عیسائی عرب تھا لیکن نظریات اور افکار کے حوالے سے کمیونسٹ اور ملحد گردانا جاتا تھا۔ ''بعث'' پارٹی کا منشور خدا کے وجود سے انکار کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ 70ء کے عشرے میں عراق کے دارالحکومت بغداد میں مائیکل افلق کی قیادت میں جن لوگوں نے خدا کا جنازہ (نعوذ باللہ من ذالک) نکالا، ان میں ایک صدام حسین بھی تھے۔ 1980ء میں جب ایک برطانوی صحافی جان سی کولی اپنی کتاب کے سلسلے میں صدام حسین سے ملا اور اس نے عراق کے ''مرد آہن'' صدام سے جب یہ پوچھا کہ آپ نے اپنی سیاسی زندگی کے ابتدائی دنوں میں بغداد میں خدا کا جنازہ (نعوذ باللہ) کیوں نکالا تھا تو صدام حسین نے کہا تھا ''میرا خیال ہے کہ مذہب ہماری زندگی میں انتشار اور لامرکزیت پیدا کرتا ہے اور انسانوں کو تقسیم کرنے کا باعث بھی بنتا ہے، اس لئے اپنے مرشد (مائیکل افلق) کے کہنے پر ہم نے بغداد میں یہ جلوس نکالا تھا۔ مجھے آج بھی اس پر کوئی شرمندگی نہیں ہے۔

مذہب سے بے زاری کا یہی جذبہ اور نظریہ صدام حسین کو روس (سابق سوویت یونین) اور بھارت کے قریب لے گیا تھا۔ انہوں اپنے دور اقتدار میں کبھی اور کسی بھی موقف کی حمایت نہ کی۔ اس پس منظر میں گزشتہ روز اردن میں پاکستان کے سابق سفیر نے بجا کہا: ''صدام حسین کا تین عشروں پر پھیلا اقتدار کبھی پاکستان کے لئے فائدہ مند ثابت نہ سکا''۔

یہ واقعہ ہے کہ صدام حسین نے اقتدار کے ایوانوں میں پہنچنے اور عنان حکومت سنبھالنے کے لئے ہر جائز وناجائز طریقہ اور ہتھکنڈہ استعمال کیا۔ وہ عراق کی مرکز گریز قوتوں کے ساتھی اور دوست رہے تاکہ ان کے تعاون سے اقتدار کی لگام اپنے ہاتھ میں لی جاسکے۔ اس جدوجہد میں صدام حسین نے عراق کے صدر عبدالکریم قاسم کو بھی قتل کر ڈالا اور جب قانون نے ان کا تعاقب کیا تو وہ عراق سے فرار ہو کر شام بھاگ گئے تھے جہاں ان کے گرو مائیکل افلق کے کئی پیروکار اور ساتھی انہیں پناہ دیتے رہے۔ حیرت انگیز بات ہے کہ شام کے (سابق) صدر حافظ الاسد بھی مائیکل افلق کے مرید اور بعث پارٹی کے رکن رہے ہیں۔ اس ناتے سے حافظ الاسد اور صدام حسین کی کئی برسوں تک گاڑی چھنتی رہی ہے۔ لیکن صدام حسین کے جارحانہ عزائم اور متکبرانہ مزاج نے شامی صدر کو بھی خود سے دور کر دیا۔ واضح رہنا چاہئے کہ بعث پارٹی شام اور عراق میں سیکولر نظریات کے فروغ،

چین عرب ازم اور سوشلزم کی پرچارک اور مبلغ رہی ہے۔ یہ انہی نظریات و افکار کا نتیجہ ہے کہ صدام حسین نے 90ء سے قبل (جب تک کویت پر حملہ نہ کیا گیا) تک عراقی پرچم پر کلمہ شریف نہ لکھنے دیا تھا اور نہ ہی عراقی آئین میں عراق کو "اسلامی جمہوریہ عراق" لکھنے کی اجازت دی گئی۔ یہ اقدامات انہیں ملحد سوویت یونین کی چھتری رہنے پر مجبور کرتے رہے۔

بعث پارٹی کی اعلیٰ قیادت نے عراق میں اقتدار پر قبضہ کرنے کے لئے 1963ء مین بھی بغداد کے حکمرانوں کے خلاف بغاوت کی تھی جس میں صدر عبدالکریم قاسم مارے گئے تھے لیکن بعث پارٹی اقتدار حاصل کرنے میں کامیاب نہ ہو سکی تھی۔ اس ناکام بغاوت نے بھی بعث پارٹی کے بعض لوگوں نے بھیس بدل کر اقتدار میں داخل ہونے کی راہیں ہموار کرلی تھی۔ یوں کہا جاسکتا ہے کہ صدام حسین پس پردہ 60ء کے عشرے سے اقتدار میں داخل ہو چکے تھے۔ بعدازاں عراق اقتدار پر اگر چہ جنرل عبدالسلام عرف اور جنرل احمد حسن البکر اقتدار میں رہے لیکن بالواسطہ اس اقتدار سے صدام حسین ہی لطف اندوز ہو رہے تھے اور مرکزی اور اہم فیصلے صدام حسین کی مرضی اور ایما پر کئے جا رہے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ پس پردہ رہ کر یہ کھیل نہیں کھیلا جاسکتا: چنانچہ 16 جولائی 1979ء کو صدام حسین نے باقاعدہ عراقی اقتدار پر قبضہ کرلیا۔ انہوں نے صدر حسن البکر کا تختہ الٹ کر حکومت حاصل کی تھی۔ گویہ بات صاف طور پر کہی جاسکتی ہے کہ صدام حسین کے اصل اقتدار کا دور 24 برسوں کو محیط ہے۔

صدام حسین نے اپنے دورِ اقتدار میں کوشش کی کہ ملک کو فوجی اعتبار سے طاقتور بنایا جائے؛ چنانچہ انہوں نے اپنے ہاں اسلحے کے انبار لگا دیئے جو زیادہ تر جرمنی اور سوویت یونین سے حاصل کیا گیا تھا۔ ان کی فوج عالمِ عرب کے تمام ممالک کی سب سے بڑی (عددی اعتبار سے) فوج بن گئی تھی۔ روس کے فراہم کردہ سکڈ میزائلوں کے بل پر صدام حسین عرب ممالک کو وقتاً فوقتاً دھمکایا بھی کرتے تھے لیکن اس کے ساتھ ساتھ عرب ممالک کے عرب عوام کی محبتیں اور ہمدردیاں حاصل کرنے کے لئے اسرائیل کو بھی صفحۂ ہستی سے مٹانے کے اعلانات کیا کرتے تھے (لیکن 1990ء میں انہوں نے اسرائیل پر جو دو سکڈ میزائل پھینکے، وہ ردی ثابت ہوئے) اسرائیل کے خلاف ان کے اعلانات نے اسرائیل فوج کو چوکنا کئے رکھا۔ صدام حسین نے ایران کی طرح ایٹمی طاقت بننے کی بھی کوشش کی اس مقصد کے لئے انہوں نے 5 ارب ڈالر کے اخراجات سے بغداد کے مضافات میں ایٹمی ری ایکٹر بھی نصب کردیئے تھے، جن کے بارے میں عالمی میڈیا نے پروپیگنڈا کی تھا کہ وہاں ایٹم بم بنائے جارہے ہیں؟ چنانچہ امریکہ کی اشیرواد سے اسرائیل نے یہ ایٹمی مراکز تباہ کردیئے اور صدام حسین و عالمِ عرب کے سارے حکمران منہ دیکھتے رہ گئے۔ صدام حسین نے عراقی تیل سے حاصل ہونے والی دولت سے ملک کو فوجی طاقت بنانے ہی پر خرچ نہ کیا، بلکہ یہ بھی کوشش کی کہ عراقی عوام کی فلاح و بہبود پر بھی سرمایہ خرچ کیا جائے۔ انہوں نے ملک بھر میں 22 شاندار یونیورسٹیاں بنائیں۔ ان کی کوششوں سے عراقی عوام میں شرح خواندگی 63 فیصد تک پہنچ گئی تھی۔ پورے ملک میں موٹروے کا جال بچھایا گیا اور یہ بھی کوشش کی گئی کہ عراق کو ایک خصوصی مملکت بنایا جائے، جس میں انہیں قدرے کامیابیاں بھی ملیں۔

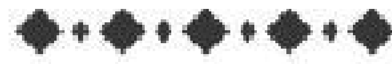
یہ سارے اقدامات مستحسن ہونے کے باوجود صدام حسین اپنے عوام اور عالمِ عرب میں مقبولیت حاصل نہ کرسکے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کا مزاج آمرانہ سے بڑھ کر ظالمانہ شکل اختیار کر گیا تھا۔ عراق کے اندر اٹھنے والی ہر جمہوری آواز کو انہوں نے دبا دیا اور ہر اس شخص اور ادارے کو کچل دیا

جوان پر تنقید کرنے کی جراءت وجسارت کرتی۔ انہوں نے اپنے ہر سیاسی واقتداری دشمن کا صفحۂ ہستی سے مٹا ڈالا۔ ہر وہ شخص جس کے بارے میں انہیں ذرا سا شک بھی ہوا کہ یہ ان کے اقتدار کے لئے خطرہ ہے یا خطرہ ہوسکتا ہے اور انہیں چیلنج کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے، صدام حسین نے اسے زندہ نہ رہنے دیا۔ اس سلسلے میں انہوں اپنے دامادوں کو بھی نہ بخشا اور اپنی دونوں بیٹیوں کے شوہروں کو شام سے بلا کر خود گولی مار کر ہلاک کیا۔ ان کا یہ کردار اور سوچ ان کے دونوں بیٹوں میں میں بھی منتقل ہوگئی تھی۔ وہ بھی اپنی مرضی کی راہ میں مزاحم ہونے والی ہر شئے کو مٹا ڈالا کرتے تھے۔ خصوصاً بڑے بیٹے قوصائے حسین نے تو عراق بھر میں ظلم وستم کا بازار گرم کر رکھا تھا۔ ظلم واستحصال کی یہ خبریں عراق سے باہر نکلیں تو عراق دشمن مغربی اور امریکی میڈیا نے ان میں نمک مرچ مصالحہ لگا کر اسے بانس پر چڑھایا اور صدام حسین کو مزید بدنام کیا گیا۔ مزے کی بات یہ ہے کہ صدام حسین نے ان کی تردید کرنے کی بھی کوئی کوشش نہ کی۔ صدام حسین نے دو شادیاں کیں، لیکن اولاد پہلی بیوی (ساجدہ) ہی سے ہوئی۔ صدام حسین نے جب دوسری شادی رچائی تو بڑے بیٹے نے اپنے سوتیلے ماموں کو ہلاک کرڈالا۔ صدام حسین نے کوشش کی تھی کہ ان کے بعد عراق کا اقتدار قوصائے حسین کو سونپا جائے (جیسے حسنی مبارک اپنے بیٹے ناصر اور کرنل قذافی اپنے بیٹے سیف الاسلام کو بالترتیب مصر اور لیبیا کا اقتدار سونپ دینا چاہتے ہیں) لیکن صدام حسین کے دونوں بیٹوں کو امریکی فوجوں نے ہلاک کرڈالا۔ گویا صدام حسین کے کردہ اور ناکردہ گناہوں کی سزا انہیں تو ملی ہی ہے، ان کی اولاد بھی اس سزا سے نہیں بچ سکی۔ اس کی بیوی ساجدہ اور بڑی بیٹی رغدہ آج کل شام میں پناہ گزین ہیں اور دوسری بیوی اردن میں قیام پزیر ہے (دوسری بیوی کا نام حبیبہ ہے)۔

1979ء میں ایران میں انقلاب آیا اور ایران میں امریکی اثر ورسوخ کا خاتمہ ہوا تو صدام حسین سے امریکہ محبت کی پینگیں بڑھانے لگا، جن کا اثر یہ نکلا کہ صدام حسین نے 20 ستمبر 1980ء کو ایران کے مغربی حصے پر حملہ کردیا۔ بہانہ یہ بنایا کہ ایران نے شط العرب پر قبضہ کر رکھا ہے جو عراق کا حصہ ہے۔ یہ عراق ایران جنگ آٹھ سال جاری رہی، جس میں پندرہ لاکھ افراد ہلاک ہوگئے۔ اور یہ بات بجا طور پر کہی جاتی ہے کہ ڈیڑھ ملین مرنے والے ان انسانوں کا خون صدام حسین کے کندھوں پر ہے، کیونکہ انہوں نے ہی اس جنگ کا آغاز کیا تھا۔ اس جنگ نے عراق اور ایران کو فوجی اعتبار سے تباہ کرڈالا اور ان کی معیشتوں پر نہایت منفی اثرات مرتب کیئے اور فتح کسی کی بھی نہ ہوئی۔ ہاں امریکہ اس ضمن میں ضرور کامیاب رہا، جس نے نہایت چالاکی سے دو طاقتور مسلمان ممالک کو تباہ کرڈالا۔ 1988ء میں اقوام متحدہ نے یہ جنگ بند کروائی۔ ابھی اس جنگ کو بند ہوئے دو سال کا بھی عرصہ نہیں ہوا تھا کہ 2 اگست 1990ء کو صدام حسین نے کویت پر حملہ کردیا۔ عرب ممالک سمیت تمام اسلامی ممالک نے صدام حسین کو کویت سے فوجیں نکالنے کے لئے پورے زور لگادیا، لیکن اس ضدی اور آمر حکمران نے کسی کی نہ مانی، چنانچہ امریکہ کو درمیان میں کودنا پڑا جس نے 18 جنوری 1991ء کو عراق پر حملہ کردیا اور اس کی اینٹ سے اینٹ بجادی۔ کہا جاتا ہے کہ صدام حسین نے کویت پر بھی چڑھائی امریکہ کے کہنے پر کی تھی اور اس سلسلے میں عراق میں امریکہ کی سفیر مس گلاسپی کا بیان بطور ثبوت فراہم کیا جاتا ہے۔ امریکی جرنیل جنرل فارمن شوارزکوف کی قیادت میں امریکہ نے عراق کی سخت پٹائی کی اور کویت سے عراقی فوجوں کو نکال باہر کیا اور صدام حسین کا ''ام المحارب' کا نعرہ کھوکھلا اور دھوکے کی ٹٹی ثابت ہوئی۔

امریکی صدر جارج ڈبلیو بش کھلے الفاظ میں صدام حسین کو دشمن قرار دیتے تھے۔ان کا خیال تھا (اور ہے) کہ صدام حسین عالم عرب کے استحکام کے لئے خطرہ ہے (جہاں کا تیل امریکی زندگی اور ترقی کا ضامن ہے) اور یہ آواز اسرائیل کی بھی تھی، جسے مٹانے کی باتیں بار بار صدام حسین کیا کرتے تھے، چنانچہ افغانستان' میں جنوری 2002ء میں طالبان حکومت کے خاتمے کے بعد امریکی صدر نے صدام حسین اور عراق کا رخ کیا۔ الزامات لائے گئے کہ صدام حسین مہلک ترین تباہی کے ہتھیار (WMD) بنا رہا ہے۔ (یہ الزامات بعدازاں بے بنیاد ثابت ہوئے) اسی بنیاد پر 20 مارچ 2003ء کو امریکہ نے یو این او کے فیصلوں اور مرضی کے برعکس عراق پر حملہ کر دیا۔ صدام حسین نے مقابلہ کرنے کے بڑے بڑے اعلانات تو کئے لیکن حیرانی کی بات ہے کہ اس کی 8 لاکھ فوج، 400 جنگی طیارے، 730 سکڈ میزائل امریکی حملے کے وقت نہ جانے کہاں غائب ہو گئے۔ امریکی حملہ آوروں کے خلاف صدام کا نہ تو کوئی جنگی جہاز اڑا اور نہ کوئی میزائل حرکت میں آسکا۔ ساری دنیا آج تک حیران ہے کہ ایسا کیوں نہ ہو سکا۔ عراق پر قبضہ کرنے اور صدامی فوجوں کو شکست دینے کے آٹھ ماہ بعد صدام حسین کو ایک غار سے گرفتار کر لیا گیا۔ بغداد میں واقع گرین زون کی اسی جگہ پر صدام حسین نے اپنا عظیم الشان محل تعمیر کروایا تھا، لیکن وہی محل اب ان کی قبر ثابت ہو رہا تھا۔ صدام حسین پر عراقی شیعوں اور کرڈوں کو ناجائز قتل کرنے کا مقدمہ چلایا گیا اور انہیں موت کی سزا سنا دی گئی، جس چیف جج نے انہیں سزائے موت کا فیصلہ سنایا وہ نسلی اعتبار سے کرد ہے۔

صدام حسین کو سنائی جانے والی سزا پر گزشتہ روز 30 دسمبر کو عملدرآمد کر دیا گیا اور وہ شخص پھانسی کے پھندے پر جھول گیا جو خود کو "عراق کا مقدر" قرار دیا کرتا تھا۔ صدام حسین کی موت کا پیغام کیا ہے؟ یہ سوال آج عالمِ اسلام کے ہر فرد کے ہونٹوں پر ہے۔ ہمارے خیال میں اس موت کا پیغام یہ ہے کہ جو حکمران بھی اپنے عوام کی خواہشوں کے برعکس اقتدار کے مزے اڑائے گا، اس کا یہی حشر ہو گا اور جو حکمران بھی اپنے عوام کی مرضی کے برعکس امریکہ کی مرضی کے تابع آگے بڑھنے کو اپنی کامیابیاں اور کامرانیاں قرار دیتا رہے گا، اس کا حشر وہی ہو گا جو آج ہمارے صدام حسین کا ہوا ہے...... لیکن بدقسمتی یہ ہے کہ کوئی بھی حکمران تاریخ سے سبق نہیں سیکھتا حتیٰ کہ وہ خود تاریخ کے صفحات میں گم ہو جاتا ہے۔



صدام کی پھانسی

جس دھج سے کوئی مقتل میں گیا......

سابق عراقی صدر صدام حسین کو پھانسی کی سزا دے دی گئی۔ اپیل کورٹ کے جج منیر حداد نے آج پھانسی دیئے جانے کی تصدیق کر دی ہے۔ عراقی وزیراعظم نوری المالکی نے سزائے موت کے احکامات پر دستخط کر دیئے۔ وکیل صفائی نے بتایا ہے کہ صدام حسین نے بغداد ایئرپورٹ کے قریب امریکی حراستی مرکز میں اپنے سوتیلے بھائیوں سے ملاقات میں اپنی وصیت اور ذاتی اشیاء بھی ان کے حوالے کر دیں۔ صدام حسین نے اپنے آخری بیان میں اپنی موت کو شہادت کا رتبہ قرار دیا۔

صدام حسین نے اپنے خلاف چلنے والے مقدمہ میں آخری وقت تک جس بہادری اور بے خوفی کا مظاہرہ کیا اور اسکے بعد سزائے موت پر عمل درآمد کے دوران جس استقامت سے تختہ دار پر گئے' وہ ان کی ذاتی بہادری اور نے خوفی کا مظہر ہے۔ نہ تو انہوں نے نقاب پہنا اور نہ پھانسی کا پھندا گردن میں ڈالتے وقت کسی قسم کی مزاحمت کی بلکہ انہوں نے اللہ اکبر کا نعرہ لگا کر موت کو گلے لگا لیا۔

عراقی صدر صدام حسین کو طویل اقتدار کے دوران امریکی پشت پناہی حاصل تھی۔ انہوں نے امریکی اشارہ پر ہی ایران کے خلاف طویل جنگ کی اور کویت پر قبضہ بھی کیا۔ انہیں جن جرائم کی سزا دی گئی ہے' وہ امریکی سرپرستی کے دوران ہی وقوع پزیر ہوئے۔ کردوں اور ایرانی فوج کے خلاف جو کیمیکل اور وسیع عوامی تباہی پھیلانے کے ہتھیار استعمال کرنے کا ان پر الزام عائد کیا گیا ہے' یہ ہتھیار بھی امریکہ نے ہی فراہم کئے تھے۔

موجودہ امریکی صدر جارج ڈبلیو بش کے والد سینئر بش کے عہد میں 1991ء میں عراق کے خلاف ایک خونریز کارروائی کا آغاز کیا گیا، جس میں امریکی اور اتحادی افواج نے عراق کے زیادہ تر حصوں پر کارپٹ بمباری کی اور عراق کو بہت شدید نوعیت کی پابندیوں میں جکڑ دیا گیا۔ بیرونی دنیا سے تمام روابط منقطع ہونے سے لاکھوں عراقی بیماروں کو ادویات میسر نہ آئیں اور لاکھوں بچوں اور بزرگوں کو خوراک کی کمی کی وجہ سے موت کا

منہ دیکھنا پڑا۔ اسی طرح صدر کلنٹن کے آٹھ سالہ دور میں بھی عرق پر اگر چہ پابندیاں کچھ نرم کی گئیں مگر عراق کے دو کروڑ کے قریب عوام کو انتہائی سخت پابندیوں میں ہی رکھا گیا۔ صدر جارج ڈبلیو بش کے اقتدار میں آتے ہی عراق پر سختیوں اور پابندیوں کو شدید تر کر دیا گیا۔ 11/9 کے واقعہ کے بعد امریکی صدر نے عرق اور افغانستان پر اپنے سفاکانہ اور انتہائی انسانیت سوز حملوں کا آغاز کر کے دونوں ممالک میں لاکھوں بے گناہ نہتے مسلمانوں کو شہید کر دیا اور اپنی اس شرمناک کرروائی کو کروسیڈ (صلیبی جنگوں) کا نام دیا اور مسلمانوں کے لئے اسلامی فاشسٹوں کی اصطلاح استعمال کرنا شروع کر دی۔ بدقسمتی سے انہیں اپنے ان مزموم کروسیڈی عزائم میں بعض مسلمان ممالک کے غیر جمہوری سربراہوں، اسرائیل، بھارت اور دیگر اسلام دشمن قوتوں کی مکمل حمایت حاصل رہی۔

عراقی صدر صدام حسین کو ٹھیک اس روز پھانسی کی سزا دی گئی ہے۔ جس روز عالم اسلام کے بیشتر مسلمان (بالخصوص عرب ممالک) سنت ابراہیمیؑ پر عمل پیرا ہوتے ہوئے فریضہ حج کے بعد عید قربان میں مصروف ہیں۔ عراقی صدر عالم اسلام کے وہ پہلے سربراہ مملکت ہیں، جنہیں امریکی اور اتحادی افواج نے ان کے ملک پر قبضہ کرنے کے بعد کٹھ پتلی حکومت بن کر پھانسی کا فیصلہ حاصل کر کے اس پر عمل درآمد کیا۔ یہ ایک ترقی یافتہ عرب مسلمان ملک کے سربراہ کی پھانسی ہے جسے امریکی صدر کے اشارے پر امریکی حکام اور عراق کی کٹھ پتلی حکومت نے سزا پر عمل درآمد کے لئے مجبور کیا ہے۔ عراق کے لوگوں کا بجا طور پر خیال ہے کہ صدام حسین کو پھانسی دینے سے عراق میں فرقہ وارانہ تشدد ختم نہیں ہوگا بلکہ بڑھ جائے گا۔

امریکہ کے دو بڑے روزناموں "نیویارک ٹائمز اور واشنگٹن پوسٹ" کا کہنا ہے کہ صدام حسین کے خلاف مقدمہ کی کاروائی کے قانونی پہلوؤں پر انسانی حقوق کے اداروں اور عام لوگوں کو اعتراضات ہیں۔ صدام حسین کے کئی وکلاء کو قتل کر دیا گیا، کئی جج بدلے گئے اور اس مقدمہ میں سیاسی مداخلت نظر آ رہی تھی۔ سزائے موت کا فیصلہ اور مقدمہ کی کاروائی شفاف اور غیر جانبدارانہ نہیں تھی۔

سابق عراقی صدر صدام حسین کو ایک کٹھ پتلی عدالت کی دی گئی انتہائی سزا پر فوری طور پر عمل درآمد ایک انتہائی ناپسندیدہ اور سفاکانہ فیصلہ ہے۔ یہ بات صاف نظر آ رہی ہے کہ امریکہ میں درمیانی مدت کے انتخابات میں امریکی صدر ڈیموکریٹس کے ہاتھوں شکست کھانے کے بعد شدید جزباتی ردعمل کا شکار ہو گئے ہیں اور انہوں نے سلطان صلاح الدین ایوبی کے شہر تکریت کے رہنے والے عراق کے سابق صدر صدام حسین کو اس رد عمل کا پہلا شکار بنایا ہے جس سے ان کے کروسیڈی جزبات کو یقیناً تسکین حاصل ہوئی ہوگی۔ امریکہ کا یہ ردعمل ایک طرف عالم اسلام کے ہر فرد کیلئے اور دوسری طرف امریکی اشاروں پر ناچنے والے مسلمان حکمرانوں کے لئے سبق آموز ہے۔ صدام نے اپنے ملک میں جو بھی غلط کام کئے، اس پر سزا دینے کے لئے سب سے بہتر منصف عراقی عوام ہی ہو سکتے تھے۔ امریکہ کا اس سلسلہ میں خود فیصلہ کرنا اور اس پر عمل درآمد، اس بات کا مظہر ہے کہ امریکی پالیسیوں میں دوست اور تابعداری کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ امریکہ ہر حالت میں اپنے مفادات خواہ وہ تیل سمیت معدنی دولت اور تابعدار کی گردن جب چاہے، کاٹ سکتا ہے۔

عراقی صدر صدام حسین نے اپنے عہد اقتدار میں یقیناً بہت سی غلطیاں اور ناپسندیدہ کام کئے ہیں مگر انہوں نے اپنے عہد اقتدار میں بے شمار اچھے اور قابل تحسین کارنامے بھی سرانجام دیئے ہیں۔ مثلاً انہوں نے عرب روایات کے برعکس عراق میں خواتین کی ترقی اور انہیں زیادہ سے زیادہ

آزادی دینے کے لئے بے شمار اقدامات کئے۔ انہوں نے عراق میں تعلیم کو بہت زیادہ اہمیت دی اور بلا مبالغہ یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ تعلیم کے لحاظ سے عراق ایشیا کے ان ممالک میں سرفہرست تھا' جہاں تعلیم کو بہت فروغ حاصل ہوا۔ ریاست کی طرف سے اعلیٰ تعین تعلیم کے لئے مکمل سہولتیں فراہم کی گئیں' شہریوں کا سماجی درجہ دیگر عرب ممالک کی نسبت بہت بہتر تھا۔ عرب ممالک میں عراق شاید دوسرا ملک تھا' جہاں تیل اور دیگر معدنیات کی بے پناہ آمدنی کو قومی فلاح و بہبود پر خرچ کیا جاتا رہا اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ صدام حسین نے تمام اختیارات اور قوت کا مرکز ہونے کے باوجود قومی دولت کو غیر ملکی بنکوں میں جمع نہیں کیا اور نہ ہی اندرون ملک یا غیر ممالک میں اپنی املاک بنائیں۔ صدام حسین نے فلسطینی مسلمانوں کی تحریک آزادی کے لئے جو خدمات سرانجام دیں' تاریخ میں انہیں سنہری حروف سے لکھا جاتا ہے۔ پاکستانی کی حیثیت سے ہم یہ اعتراض کر سکتے ہیں کہ صدام حسین نے کشمیری مسلمانوں کی آزادی پر کبھی کوئی توجہ نہیں دی بلکہ وہ کشمیر پر بھارت کے غاصبانہ قبضہ کی حمایت کرتے رہے جو کہ ان کی شخصیت اور سیاست کا ناگوار اور ناپسندیدہ پہلو تھا جس کی وجوہات انہیں اور ہماری وزارت خارجہ کو یقیناً معلوم ہونگی۔

ان تمام خوبیوں اور خامیوں کے باوجود صدام حسین عراق اور عرب ممالک کی تاریخ کا ایک انمٹ کردار ہیں' انکی زندگی سیاست' حکمرانی کے رویوں اور موت میں ہم سب کے لئے بے شمار عبرت آموز سبق موجود ہیں' جن سے صرف نظر بہت بڑی نادانی اور کوتاہ نظری ہوگا۔ وہ جس بہادری سے تختہ دار پر گئے' وہ ان کی شخصیت کا وہ جاندار پہلو ہے' جو ان کی ماضی کی غلطیوں اور خامیوں کا کفارہ بن گیا ہے۔ صدام حسین نے ثابت کیا ہے کہ وہ شخص کمزوریوں کے باوجود ایک دلیر اور جرأت مند آدمی تھا جو موت کا سامنا کرتے ہوئے کسی قسم کی پریشانی اور پشیمانی کا شکار نہ ہو......

جس دھج سے کوئی مقتل میں گیا وہ شان سلامت رہتی ہے یہ جان تو آنی جانی ہے اس جاں کی تو کوئی بات نہیں۔

صدام حسین کو پھانسی

عراق کی المناک تاریخ میں ایک اور سانحے کا اضافہ

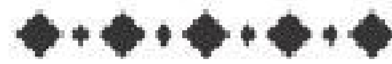
(غلام محی الدین)

عراق کے سابق صدر صدام حسین 30 دسمبر کو علی الصباح مقامی وقت کے مطابق 6:05 پر پھانسی کے پھندے پر جھول کر ابدی نیند سو گئے۔ جب تقریباً پورا عراق عیدالاضحیٰ کی تیاریوں کے سلسلے میں جاگ رہا تھا۔ صدام کو عیدالاضحیٰ کو صبح پھانسی دینے سے ان کے حامیوں اور چاہنے والوں کی خوشیاں ماند پڑ گئیں اور وہ لوگ جو ان کے دور اقتدار میں ان کے ظلم و ستم کا براہ راست نشانہ بنے تھے۔ انہوں نے بغداد اور دوسرے شہروں میں گلیوں میں نکل کر دیوانہ وار رقص کیا۔ صدام حسین کے ساتھ ان کے سوتیلے بھائی برزان التکریتی اور سابق چیف جسٹس عواد البندر کو بھی موت کی سزا سنائی گئی ہے۔ اس طرح عراق جس کی تاریخ، بے شمار المناک واقعات سے پُر ہے ایک اور المناک واقعے کا اضافہ ہو گیا۔

صدام حسین کو 148 شیعوں کو زہریلی گیس کے ذریعے ہلاک کرنے کے الزام میں پھانسی دی گئی ہے۔ ابھی ان پر قائم اور بھی دوسرے مقدمات کا فیصلہ ہونا ہے جس میں کردوں کا قتل عام، مخالفین کو زہریلی گیس سے ہلاک کرنے اور کرپشن جیسے الزامات بھی شامل ہیں۔ ان مقدمات میں بھی فیصلہ تقریباً یہی ہونا تھا لیکن ایک ہی مقدمے کے فیصلے پر جس عجلت میں عمل درآمد کیا گیا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ موجودہ عراقی حکومت جسے امریکا کی آشیرباد حاصل ہے بہت جلد مزاحمت کی اس علامت کو ختم کرنا چاہتی تھی۔ صدام کی پھانسی کے لیے عیدالاضحیٰ کا دن مقرر کرنا بھی اپنے پیچھے بعض سوالات کو جنم دیتا ہے۔ لوگ صبح سویرے عید کی نماز پڑھنے کے لیے یا تو گھروں سے نکل رہے تھے یا تیاریاں کر رہے تھے کہ انہیں یہ خبر سنائی گئی۔ حالاں کہ عراق کے آئین میں ایسی کوئی گنجائش موجود نہیں ہے کہ پھانسی جیسی سزاؤں پر مذہبی تہوار کے موقع پر عمل درآمد کیا جائے۔ بعض حلقوں کا یہ خیال ہے کہ ایسا اس لیے کیا گیا کہ اس طرح مسلمانوں کو یہ پیغام بھی دینا تھا کہ ان کے خلاف کبھی بھی، کچھ بھی کیا جا سکتا ہے اور ان کی خوشیاں کسی بھی وقت خاک میں ملائی جا سکتی ہیں، حالاں کہ عراقی ٹی وی نے پھانسی کے بعد سڑکوں پر لوگوں کو خوشیاں مناتے اور دیوانہ وار رقص کرتے ہوئے دکھایا ہے اور یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے کہ عوام اس فیصلے سے خوش ہیں لیکن اس خیال سے اتفاق نہیں کیا جا سکتا۔ یہ ضرور ہے کہ صدام حسین کی حکمرانی کو بدترین آمریت سے تعبیر کیا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ انہوں نے عراقی عوام کے حقوق سلب کر رکھے تھے مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ انہوں نے ملک کو ایک پڑھا لکھا طبقہ دیا تھا، اور اپنی قوم کو قابلِ فخر بنا کر ایک فکر اور ایک سوچ دی تھی۔ لہٰذا اب یہ سوال بھی اٹھتا ہے کہ صدام کی جسمانی موجودگی کے خاتمے کے ساتھ ان کی نظریات، فلسفہ یا ان کی بعث پارٹی کے اثرات بھی ختم ہو سکیں گے۔ فی الحال یہ کہنا بہت مشکل ہے۔ دوران قید صدام حسین بظاہر ایک بے بس، بے ضرر اور مجبور شخص سے زیادہ نظر نہیں آتے تھے لیکن حالات بتاتے ہیں کہ ان کی معزولی اور گرفتاری کے

بعد بھی ان کے حامی عناصر کی کارروائیاں جاری ہیں اور مرحوم صدام حسین مزاحمت کی علامت کے طور پر زندہ رہیں گے۔ تاریخ کے طالب علم اچھی طرح جانتے ہیں کہ کسی بھی لیڈر کا اس طرح مارے جانا کبھی بھی اچھے اثرات مرتب نہیں کرتا اور نہ ہی کسی لیڈر کا کردار سیاسی افق سے مٹایا جاسکتا ہے۔ صدام کو پھانسی دینے سے متعلق عراقی حکومت یہ تاثر دے رہی ہے کہ یہ فیصلہ خالصتاً عراقی حکومت کا ہے اور اس میں انصاف کے تمام تقاضے پورے کیے گئے ہیں، مگر بعض حلقے یہ بات تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ اس معاملے میں امریکا کی اجازت یا اشارہ ضرور شامل ہے، البتہ امریکا یہ ذمے داری کسی طور پر قبول نہیں کرنا چاہتا۔ یہ بھی کہا جارہا ہے کہ صدام حسین کی حیثیت ایک جنگی قیدی کی سی تھی، اگر اسے سزائے موت سنائی گئی ہے تو عراق پر غاصبانہ قبضہ کرنے والے فوجیوں اور ان پر نہتے عراقی عوام کے قتل عام کے الزام پر بھی اسی طرح کی سزا کا اطلاق ہونا چاہیے۔ عراق پر امریکا نے قبضہ کرنے کا جو جواز فراہم کیا تھا۔ اس کے مطابق صدام حسین پر مہلک ہتھیار رکھنے کا الزام ثابت نہیں ہوسکا، لہٰذا اس عمل کی روشنی میں اتحادیوں یا اتحادیوں کی حمایت یافتہ عراقی حکومت کے تمام اقدامات مشکوک ہوجاتا ہے۔ ایک وقت تھا جب صدام حسین امریکا کی آنکھ کا تارا تھا، مگر ان کی اسرائیل دشمنی نے انہیں امریکا کا بھی دشمن بنادیا اور اس دشمنی کا انجام آج ہوگیا۔

آج حالات بتارہے ہیں کہ صدام کو پھانسی دینے میں انصاف سے زیادہ انتقام کا جذبہ شامل تھا۔ بہرحال 24 برس تک عراق پر رعب اور دبدبے کے ساتھ حکمرانی کرنے والے صدام حسین کا خاتمہ ہوچکا ہے۔ اس کی واپسی کے راستے ہمیشہ کے لیے بند کردیے گئے ہیں، مگر کیا اس کی شخصیت کا سحر ختم ہوسکے گا۔ یہ آنے والا وقت ہی بتائے گا۔



دہشت گردی کے خلاف جنگ

بش انتظامیہ شہری آزادیاں سلب کرنے لگی

(ترجمہ: ملک محمد ظفر)

گیارہ ستمبر کے حملوں کے بعد وائٹ ہاؤس میں شب و روز جن امور کو زیر بحث لانے کا سلسلہ شروع کیا گیا، وہ اینٹی سوٹ کیس، جراثیمی جنگ کی ٹیکنالوجی، حکمت عملی اور اچانک حملوں سے متعلق تھے۔ تاہم اس صورت حال میں انتظامی اختیارات یا امریکی شہریوں کی غیر ضروری اور نامناسب تلاشی سے روکنے والے قانون کو الگ الگ کرنے کے لیے سنجیدہ غور و فکر کا سلسلہ شروع نہیں ہوا۔ اس ضمن میں امریکی صدر سے وائٹ ہاؤس کے وکلاء کو جو پیغام جاتا اس میں اس امر کی وضاحت کر دی جاتی تھی کہ کانگریس اور آئین نے جو اختیارات صدر کو تفویض کیے ہیں، وہ ان اختیارات کو مکمل طور پر بروئے کار لانے کے خواہاں ہیں۔ اس کا مقصد قانون کی حدود کا دائرہ وسیع کرنا بھی لیا جا سکتا ہے۔ بش انتظامیہ نے انسانی آزادیوں اور حقوق کے بل کو معرض التوا میں نہیں ڈالا جبکہ فوری اور انتظامی نوعیت کے عملی اقدامات اٹھانے سے گریز نہیں کیا۔ ''نیوز ویک'' نے انتظامیہ کے بعض عہدیداروں کے درمیان الیکٹرونک آلات کے ذریعے جاسوسی کے پروگرام کے بارے میں پائے جانے والے اختلافات کو ایک رپورٹ میں بے نقاب کیا ہے۔ یہ رپورٹ نذر قارئین ہے۔

2004ء کے موسم بہار کے دوران ایک وفد وائٹ ہاؤس کے چیف آف سٹاف اینڈی کارڈ اور اس وقت کے ماہر قانون البرٹو گونزلز اٹارنی جنرل جان اشرافٹ کی عیادت کرنے گیا، جو ان دنوں علیل تھے۔ ان کے اس دورے کا مقصد صرف تیمارداری تک ہی محدود نہ تھا، بلکہ قائم مقام اٹارنی جنرل جیمز کومے کو ان کے عہدے سے الگ کرانا تھا، کیونکہ کومے امریکی شہریوں کی غیر ضروری جاسوسی کروانے میں روڑے اٹکا رہے تھے۔ جیمز کومے کا خیال تھا کہ بحران کے دور میں محتاط رویہ اختیار کرنا چاہیے۔ وہ شہریوں کی نجی زندگی میں مداخلت کے کسی بھی طور پر حامی نہیں ہو سکتے تھے۔ بش انتظامیہ کو قائم مقام اٹارنی جنرل کے طرز عمل پر اعتراض تھا، اس لیے صدر بش نے ایسی حقارت اور تمسخر سے ''کومو'' نام بھی دے رکھا تھا۔

یہ نام انہیں نیویارک کے سابق گورنر ماریہ کومو کی شخصیت کے باعث دیا گیا، کیونکہ امریکی لیڈر کے خیال میں قائم مقام اٹارنی جنرل اور نیویارک کے سابق گورنر کی شخصیت کے خدوخال ملتے جلتے ہیں۔ سابق گورنر متذبذب اور بار بار رائے بدلنے والی شخصیت کے حامل تھے۔ تاہم

وائٹ ہاؤس کے صدر نے ان ریمارکس سے انکار کر دیا اور کومے نے بھی اس پر تبصرہ نہیں کیا۔ کسی مہذب اور جمہوری معاشرے میں شہری آزادیوں اور قومی سلامتی کے درمیان حد فاصل اور توازن قائم کرنے کے لیے انتظامیہ اور حکومت کے مختلف شعبوں کے نمائندوں میں کھلی بحث ہی ایک معقول رویہ سمجھی جاتی ہے۔ لیکن انسانی فطرت اور سیاست صاف ستھرے اور شفاف انداز پر شاذ و نادر ہی عمل پیرا ہوتی ہے۔

بحران کے دور میں امریکی صدور انتظامی اختیارات کو ہمیشہ ملک کے تحفظ و سلامتی کو یقینی بنانے کے لیے بروئے کار لاتے رہے ہیں۔ لیکن جب بحران کے تلاطم خیز سمندر میں خونیں موجیں تھم جاتی ہیں، تو انتظامیہ کے اندازِ فکر پر بحث ہو جاتی ہے اور اس وقت عوام اور ان کے نمائندوں کو یہ سن کر انتہائی دکھ اور حیرت ہوتی ہے کہ ان کے صدر نے ان کے تحفظ و سلامتی کے نام پر کیا کیا۔ گیارہ ستمبر کے واقعہ کے چار سال بعد بھی امریکہ میں تاریخ کے بعض اہم مسائل و معاملات پر بحث جاری ہے کہ کیسے شہری آزادی اور سلامتی کے درمیان توازن قائم کیا جائے اور وائٹ ہاؤس کو کتنے اختیارات تفویض کیے جانے چاہئیں اور کیا ممتاز مؤرخ آرتھر سلیسنجر جونیئر نے ''شہنشاہی صدارت'' کی جو اصطلاح واٹر گیٹ سکینڈل کے ضمن میں متعارف کرائی تھی، کیا درست تھی یا بہتر اصطلاح تھی یا بری یا ان کے درمیان کچھ تھا، یہ کہ دہشت گردی کے خلاف جنگ غیر روایتی اندازِ فکر کو بروئے کار لا کر لڑی جا رہی ہے اور بظاہر یہ ختم ہوتی نظر نہیں آتی، جس سے خطرات و مشکلات بڑھتی جا رہی ہیں۔

گیارہ ستمبر کے واقعہ کے بعد صدر بش اور ان کے اعلیٰ مشیروں نے جس نادیدہ دشمن کے خلاف جنگ کا اعلان کر رکھا ہے، کیا دنیا کی طاقتور ترین مسلح افواج اس نادیدہ دشمن کے خلاف مؤثر ثابت نہیں ہو رہی ہیں اور کیا انسانی جاسوسی کا عمل مددگار نہیں۔ امریکی سی آئی اے نے شاید ہی کبھی کسی دہشت گرد گروپ کے اندر اپنے ایجنٹ شامل کیے ہوں، حالانکہ فلموں اور ناولوں میں ایسا دکھایا جاتا ہے۔ امریکہ کا حقیقی ہتھیار ٹیکنالوجی ہے۔ جاسوس طیارے، نیشنل سیکورٹی ایجنسی کا کمپیوٹر نظام فضا سے بھی دشمنوں اور ان کے ایجنٹوں کے درمیان ہونے والی ٹیلیفون گفتگو یا ای میل تک رسائی حاصل کرنے کی اہلیت رکھتے ہیں۔ این ایس اے امریکہ کے دشمنوں کی گفتگو کی سماعت کے لیے ایک دیوہیکل کان کی حیثیت رکھتا ہے اور یہ عملی طور پر ان کے تمام منصوبوں کو قبل از وقت حاصل کر لیتا ہے۔ جوں جوں ذرائع رسل و رسائل ڈیجیٹل ہوتے جا رہے ہیں، انٹیلی جنس کے ماہرین نے اس نئی صورتحال کے تناظر میں خبردار کیا ہے کہ اب این ایس اے قوت سماعت سے محروم ہو جائے گی۔ اس کے ساتھ ہی این ایس اے کے اعلیٰ عہدیداروں کے بیان بھی اس تشویش کو ظاہر کرتے ہیں۔ نئی صورت حال میں یہ محسوس ہونے لگا ہے کہ این ایس اے حساس ڈیٹا اور کمپیوٹر پروگرام پر خفیہ طور پر کام کر رہی ہے، جس کا مقصد معلومات کے وسیع ذخیرے کی چھان بین کرنا اور ان کے آپس کے تعلقات اور روابط کو ڈھونڈ نکالنا ہے۔

نائن الیون کے بعد امریکی حکومت پر بعض حلقوں کی جانب سے شدومد کے ساتھ یہ نکتہ چینی کی گئی کہ وہ ان خودکش حملہ آوروں، جو امریکہ میں چھپے ہوئے تھے، کی بیرون ملک مقیم دہشت گردی کی منصوبہ سازی کرنے والوں کے ساتھ پیغام رسانی کا سراغ لگانے میں ناکام رہی ہے۔ لیکن اب این ایس اے کے کمپیوٹر نئی صورت حال سے نمٹنے کے لیے مکمل طور پر تیار ہیں۔ اسی لیے بش انتظامیہ کے عہدیدار بار بار اس امید کا اظہار کر چکے ہیں کہ امریکہ میں چھپے ہوئے دیگر دہشت گردوں کے ''خوابیدہ گروپوں'' (سلیپر سیلز) کو ڈھونڈ نکالیں گے اور انہیں امریکہ پر دوبارہ حملہ آور ہونے کا موقع نہیں دیں گے۔ لیکن اس کے باوجود آئینی اور قانونی سطح پر صورت حال میں کوئی پیشرفت دیکھنے میں نہیں آئی۔

1978ء میں کانگریس نے فارن انٹیلی جنس سرویلنس ایکٹ منظور کیا تھا، جس میں واضح طور پر کہا گیا ہے کہ انٹیلی جنس ایجنسیاں امریکی شہریوں سے متعلق ذرائع رسل و رسائل کی جاسوسی اور مخبری کرنے سے قبل وارنٹ حاصل کریں گی۔ سی آئی اے اور ایف بی آئی کی جانب سے امریکہ کے اندر اور باہر شہریوں کی جاسوسی کرنے کے لیے متذکرہ قانون کو بطور وکیل پیش کیا گیا جبکہ عوامی حلقوں کی جانب سے جاسوسی کے اس پروگرام پر سخت ردِعمل کا اظہار کیا گیا۔ لیکن یہ ایکٹ سرد جنگ کے دور میں تشکیل دیا گیا تھا اور اس کا مقصد ٹیلیفون کالز کی جاسوسی کرنا تھا۔ یہ ایکٹ ہزاروں فون کالز یا ای میلز تک رسائی حاصل کرنے سے نہیں روکتا، کیونکہ ان معلومات تک رسائی امریکی ٹیلی کمیونی کیشن کمپنیوں کے طویل نیٹ ورک کے ذریعے ممکن ہوتی ہے۔ 1978ء کے قانون کے تحت ایک خفیہ عدالت بھی قائم کی گئی تھی، جس نے جاسوسی کے مقاصد کے لیے حکومت کی جانب سے پیش کی جانے والی وارنٹ کی کوئی بھی درخواست مسترد نہیں کی۔ لیکن ایسی کسی بھی درخواست کے لیے بیسیوں صفحات پر مشتمل دستاویزات متعدد دستخطوں جس میں اٹارنی جنرل کے دستخط بھی شامل ہوتے ہیں، درکار ہوتے ہیں۔ ایسی درخواست کی 72 گھنٹوں میں منظوری دے دی جاتی ہے۔ جیسا کہ این ایس اے کے کمپیوٹروں نے افغانستان اور پاکستان سے امریکہ میں ممکنہ القاعدہ کے ہمدردوں کی فون کالز کا سراغ لگایا۔ اگر اس کارروائی کو سرخ فیتے کی نذر کر دیا جاتا تو یہ ایک ناقابل معافی جرم تصور کیا جاتا۔

صدر بش، جو دہشت گردی کے خلاف جنگ میں حد درجہ تک پرعزم ہیں اور نائب صدر ڈک چینی انتظامی اختیارات پر پختہ یقین رکھتے ہیں، وہ 1978ء کے ایکٹ کو جل دے کر اپنے مقاصد کے لیے استعمال کرنے سے کسی صورت ہچکچاہٹ محسوس کرتے دکھائی نہیں دیتے، کیونکہ آئین کے آرٹیکل 2 اور نائن الیون کے بعد کانگریس کی قرارداد نے امریکی صدر کو عالمی سطح پر دہشت گردی کا مقابلہ کرنے کے لیے طاقت استعمال کرنے کا اختیار دیا ہے۔ صدر بش بارہا اس بات کی منظوری دے چکے ہیں، جس کے تحت این ایس اے روزانہ پانچ سو امریکیوں کی بغیر وارنٹ کے جاسوسی کر سکتی ہے۔ این ایس اے کے پروگرام کے بارے میں جب ''نیویارک ٹائمز'' نے رپورٹ شائع کی تو اخبارات اور کانگریس میں صدائے احتجاج فوری طور پر بلند ہونے لگی، لیکن ردِعمل کم و بیش جانبدارانہ رہا۔ ری پبلکن پارٹی کے اکثر ارکان اور کنزرویٹوز نے امریکہ کے تحفظ کو یقینی بنانے کے لیے صدر بش کے اقدامات کا دفاع کیا۔ اکثر ڈیموکریٹس اور لبرل حضرات نے جاسوسی کے اس پروگرام کو قابل مذمت قرار دیا اور کہا بش اور ڈک چینی مشتبہ دہشت گردوں کو بغیر کسی قسم کے قانونی جواز کے، تشدد کا نشانہ بنوانے اور قید و بند میں رکھنے کے سکینڈل میں ملوث ہیں اور اب اس اقدام سے شہری آزادیوں کو بری طرح متاثر کیا جا رہا ہے۔

متذکرہ بالا صورت حال کے تناظر میں ردِعمل اور بحث و مباحثہ قدرے محدود اور دلائل سے عاری رہا ہے۔ یہ امر اپنی جگہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ گزشتہ چار برسوں کے دوران امریکہ پر کوئی حملہ نہیں ہوا، اس کی دو وجوہات ہو سکتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ بش انتظامیہ نے دہشت گردی کے خلاف مؤثر جنگ شروع کر رکھی ہے اور دوسری یہ کہ دہشت گردوں کی جانب سے خطرہ اتنا شدید نہیں جتنا کہ حقیقی طور پر سمجھا گیا۔ یہ دونوں وجوہات امریکہ کو محفوظ بنانے کے لیے بنیاد تصور کی جاتی ہیں۔ تاہم یہ امر واضح نہیں کہ جاسوسی اور مخبری کے پروگرام نے دہشت گردوں کے منصوبوں اور سازشوں کو ملیامیٹ کرنے میں کافی کردار ادا کیا ہے یا اس کے برعکس اس پروگرام کے ذریعے امریکیوں کو ان کی نجی اور خفیہ زندگی کی

آزادیوں سے محروم کیا گیا ہے۔ جاسوسی اور مخبری کا زیادہ تر عمل ''کی ورڈز'' کی کمپیوٹر کے ذریعے تلاش ہے نہ کہ نجی گفتگو کوئی شخص سن گن لیتا ہے۔ یہاں یہ امر یقینی ہے کہ قومی سلامتی اور شہری آزادیوں کے بارے میں حالیہ بحث نئی نہیں۔

امریکہ کے سابق صدور کے ادوار میں بھی جنگ کے دوران ایسے ہی جمہوری چلن کا دور دورہ رہا ہے۔ گزشتہ دو صدیوں کے دوران امریکہ کے اندر اور باہر دشمنوں کے سلسلے میں امریکی صدور کے اقدامات سے تنقید کی ایک لہر جنم لیتی رہی ہے۔ لیکن ریاستی امور نے اپنے طریق عمل کو جاری رکھنے کو ہی یقینی بنایا۔ موجودہ بحث کو سمجھنے اور اس کا سنجیدگی سے جائزہ لینے کے لیے کہ بش اور ڈک چینی نے اختیارات کے لیے کس قسم کے اقدامات کیے ہیں۔ ان کا سابقہ ادوار میں بنائے جانے والے قوانین سے موازنہ کرنا مفید ہوگا۔

اگرچہ اختیارات کے حصول کے لیے اظہار کم ہی کیا جاتا ہے۔ امریکی صدور ہمیشہ انفرادی حقوق کی خلاف ورزی کے ارتکاب کی راہ پر گامزن ہوتے ہیں، کیونکہ وہ جنگ ہارنے کو بہتر ترجیح نہیں سمجھتے۔ 1798ء میں جب فرانسیسیوں نے امریکیوں کی خودمختاری کو چیلنج کیا تو اس وقت امریکہ کے صدر جان ایڈمز نے حکومت کی مخالفت کے خلاف تشکیل کردہ قوانین کی پرزور حمایت کی اور آزادی اظہار پر سزا دینے کے مؤقف کی وکالت کی۔ اسی طرح جب 1861ء میں خانہ جنگی شروع ہوئی تو ابراہیم لنکن نے حبس بے جا کے قانون کو معطل کر دیا۔ اس قانون کے تحت امریکی شہریوں کو حق حاصل ہے کہ وہ اپنی شکایات عدالت میں لے جاسکتے ہیں۔

پہلی عالمی جنگ کے دوران وڈرو ولسن نے حکومت کو ہدف تنقید بنانے والوں کے خلاف انتظامیہ کو کارروائی کی کھلی چھٹی دے رکھی تھی۔ دوسری عالمی جنگ کے دوران روزویلٹ نے ایف بی آئی کے ڈائریکٹر جے ایڈگر کو یہ اجازت دی تھی کہ شہریوں کی پیغام رسانی پر کڑی نظر رکھی جائے۔ اس کے علاوہ انہوں نے جاپانی نژاد امریکیوں کو نظربندی کے کیمپوں میں رکھنے کا حکم دیا تھا۔ اسی طرح جوں جوں ویت نام کی جنگ طویل پکڑتی گئی، امریکہ کے اندر صدائے احتجاج بلند ہونے لگی۔ رچرڈ نکسن نے اپنے ڈیموکریٹک پیشرو کا حوالہ دیتے ہوئے اندرون ملک شرپسندوں کی جاسوسی کرنے کا انتظامیہ کو اختیار دے دیا تھا۔ لیکن ان اقدامات سے امریکی قوم زیادہ محفوظ نہیں ہوئی۔ تاہم یہ امر اب تک واضح نہیں کہ نائن الیون کے بعد صدر بش نے قومی سلامتی کے اداروں کو مؤثر کارروائی کرنے کے لیے کہاں تک متحرک اور فعال بنایا ہے۔ لیکن یہ بات کسی سے چھپی نہیں کہ امریکی لیڈر انٹیلی جنس سروسز اور فوج کو مؤثر کارروائی اور حملوں سے پیشگی اقدامات اٹھانے کے لیے متحرک بنانے کے خواہاں ہیں۔

این ایس اے کے خفیہ پروگرام کی تمام جہتیں آہستہ آہستہ بے نقاب ہوئی ہیں۔ قانونی جواز اور کمانڈر انچیف کے آئین کے تحت اعلان جنگ کے اختیار کو ستمبر 2001ء میں حملوں کے تین دن بعد کانگریس کی قرارداد میں سمویا گیا تھا، اسی لیے کانگریس کے اکثر ارکان اس وقت یہ سمجھنے لگے تھے کہ وہ افغانستان میں القاعدہ اور طالبان پر حملے کا اختیار دینے کے لیے ووٹ دے رہے ہیں۔ لیکن وائٹ ہاؤس کے ایک سابق عہدیدار جو قرارداد کا مسودہ تیار کرنے میں شریک رہے ہیں اور جنھوں نے اپنا نام ظاہر کرنا نہیں چاہا، ان کے مطابق امریکی انتظامیہ میں اس نکتے پر ایک رائے پائی جاتی تھی کہ صدر کو کانگریس سے زیادہ سے زیادہ اختیارات حاصل کرنے چاہئیں، جنہیں وہ دہشت گردوں کو قانون کی گرفت میں لانے اور ہلاک کرنے کے لیے استعمال کرسکیں۔ عمومی طور پر قومی بحران کے دور میں کانگریس ہمیشہ حب الوطنی کی رو میں بہہ جاتی ہے۔

کوریا اور ویت نام کی جنگوں کے دوران اس وقت کے صدور نے کانگریس سے باقاعدہ اعلان جنگ کی منظور حاصل کرنے کی بھی زحمت گوارا نہ کی تھی۔ ویت نام اور واٹر گیٹ کے بعد کانگریس نے مختصر عرصے کے لیے اپنے جنگی اختیارات کے قانون کو منوانے کے لیے کچھ سرگرمی بھی دکھائی لیکن کبھی کسی امریکی کانگریس اور نہ ہی صدر نے اس قانون کو آزمائش کے مراحل سے گزارنا چاہا ہے۔ خلیج کی پہلی اور دوسری جنگوں میں بش کے والد اور اب بیٹے نے انتہائی کم سخت قراردادوں پر انحصار کیا۔ وائٹ ہاؤس کے ایک عہدیدار، جو ستمبر 2001ء کی اس قرارداد کی تیاری میں شریک رہے ہیں، جس میں دہشت گردی کے خلاف طاقت استعمال کرنے کا اختیار دیا گیا ہے، ان کا کہنا ہے کہ کانگریس کی جانب سے انتہائی کم نوعیت کی سرگرمی کا مظاہرہ کیا گیا۔ سینٹ کی جوڈیشری کمیٹی کے چیئرمین ایولن سپکٹر اختیارات کے دائرہ کار کو محدود کرنا چاہتے تھے، لیکن انہیں کامیابی سے ایک طرف کر دیا گیا۔

کانگریس کے لچکدار رویے کے تناظر میں مبصرین اور تجزیہ نگاروں نے اس حیرت کا اظہار کیا ہے کہ آخر وائٹ ہاؤس نے کیوں کانگریس کو 1978ء کے ایکٹ میں ترمیم کرنے کے لیے نہیں کہا، کیونکہ اس سے بغیر وارنٹ کے امریکی شہریوں کی نجی زندگی میں مداخلت آسان ہو سکتی تھی۔ وائٹ ہاؤس کے ایک عہدیدار نے بتایا ہے کہ بش انتظامیہ کو یہ خدشہ تھا کہ اگر کانگریس میں بحث ومباحثہ کرایا گیا تو دہشت گردوں کو این ایس اے اور دیگر انٹیلی جنس سروسز کے خفیہ ذرائع اور طریقوں کے بارے میں کافی حد تک معلومات مل جائیں گی۔ اس کے علاوہ ایک عنصر یہ بھی کارفرما رہا ہے کہ امریکی انتظامیہ ہمیشہ کانگریس سے کسی چیز کی اجازت مانگنے میں ہچکچاہٹ کا اظہار کرتی ہے، کیونکہ ایسا کرنے سے کانگریس کے اس اختیار کو تسلیم کرنا پڑے گا کہ اس کے پاس "نہیں" کہنے کا اختیار اور جواز موجود ہے، اسی لیے امریکی صدور نے ہمیشہ اعلان جنگ کے اختیارات کو اپنے عہدے تک محدود کرنے کو ترجیح دی ہے، تاکہ ان کے بارے میں کوئی سوالیہ نشان اٹھایا نہ جاسکے۔ علاوہ ازیں ارکان کانگریس نے اکثر وبیشتر قومی سلامتی کی آڑ میں اٹھائے جانے والے اقدامات کی حقیقت جاننے کی خواہش ظاہر نہیں کی۔ 1950ء کی دہائی میں سی آئی اے کے ڈائریکٹر ایلن ڈولس کے مطابق انہوں نے ہمیشہ سینٹ کی مسلح افواج کی کمیٹی کو حقائق سے آگاہ کیا۔ جب این ایس اے کی جاسوسی کی پلاننگ منظر عام پر آئی تو بش انتظامیہ نے فوری طور پر دعویٰ داغ دیا کہ اس نے کئی مواقع پر کانگریس کے رہنماؤں کو بریف کیا تھا، لیکن یہ بریفنگ بظاہر سرسری تھی۔ سینٹ کے ڈیموکریٹک لیڈر سینیٹر ٹام ڈاشلے کا کہنا ہے کہ انہیں 2002ء اور پھر 2004ء میں بریف کیا گیا۔ انہوں نے "نیوز ویک" کو انٹرویو دیتے ہوئے بعض خفیہ اطلاعات ظاہر کرنے سے گریز کیا۔ لیکن یہ تسلیم کیا کہ جو بریفنگ دی گئی تھی وہ ان تفصیلات سے بالکل مختلف ہے، جو اب اخبارات میں شائع ہو رہی ہیں۔ وائٹ ہاؤس میں بریفنگ کے دوران سینیٹر ڈاشلے کو نوٹس لینے اپنے ساتھ کوئی عملہ لانے یا بریفنگ کی تفصیلات کسی کو بتانے سے روک دیا گیا تھا۔ ڈاشلے کہتے ہیں کہ اس طرح سے آپ کچھ بھی حاصل نہیں کر پاتے۔ جب تک کہ آپ سوالات کے ذریعے کچھ پوچھ نہیں لیتے۔

صدر بش کے دور صدارت میں جو قواعد وضوابط جاسوسی، سراغ رسانی اور تفتیش کیلئے بنائے گئے ہیں، وہ اس اعتبار سے خصوصی نوعیت کے ہیں کہ انہیں وائٹ ہاؤس اور محکمہ انصاف کے وکلاء نے تیار کیا اور ان کے پیش نظر صدر کے اختیارات کو وسعت دینا تھا۔ محکمہ خارجہ کے وکلاء اور باوردی فوجی عہدیداروں کو زیادہ تر اس سے الگ تھلگ رکھا گیا۔ اس سلسلے میں مشتبہ دہشت گردوں کی غیر معینہ عرصے تک کیلئے نظر بندی پر سرکاری وکلاء

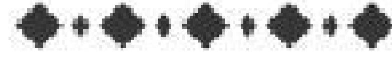
نے اکثر و بیشتر احتجاج ہی کیا۔ ابتداء میں ان شکایات کو نجی طور پر دور کرنے کی کوشش کی گئی۔ اگر چہ بیوروکریٹس پر انگلی اٹھائی جا سکتی ہے، لیکن حکومتی عہدیداروں سے قربت رکھنے والے بیوروکریٹس شائستگی اور منصفانہ پن کے معیار کو پیش نظر رکھتے ہیں، کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ وہ جو معاملہ چھوڑ کر جائیں گے، بعد میں آنے والے عوامی نمائندے ان مشکوک خفیہ کارروائیوں کا جائزہ لے سکتے ہیں۔ محکمہ انصاف میں ایک سابق پراسیکیوٹر جیمز کومے نے وائٹ ہاؤس کو ایک اذیت رسانی کی یادداشت سے دستبردار ہونے پر مجبور کیا، جس میں بظاہر انٹیلی جنس ایجنسیوں کو یہ اختیار دیا جاتا تھا کہ وہ پوچھ گچھ کے لیے ایسا طریقہ اختیار کرنے میں آزاد ہوں گے، جس میں تشدد تو کیا جا سکتا ہے، لیکن یہ تشدد جسم کے اعضاء کو تکلیف پہنچانے کا سبب نہ بنے۔ کومے اس وقت محکمہ انصاف میں دوسرے ایسے عہدیدار تھے، جنہوں نے ٹھوس کوششوں سے اسے ناممکن بنا دیا۔ اگر چہ اس کے متعلق تمام تفصیلات غیر واضح ہیں، لیکن یہ محسوس ہوتا ہے کہ کومے کے اعتراضات کے باعث ہی 2004ء میں جاسوسی اور مخبری کے بغیر وارنٹ پروگرام کو کسی حد تک محدود کرنے میں مدد ملی۔ دیگر متعدد عہدیداروں کے مطابق کومے اور دیگر سرکاری وکلاء نے یہ دلیل دی کہ طاقت کے استعمال کی 2001ء کی قرارداد، جس سے شہریوں کی جاسوسی کا جواز قائم کیا گیا، وہ زائد المیعاد ہو چکی ہے۔ اس لیے اس پروگرام کو آڈٹ کرنے کی ضرورت ہے۔

مارچ 2004ء میں وائٹ ہاؤس کے چیف آف سٹاف کارڈ اور وائٹ ہاؤس کے وکیل گونیلز نے اٹارنی جنرل کی عیادت کی، جو شدید بیمار تھے اور انہیں کومے کے اقدامات کو بلا جواز قرار دینے پر آمادہ کرنے کی کوشش کی، کیونکہ کومے اس وقت قائم مقام اٹارنی جنرل کے فرائض سرانجام دے رہے تھے۔ لیکن شرافٹ نے انکار کر دیا، جس کے بعد محکمہ انصاف اور وائٹ ہاؤس میں بحث چھڑ گئی کہ کیا کرنا چاہیے۔ بالآخر 2004ء کے موسم گرما میں کومے کے ساتھ بعض معاملات پر اتفاق رائے ہو گیا۔ ''نیویارک ٹائمز'' کے مطابق محکمہ انصاف اور این ایس اے نے بعض اصول وضوابط میں ترمیم کی اور ان میں اس شق کو شامل کیا گیا کہ امریکی شہریوں کی گفتگو کی مانیٹرنگ کرنے سے قبل ''ممکنہ وجوہ'' کا تعین کرنا ہوگا۔ بیوروکریٹس جو اپنے سیاسی آقاؤں سے بددل تھے۔ ان کے پاس ایک ہتھیار ہے، جس کے تحت وہ اندرونی معاملات کو بے نقاب کر سکتے ہیں۔ تاہم یہ امر ابھی تک واضح نہیں ہوا کہ این ایس اے کی امریکی شہریوں کی مانیٹرنگ کی پلاننگ کیسے ''نیویارک ٹائمز'' تک پہنچی۔ تاہم گزشتہ ہفتے محکمہ انصاف نے تفتیش شروع کر دی ہے۔

خیال کیا جا رہا ہے کہ اس پروگرام کو بے نقاب کرنے میں وہ عہدیدار ملوث ہیں، جو اس پروگرام کے اخلاقی جواز سے متفق نہیں یا وہ اسے بہتر نہیں سمجھتے۔ تاریخی طور پر جنگ کے دوران شہری آزادیوں کے خلاف اقدامات کے ہمیشہ منفی اثرات ہی ظاہر ہوئے ہیں، جیسے لنکن پر ڈکٹیٹرشپ کا الزام عائد کیا گیا اور ان کی ری پبلکن پارٹی 1862ء اور 1864ء کے انتخابات میں متعدد نشستوں سے محروم ہو گئی۔ ولسن کی جنگ عظیم اوّل کے دوران اور بعد کی کارروائیوں سے شہری آزادی کی جدید تحریک کو پروان چڑھانے میں مدد ملی، جبکہ نکسن کی جانب سے اختیارات کے ناجائز استعمال سے واٹر گیٹ کے لیے متعدد اصلاحات آئیں، جن میں 1978ء کا قانون بھی شامل ہے۔

رواں موسم سرما کے دوران کانگریس شہری آزادیوں کی خلاف ورزی سے متعلق بش انتظامیہ کے اقدامات زیر بحث لائے گی۔ جوں جوں نائن

الیون کا واقعہ عوام کے حافظے سے محو ہوتا جا رہا ہے اور بش رائے عامہ کے جائزوں میں مقبولیت کھوتے جا رہے ہیں۔ عوام کا طرز عمل بھی بدل رہا ہے، لیکن اس کے باوجود بش نے اسے اپنے کسی بھی خفیہ پروگرام سے دستبردار ہونے کا کوئی عندیہ نہیں دیا۔



2006 امریکا کا زوال شروع ہو جائے گا

(میگزین رپورٹ)

علم نجوم قدیم ترین انسانی علوم میں سے ایک ہے۔حساب کتاب کا یہ طریقہ بھی اپنے انداز سے حالات کا تجزیہ پیش کرتا ہے،اس میں انسانی دلچسپی ہمیشہ سے رہی ہے۔ماہرین ہر سال کے حوالے سے علم نجوم کی بنیاد پر پیش گوئیاں کرتے ہیں کہ آنے والے سال میں کیا کچھ ہونے کا امکان ہے۔ملکوں کے اندرونی معاملات کیا رخ اختیار کر سکتے ہیں اور ان کے دیگر ممالک کے ساتھ تعلقات کیسے رہیں گے۔

مغربی ماہرین علم نجوم 2006ء پر اسراریت اور عجیب وغریب غیر متوقع واقعات کا سال قرار دیتے ہیں۔گویا اچانک کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ان کا کہنا ہے کہ یہ خوابوں اور فریب نظر کا سال ہے،کیونکہ اس سال پر سب سے گہرے اثرات نیپچون کے ہیں۔اس سیارے کی خاص بات یہ ہے کہ یہ براہ راست اثر انداز نہیں ہوتا یعنی کھل کر سامنے نہیں آتا۔دیگر سیاروں کے ساتھ اس کا جو تعلق یا رابطہ قائم ہوتا ہے انہی کے پیش نظر یہ اثرات مرتب کرتا ہے۔رابطہ بدلتا رہتا ہے تو اس کے اثرات بھی تبدیل ہوتے رہتے ہیں۔اس سال خاص طور پر زحل (جو سخت قواعد وضوابط،ڈسپلن اور اپنی اصل میں نحس اکبر ہے) اور مشتری (جو سعد اکبر ہے) سے اس کا تعلق رہے گا۔

2006ء میں سب کچھ ایسا نہیں ہوگا جیسا بظاہر نظر آئے گا۔کوئی ظاہری بدنصیبی،خوش نصیبی بن جائے گی جبکہ کوئی خوش نصیبی آخری نتائج میں بدقسمتی ثابت ہوگی۔اس سال عالمی رہنماؤں کو خصوصیت سے چوکس،تخلیقی اور اختراعی رہنا ہوگا۔اس مشکل یا پیچدار سال کے شعبدوں سے نمٹنے کیلئے انہیں کوئی بھی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دینا چاہیے،لیکن ماہرین علم نجوم کا کہنا ہے کہ صرف برطانیہ اور چین ہی اس برس میسر آنے والے مواقع سے فائدہ اٹھا سکیں گے۔اس برس حکومتیں بہت کچھ نہیں کر سکیں گی،گویا یہ عوام کیلئے اپنی مدد آپ کا سال ہوگا۔لوگوں کو چاہیے کہ اپنی زندگیاں زیادہ ٹھوس اور محفوظ بنیادوں پر استوار کریں۔

اس برس یہ بھی یاد رکھنے والی بات ہے کہ ہم ابھی تک مشتری اور یورینس کے زیر اثر ہیں۔یہ ہم میں بے صبری پیدا کرتے ہیں جس کے نتیجے میں ہم مستقبل سے غافل ہو جاتے ہیں۔1920ء کی دہائی میں بھی ایسا ہی ہوا تھا جب امریکہ معیشت کی بدترین خرابی اور زبردست اضطراب سے دوچار رہا۔یہ تبدیلیاں صرف ان لوگوں کو متاثر کرتی ہیں جنہیں اقتصادی،کریکشن کی ضرورت ہوتی ہے۔لوگوں کو غیر ضروری قرضوں میں نہیں پھنسنا

چاہیے کیونکہ اس کے دردناک اقتصادی نتائج برآمد ہوں گے۔

ماہرین نجوم کا خیال ہے کہ امریکہ کے لئے یہ سال اچھا نہیں ہوگا۔ اس کی معیشت، ماحولیات سے متعلق اس کی پالیسیاں اور اس کی کرنسی کے لئے یہ اچھا سال نظر نہیں آتا۔ اگر امریکہ 1929ء کے ڈپریشن سے ہونے والے ''کریکشن'' کی صورتحال سے بچنا چاہتا ہے تو اسے مینجمنٹ کو بہتر بنانا ہوگا۔

اس وقت دنیا بھر میں ایک اجتماعی بے فکری یا دانشمندی کا فقدان نظر آتا ہے اور 21ویں صدی کے پورے پہلے عشرے میں یہ جاری رہے گا جس سے سب کو خطرات لاحق ہوں گے اور امریکہ بھی خطرات سے دوچار رہے گا۔ یہ ایک ایسا عالمی پولیس مین بن گیا ہے جس کا اس کی اپنی معیشت پر کوئی کنٹرول نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسے متعدد مسائل کا سامنا رہے گا کیونکہ یہ سال بازی گر اور شعبدہ باز ہے، اس لئے اچانک ہی کچھ ہوسکتا ہے۔ نتیجتاً عالمی اقتصادی ترقی بھی متاثر ہوگی۔

اس امر کی علامات موجود ہیں کہ اس وقت دنیا میں بے چینی پیدا کرنے والے جو قوانین مستقل اور ٹھوس نظر آرہے ہیں، وہ 2006ء میں بری طرح شکست سے دوچار ہوں گے۔ گویا اس سال کے دوران یہ ختم ہوجائیں گے اور دنیا کے بہت سے لوگ ان عالمی سختیوں کے خاتمہ پر خوشگوار حیرت سے دوچار ہوں گے۔ دنیا بھر کے عوام ان احمقانہ قواعد و ضوابط کے خلاف اٹھ کھڑے ہوں گے اور ان سے لڑیں گے۔ بعض اوقات اس لڑائی کے تباہ کن نتائج بھی برآمد ہوں گے۔

اس برس فراڈ اور دغابازی میں اضافہ ہوگا۔ دوسری جانب مذہبی جذبات بہت شدید ہوں گے جس طرح 2005ء میں رہے۔ اعتدال پسند اور بنیاد پرست دونوں ہی سیاست پر بالادستی کی کوشش جاری رکھیں گے۔

2006ء اس حوالے سے ایک منفی سال ہوگا کہ اس میں عملی ضروریات پر توجہ دینے میں ناکامی ہوگی۔ ہم اس برس کھوکھلے منصوبے دیکھیں گے، دنیا کو بچانے کے بڑے بڑے منصوبے پیش کئے جائیں گے، لیکن یہ بھی پہلے کی طرح محض وعدے ہی رہیں گے ان پر عمل درآمد کبھی نہیں ہوسکے گا، یہ منصوبے فراموش کرنے کیلئے بنائے جائیں گے، چنانچہ انفرادی طور پر بھی اگر آپ اس سال کے اختتام پر کچھ حاصل کرنا چاہتے ہیں تو آپ کو یہ سمجھنا چاہیے اس برس کامیابی کیلئے سب سے بڑا تقاضا تفصیلات و جزئیات کا جائزہ لینا اور کام کو خود مکمل کرنا ہے۔ انفرادی سطح پر بھی جو لوگ اعلانات کریں گے اور عملاً کچھ نہیں کریں گے، وہ بھی سیاستدانوں کی طرح غیر موثر ہوکر رہ جائیں گے اور اس برس انہیں حاصل شدہ مواقع ضائع ہوجائیں گے۔

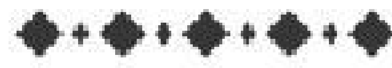
چونکہ یہ سال غیر متوقع ثابت ہوگا لہٰذا ایک جانب تو نجوم کی رو سے عالمی کشیدگی کم ہونے کی نشاندہی ہے اور دوسری جانب ایسے متعدد نجومی اشارے موجود ہیں جو پورے سال تنازعات کی نشاندہی کرتے ہیں۔ ان علامات کا آغاز مشتری، مریخ اور نیپچون کے درمیان تعلق سے ہوتا ہے، جو تصورات و نظریات میں سنگین تصادم کی علامت ہے۔ عوام اور حکومتیں ایسی صلیبی جنگوں میں ملوث ہوسکتی ہیں جس کا سبب عدم برداشت اور باہمی غلط فہمیاں ہوں گی۔ لیکن خوش قسمتی سے یہ صلیبی جنگیں نظریات کی حد تک ہی رہیں گی اور عام طور پر یہ کنفیوژن فوجی تصادم میں تبدیل نہیں ہوگا۔

تصادم کی صورت حال جنوری سے جون تک رونما ہونے کا خدشہ زیادہ ہے۔ چنانچہ زیادہ تر پر تشدد صورت حال سال کے پہلے نصف میں رونما ہوگی۔

اب ہم اس سال کی بنیادی تفہیم یعنی ''خوابوں'' کی جانب واپس آتے ہیں۔ اگر گہرائی میں جا کر دیکھا جائے تو یہ وژن یا بصیرت کا سال ہے۔ اس دوران مواصلات و ابلاغ کی ٹیکنالوجی میں تیز رفتار ترقی ہوگی، خصوصاً فروری اور ستمبر میں ایسا ہوگا، ایسی نئی ایجادات سامنے آئیں گی جو حیاتیات اور مائیکرو چپ ٹیکنالوجی کا مرکب ہوں گی، شاید کمپیوٹر بھی کسی طرح کی نوع حیات میں تبدیل ہو جائیں۔ مجموعی طور پر یہ دنیا میں بہتری کا سال ہے۔ انسانیت کے لئے سب سے بڑا چیلنج ہوگا کہ ان مثبت رجحانات کو اجتماعی مفاد میں کس طرح استعمال کیا جائے اس برس کلوننگ اور جنیاتی طریقوں سے حاصل فصلوں کے بارے میں متنازعہ مباحث شدت اختیار کر جائیں گے لیکن زیادہ تر دلائل جذباتی ہوں گے۔ اصل لڑائی اصولوں اور عقائد کے درمیان ہوگی، یہ دولت کیلئے نہیں ہوگی۔ چنانچہ مغرب میں اسقاط حمل، مانع حمل اور جانوروں کے حقوق پر نظریاتی صلیبی جنگیں ہوں گی۔

برطانیہ کے زائچے میں اس سال کے دوران، بہت زیادہ تبدیلیاں نظر نہیں آتیں، گویا سیاست سمت میں کوئی بڑی تبدیلی واقع نہیں ہوگی، کوئی بڑی سماجی شورش بھی متوقع نہیں ہے۔ جولائی ستمبر میں حکومت میں اعلی سطح کی تبدیلیوں کا مطلب بھی یہ ہوگا کہ کام معمول کے مطابق جاری رہے اقتصادی ترقی کی بھی شاندار علامات موجود ہیں، شیئرز اور مکانات کی قیمتوں میں اضافہ ہوگا، تیل کے مزید ذخائر دریافت ہو سکتے ہیں، البتہ یہ یاد رہنا چاہیے کہ اس سال مالیاتی ترقی کا تعلق دیرپا طاقت سے زیادہ اندھی امید پر ہوگا۔

یورپی یونین کے زائچے پر بھی کوئی بڑا دباؤ نظر نہیں آتا 2007-2008ء میں البتہ اس پر دباؤ مرتب ہوگا اور اس مدت میں اس کے آئینی تنازعات اٹھیں گے اور یہ دو حصوں میں تقسیم ہو جائے گی۔



صدام حسین کا مختصر تعارف

صدام حسین بغداد کے شمال میں واقع شہر تکریت کے ایک غریب گھرانے میں پیدا ہوئے۔ والد کی وفات کے بعد ان کی والدہ انہیں اپنے رشتے داروں کے پاس چھوڑ کر کسی اور گاؤں چلی گئیں چند سال بعد انہوں نے دوسری شادی کر لی سوتیلے والد کا صدام کے ساتھ برتاؤ اچھا نہ تھا۔ اس طرح صدام حسین کے لئے زندگی مشکل ہوتی گئی۔ 12 برس کی عمر میں انہوں نے اپنا گھر چھوڑ اور تکریت میں اپنے ایک چچا کے ساتھ رہنے لگے اپنے لڑکپن میں صدام حسین حکومت مخالف مظاہروں میں خاصے سرگرم رہے اور بہت سے دوسرے عراقیوں کی طرح برطانوی نوآبادیاتی حکومت امیر جاگیرداروں کے خلاف ہوتے گئے۔ 1968ء بعث پارٹی اقتدار میں آئی اور احمد حسن البقر نے ملک کی صدارت سنبھالی صدام حسین اسی دور میں صدر احمد حسن کے دست راست بنے اور حکومت کے اہم اور خفیہ کام انجام دینے لگے اور ان میں اہم کام تھا مخالفین کو ہر طرح سے ہٹانا۔ ان مخالفین میں سے کچھ تو قتل کر دیئے جاتے کچھ جلا وطن اور کچھ کو خاموش کرا دیا جاتا۔

اسی سال صدام حسین نائب صدر بنا دیئے گئے اور اس کے ساتھ ہی صدام حسین کے سیاسی عزائم بھی مزید بڑھنے لگے 1979ء میں انہوں نے اپنے محسن احمد البقر سے زبردستی استعفیٰ دلوایا اور خود صدر بن گئے اس کے بعد بعث پارٹی کے حکومت پر صدر صدام کی شخصیت حاوی ہوتی گئی اور

جیسا کہ مورخ پیپی مار نشاندہی کرتی ہیں اگر اس درمیان کوئی سیاسی نظریہ بچا تو وہ صدام ازم کا تھا۔

صدر صدام کے جارحانہ عزائم کی پہلی مثال جلد ہی 1980ء میں اس وقت سامنے آئی جب ان کی فوجوں نے ہمسایہ ملک ایران میں پیش قدمی کی صدر صدام کی توقعات کے برعکس یہ جنگ انہیں بڑی مہنگی پڑی حالانکہ اس جنگ میں انہیں امریکا کی مکمل حمایت حاصل تھی آٹھ برس جاری رہنے والی اس جنگ میں دس لاکھ افراد ہلاک ہوگئے۔

صدر صدام حسین نے ہمسایہ ملک سے اقتصادی مدد مانگی انہوں نے کویت پر عراقی تیل چوری کرنے کا الزام عائد کیا اور مطلوبہ معاوضہ نہ ملنے پر اگست 1990ء میں عراقی فوجیں کویت میں داخل ہوگئیں۔ صدر صدام کو یہ فوجی اقدام بھی بہت مہنگا پڑا۔ ان کو توقع تھی کہ بڑی عالمی طاقتیں جنہوں نے ایران کے خلاف جنگ میں ان کا بھرپور ساتھ دیا ہتھیار اور وسائل فراہم کئے تھے ان بار بھی اگر ان کی کھل کی حمایت نہیں کریں گی تو کم از کم مخالفت بھی نہیں کریں گی لیکن حالات بدل چکے تھے امریکا اور اس کے اتحادیوں کے لئے خلیج میں اپنے مفادات یعنی تیل اور اسرائیل کی حفاظت ہر قیمت پر ضروری تھی۔

امریکی قیادت میں آپریشن ڈیزارٹ اسٹارم کے تحت دسمبر 1998ء میں امریکا اور برطانیہ نے عراق پر بھرپور حملہ کیا اس جنگ کے بعد صدام حسین حکومت تو بچ گئی لیکن صدام حسین کو اپنے ہتھیار ختم کرنے کا وعدہ کرنا پڑا۔ اہم معاملہ اس پر ختم نہیں ہوا امریکا مسلسل اس بات پر ڈٹا رہا کہ عراق کے پاس وسیع پیمانے پر ہتھیار ہیں اور برطانیہ کا کہنا تھا کہ ان ہتھیاروں کو صرف 45 منٹ میں قابل استعمال بنایا جا سکتا ہے اس کے علاوہ جوہری ہتھیار بنانے اور حاصل کرنے کا الزام بھی لگایا لیکن عراق پر امریکی حملے اور قبضے کے بعد سے اب تک ان میں سے کوئی بھی الزام ثابت نہیں ہوسکا۔

صدام حسین کے دور کے دو اقدام ان کے لئے سب سے زیادہ بدنامی کا باعث بنے کویت پر حملے کی سزا کے طور پر صدام کے خلاف امریکا نے جو کاروائی کی اس کا غلط مطلب سمجھتے ہوئے جنوبی عراق میں شیعہ عقائد رکھنے والی آبادی نے صدام حسین کے خلاف بغاوت کردی بعض ذرائع کا کہنا ہے کہ امریکیوں نے یقین دہانی کرائی تھی کہ صدام حسین کے خلاف شیعہ بغاوت کا ساتھ دیا جائے گا لیکن ایسا نہیں ہوا اور ہزارہا شیعہ عراقیوں کو صدام نے انتہائی بے دردی سے ہلاک کردیا دوسرا اقدام کردوں کے خلاف تھا شمال میں کرد بغاوت کو کچلنے کیلئے بھی صدام حکومت نے انتہائی ظالمانہ اقدامات کیئے۔

صدام اور ان کی مصروفیات

صدام حسین جنہیں دسمبر 2003ء میں تکریت شہر کے قریب ایک تہہ خانہ سے امریکی فوجیوں نے قید کرلیا تھا گزشتہ دو تین ہفتوں سے ان کے خلاف درج مقدمات کی سماعت شروع ہوگئی ہے تاہم صدام حسین ابھی تک یہ سمجھتے ہیں کہ وہ عراق کے صدر ہیں عراق کے برطرف صدر جنہیں قتل کے مقدمات کا سامنا ہے اپنے کپڑے خود دھوتے ہیں اور جیل میں پرندوں کا خاص خیال رکھتے ہیں۔ صدام حسین کے قید کے شب و روز کے بارے میں یہ باتیں امریکا کے نیشنل گارڈ بیس سالہ اہلکار شین او شیا نے مشہور رسالے جی کیو سے بات چیت کے دوران بتائی تھی اگرچہ سرکاری طور پر بتایا جا

رہا ہے کہ صدام حسین عراقی حکومت کی تحویل میں ہیں لیکن حقیقتاً وہ ایک خفیہ مقام پر امریکی تحویل میں ہیں اوشیا نیشنل گارڈ کے ان پانچ اہلکاروں میں شامل ہیں جنہوں نے جی کیو کو دنیا کے مشہور ترین قیدی کے ساتھ اپنی یادوں سے آگاہ کیا۔

زیر تبصرہ انٹرویو میں شین اوشیا نے صدام حسین کے روزانہ کے معمولات مثلاً بیت الخلا جانا کھانا کھانا تفریح کرنے کے علاوہ طبی معائنے وغیرہ پر روشنی ڈالی تھی ان کے مطابق صدام حسین کی جیل کوٹھری میں ایک بستر ایک کرسی چند کتابیں اور ایک جائے نماز بھی رکھی ہوئی تھیں شین اوشیا کا کہنا ہے کہ اس کے وہم وگمان میں بھی نہ تھا کہ وہ صدام کو اتنا قریب سے دیکھیں گے۔

بقول شین اوشیا صدام حسین اکثر کئی دن اپنا سارا وقت خاموشی سے قانونی دستاویزات پر عربی زبان میں کچھ لکھنے میں گزار دیتے تھے نیشنل گارڈ کے اہلکار نے یہ بھی بتایا کہ کس طرح صدام حسین ہر روز پودوں کو پانی دیتے ہیں اور یہ کہ وہ صفائی کے معاملے میں اس قدر احتیاط کرتے ہیں کہ اپنے کھانے کے برتنوں کو کئی کئی دفعہ گیلے ٹشو سے صاف کرتے ہیں انہوں نے بتایا کہ صدام حسین کو ورزش کیلئے ایک ٹریڈمل بھی دی گئی تھی لیکن وہ انہیں پسند نہیں تھی ٹریڈمل کی بجائے انہوں نے ٹیبل ٹینس کی میز کا مطالبہ کیا تھا لیکن ان کی یہ درخواست رد کردی گئی تھی اگرچہ وہ جسمانی طور پر کمزور ہو چکے ہیں تاہم یہ کہنا غلط نہیں ہوگا کہ تکریت کے کسان کے بیٹے نے حوصلہ نہیں گنوایا ہے۔

شین اوشیا نے بتایا کہ صدام کو کیوبا کے سگار پسند ہیں اور کبھی کبھار وہ مجھے مشورے دینے سے بھی نہیں کتراتے تھے ان کے مشوروں میں یہ بھی شامل ہوتا تھا کہ ایک اچھی عورت کی تلاش کیسے ہو اور پھر اس عورت کو کیسے قابو میں رکھا جا سکتا ہے صدام حسین نے یہ کہانی بھی سنائی تھی کہ انہوں نے اپنے بیٹے اودے کی شادی پر اس کیلئے کیسے طوائفوں کا بندوبست کیا تھا۔

نیشنل گارڈ کے اہلکار نے اس واقعہ کے بارے میں بھی بتایا جب صدام حسین عراقی تفتیشی حکام کے ساتھ ایک ملاقات میں دلبرداشتہ ہو گئے اور بات چیت چھوڑ کر اپنے وزراء کو پکارنے لگے اوشین کے مطابق جب انہوں نے صدام حیسن کو بتایا کہ صدر رونالڈ ریگن جو انہیں جہاز اور ہیلی کاپٹر فروخت کیا کرتے تھے وفات پا گئے ہیں تو وہ خاموش ہو گئے تاہم ان کے خلاف جنگ کرنے والے بش سینئر اور ان کے بیٹے جارج بش صدام حسین کی نظر میں زیادہ اہم نہیں۔

یہ سب باتیں اپنی جگہ لیکن صدام حسین کو جیل میں جس حقیقت کا سامنا ہے وہ کوئی زیادہ دلکش نہیں وہ شخص جو بیش بہا دولت اور شاندار محلات کی زندگی کا عادی تھا اب اس کو رفع حاجت کیلئے بھی نیشنل گارڈ کیا ایک معمولی اہلکار کی نظروں کے سامنے بیٹھنا پڑتا ہے۔

والد شیر تھے شیر ہی رہیں گے!

صدام حسین کی بڑی بیٹی رغاد نے اپنے والد پر عراق میں جارے مقدمے سے بے اطمینانی کا اظہار کرتے ہوئے بین الاقوامی عدالت میں مقدمہ چلائے جانے کی اپیل کی ہے رغا صدام نے العربیہ ٹی وی کو بتایا کہ ان پر عراقی حکمران کونسل کے ذریعے مقدمہ نہیں چلایا جانا چاہئے کیونکہ وہاں سے انہیں انصاف کی امید نہیں ہے صدام کی گرفتاری کے وقت رغاد اردن میں مقیم تھیں انہوں نے کہا کہ ان سے اپنے والد کی ٹی وی پر نشر کی جانے والی تصاویر نہیں دیکھی جاتیں رغا نے اپنے والد کے متعلق کہا کہ وہ ایک شیر ہیں اور شیر شیر ہی رہتا ہے خواہ اسے بیڑیاں کیوں نہ پہنا دی گئی۔

انہوں نے کہا کہ دنیا نے دیکھ لیا ہے کہ میرے والد تحویل میں ہونے کے باوجود کسی سے خائف نہیں ہیں بلکہ ان کی آنکھوں میں دیکھ کر باتیں کرتے ہیں اپنے والد کی طرح انہوں نے کہا عراق کے صدر وہی ہیں۔

برزان ابراہیم التکریتی

صدام حسین کے سوتیلے بھائی اور سابق عراقی سیکریٹ سروس کے رہنما 1995ء کی بات ہے جب صدام حسین نے انہیں ایک بڑی ذمہ داری سونپی تھی یہ وہ دور تھا جب صدام حسین حکومت پر بین الاقوامی شکنجہ بڑی تیزی سے کسا جا رہا تھا اور صدام حسین کسی پر اعتماد کرتے ہوئے گھبرا رہے تھے امریکا نے جن 52 ناپسندیدہ عراقی لوگوں کی فہرست بنائی تھی اس میں برزان ابراہیم کا بھی نام شامل تھا انہیں امریکی فوجیوں نے 17 اپریل 2003 کو گرفتار کیا تھا۔

گرفتاری کے وقت تبصرے

ہفتہ وار اخبار آل سبیل کی شہ سرخی کچھ یوں تھی کیا صدام حسین نے اپنی مرضی سے خود کو حوالے کیا یا انہیں نشہ آور دوا دی گئی تھی ایک اور ہفتہ وار الہلال نے صدام کو آسانی سے گرفتار کیے جانے پر سوال اٹھایا اخبار نے لکھا ہے کہ لوگ اس بات پر حیران ہیں کہیں امریکیوں نے اس مشن کے دوران بے حس کر دینے والی گیس کا استعمال تو نہیں کیا الدستور اخبار کے ایک تبصرہ نگاروں کی طرح میں اس بات میں کوئی شک نہیں یہ ظاہر ہے کہ اس شخص پر اچانک چھاپہ مارا گیا اور ان پر گرفتاری کے دوران نشہ آور شے کا استعمال کیا گیا پہلے کسی کو خاص قسم کی گیس سے اور پھر انہیں اس طرح کی دوا دی گئی جس سے وہ حواس باختہ ہو گئے اسی طرح کی ان کی بیٹی رغاد نے بھی کہا تھا کہ ان کے والد کو نشہ آور دوا دی گئی تھیں۔ جب انہیں تکریت کے قریب ایک تہہ خانے سے نکالا گیا تو امریکی اہلکاروں نے اس وقت کہا تھا کہ صدام حسین حیران اور حواس باختہ نظر آ رہے تھے گو کہ ان کے پاس ایک پستول موجود تھی لیکن انہوں نے مزاحمت کا مظاہرہ نہیں کیا۔ یہ مضمون 13 نومبر 2005ء کو سنڈے میگزین کرنیں میں شائع ہوا۔

کہ ان کے متعلق لکھے گئے میرے ایک کالم پر شدید ناراضگی کا اظہار کریں گے۔ یہاں یہ وضاحت کر دوں کہ 5 جنوری کو شائع ہونے والا میرا کالم درحقیقت 30 دسمبر کی صبح اسی وقت تحریر کر دیا گیا تھا، جب بی بی سی نے ان کی سزائے موت پر عملدرآمد والی خبر نشر کی تھی۔ میرے جو بھی تاثرات تھے، میں بغیر کسی ملمع کاری یا بناوٹ کے لکھ بھیجے تھے۔ جب وہ شائع نہ ہوئے تو میں نے یہی سمجھا کہ ادارے نے بوجوہ میرے نقطۂ نظر کو چھاپنا مناسب نہیں سمجھا، لیکن 5 جنوری کی صبح جب مجھے منڈی بہاؤالدین سے چودھری منظور گوندل، خواجہ زاہد اور راجہ فواد اکرم کے فون آئے اور انہوں نے ناپسندیدگی کا اظہار کی تو مجھے اس کالم کی اشاعت کا علم ہوا۔ اس کے بعد یہاں لاہور میں بعض دیگر حضرات نے زیادہ سخت الفاظ میں اپنا احتجاج ریکارڈ کروایا تو مجھے اندازہ ہوا کہ پاکستان میں لوگ میرے اندازے سے زیادہ صدام حسین کو پسند کرتے ہیں۔ اب مجھے کئی پرانی باتیں بھی یاد آ گئیں

ہمارے متذکرہ بالا کالم پر جناب چیف ایڈیٹر صاحب نے تحریر فرمایا ہے کہ ”فاضل کالم نگار یہ حقیقت نظر انداز کر گئے ہیں کہ صدام حسین کو پھانسی دینے والوں کے ہاتھ خون سے رنگے ہوئے ہیں۔ عراق پر ان کے حملے کو وحشت، درندگی اور بربریت سے الگ کوئی نام نہیں دیا جا سکتا۔“

اس سلسلے میں ہم بطور ثبوت عراق پر لکھی گئی برسوں پر محیط اپنی تمام تحریریں پیش کرتے ہیں۔ کوئی ایک ایسی تحریر نہیں دکھائی جا سکتی جس میں ہم نے عراق پر غیر ملکی حملے کی حمایت کی ہو، بلکہ ایسی بہت سی تحریریں موجود ہیں، جن میں ہم نے عراق پر امریکی حملے کی کھلی اور بھرپور مذمت کی ہے۔ البتہ ان کی جگالی کرنا ہمیں مناسب نہیں لگا۔ ☆

عروج اور زوال دراصل ایک ہی سکے کے دو رخ ہیں۔ اس دنیا میں ہر عروج کے بعد زوال سے ضرور واسطہ پڑتا ہے۔ اس سے مفر ممکن نہیں۔ یہی دیکھ لیجئے کہ کسی زمانے میں عراق میں وہ قیدی، جنہیں سزائے موت سنائی جاتی تھی، صدر صدام حسین سے رحم کی اپیل کرتے تھے اور انہیں آئین کے تحت یہ اختیار حاصل تھا کہ وہ جس کی چاہیں سزا معاف کر دیں اور جس کی چاہیں برقرار رکھیں، کون جانتا تھا کہ ایک وقت ایسا بھی آئے گا کہ مطلق العنان عراقی رہنما پر اپنے ہی وطن کی زمین تنگ کر دی جائے گی، انہیں کہیں جائے پناہ نہ ملے گی۔